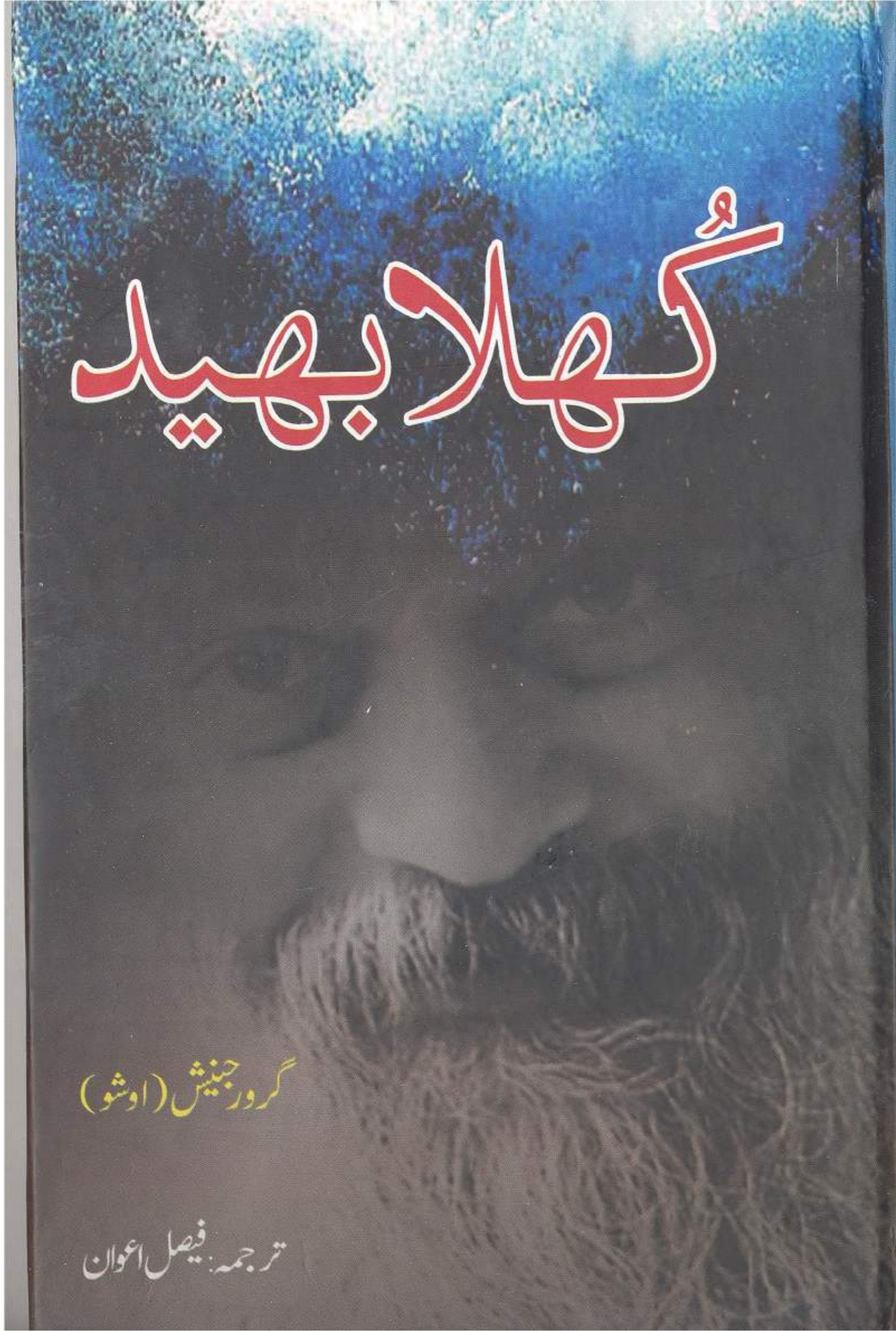
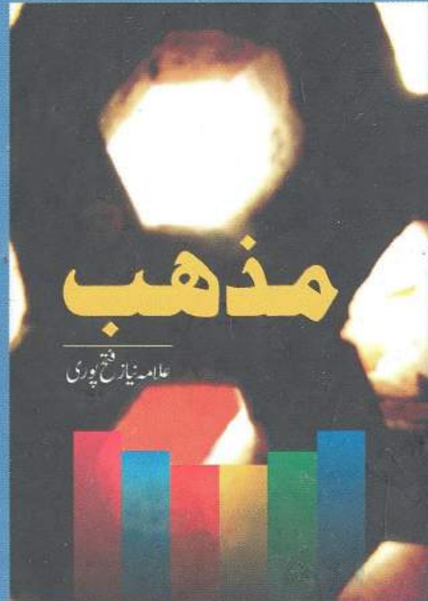


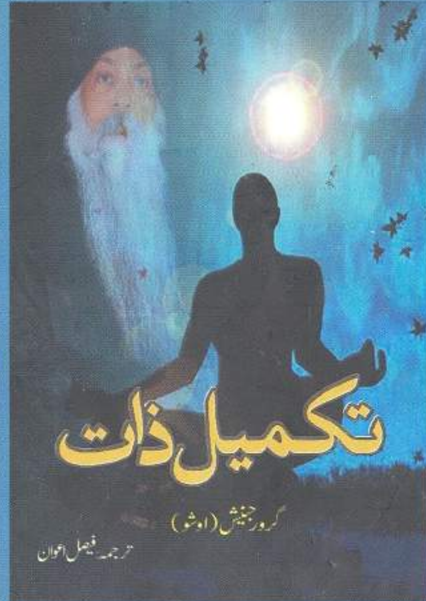
کُھلا بھید

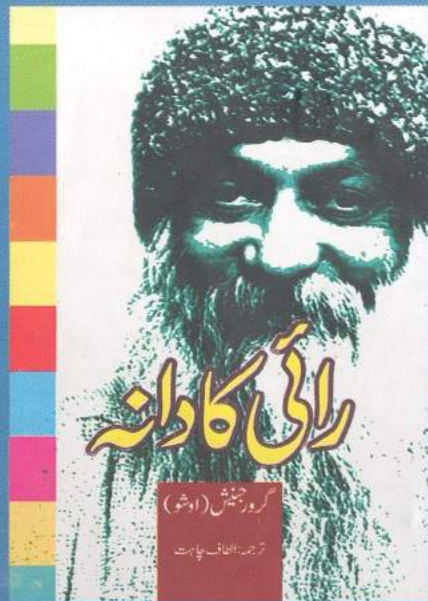
گرو رجنیش (اوشو)

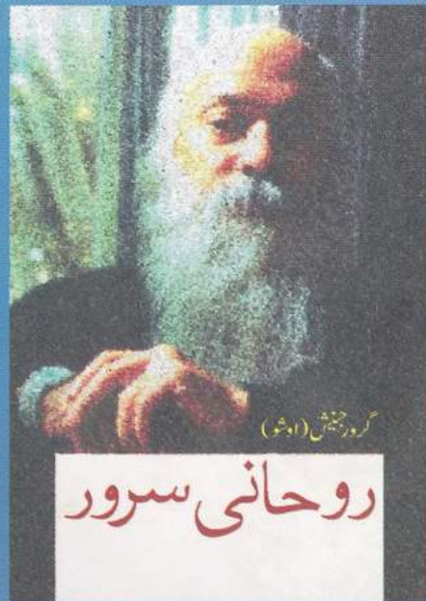
ترجمہ: فیصل اعوان

کُھلا بھید
گرو رجنیش (اوشو)
ترجمہ: فیصل اعوان









فکشن ہاؤس

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

ISBN 978-969-562-257-5

کُھلا بھید

کُھلا بھید

گرو رجنیش (اوشو)

ترجمہ: فیصل اعوان

فکشن ہاؤس

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

An Urdu Translation of
"The Mustard Seed" Part:2
By:Guru Rajneesh(Osho)

نام کتاب : کُھلا بھید
مصنف : گرورجنیش (اوشو)
ترجمہ : فیصل اعوان
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2012ء
قیمت : -/250 روپے

تقسیم کنندہ:
فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

فکشن ہاؤس
● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

مسیحؑ نے دودھ پیتے بچوں کو دیکھا
انہوں نے حواریوں سے کہا
''یہ دودھ پیتے بچے ان لوگوں جیسے ہیں جو خدا کی سلطنت میں داخل ہوتے ہیں''
انہوں نے مسیحؑ سے سوال کیا
''کیا ہم بچوں کی صورت میں سلطنت میں داخل ہوں گے؟''
مسیحؑ نے جواب دیا
''جب آپ دو کو ایک، اندر کو باہر اور باہر کو اندر میں تبدیل کر دیتے ہیں، جب آپ اوپر کو
نیچے اور مرد و زن کو ایک ذات میں بدل دیتے ہیں (تا کہ مرد مرد نہ رہے اور عورت عورت نہ رہے)
تو اسی صورت میں ہی سلطنت میں داخلے کے اہل ہوتے ہیں''

پہلا باب

معصومیت دروازہ ہے

مسیحؑ کا یہ قول انتہائی گہرے مفہوم کا حامل ہے۔ سچائی کے متلاشیوں کو جن بنیادی باتوں سے آگاہی ہونی چاہئے ان میں یہ قول نہ صرف نمایاں حیثیت رکھتا ہے بلکہ اسے پانا بھی بے حد مشکل ہے۔ جو شخص اس کے مفہوم سے آشنا ہو جاتا ہے اسے کسی اور شے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آیئے پہلے چند باتیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے بعد ہم اس قول کی تشریح کریں گے۔

اگر کوئی شخص اپنے دماغ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرے تو وہ معصوم نہیں ہو سکتا جبکہ معصومیت ہی وہ حالت ہے جس میں خدا آپ کی جانب ملتفت ہوتا ہے یا آپ خدا سے قریب ہو سکتے ہیں۔ معصومیت خدا تک رسائی کا دروازہ ہے۔ دماغ مکار اور خود غرض ہوتا ہے۔ اس کی چالاکی کی بنا پر آپ خدا کی سلطنت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ دماغ کے ذریعے اس دنیا کی سلطنت ضرور حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں مکاری درکار ہوتی ہے۔ دنیا کے دھندے میں آپ کو مکار بننا پڑے گا، آپ جس قدر مکار اور چالاک ہوں گے اسی قدر کامیاب کہلائیں گے اور جتنے خود غرض ہوں گے اتنے ہی قابل سمجھے جائیں گے۔

تاہم خدا کی سلطنت کا دروازہ اس سے قطعی متضاد سمت میں واقع ہے۔ وہاں خود غرضی کی ضرورت ہے نہ چالاکی درکار ہوتی ہے۔ وہاں دماغ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ دماغ محض جمع تفریق کا نام ہے اور یہ چالاکی کے حصول میں معاونت فراہم کرتا ہے۔ اگر آپ کو کسی قسم کی چالاکی یا خود غرضی کی ضرورت نہیں تو دماغ آپ کے کسی کام کا نہیں۔ ایسے میں دل آپ کے وجود کا مرکز بن جاتا ہے اور دل معصوم ہوتا ہے۔

ہم چالاک کیوں بنتے ہیں؟ ذہن دوسروں کو دھوکہ دینے کی بابت کیوں سوچتا رہتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کے حصول کا واحد راستہ یہی ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں کامیابی کے حصول کی خواہش رکھنے والے لوگ خدا کی سلطنت میں ناکام سمجھے جائیں گے۔ اگر آپ اس دنیا میں ناکامی قبول کرنے کو تیار ہیں تو تبھی آپ کو دوسری دنیا میں داخلے کا اہل جانا جائے گا۔ جس لمحے کوئی شخص یہ تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتا ہے کہ ''دنیاوی کامیابی میرے کام کی نہیں اور میں اس کے لیے نہیں بنا'' تو اسی لمحے تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ ایسے میں انسانی شعور ظاہر کے بجائے باطن پر مرکوز ہو جاتا ہے۔

مسیحؑ نے معصومیت پر بے حد زور دیا ہے۔ اسی لیے وہ بچوں کی خوبصورتی، پھولوں کی معصومیت، سوسن یا پرندوں کی معصومیت کی بات کرتے ہیں۔ تاہم اس قسم کی کی معصومیت کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ یہ معصومیت آپ بہت پہلے کھو چکے ہیں۔ لہٰذا ان کی بات کے ظاہری مفہوم پر مت جایئے کہ بچوں، پھولوں یا پرندوں کی بات محض علامتی ہے۔

آپ دوبارہ بچے نہیں بن سکتے۔ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ جب آپ علم کا ذائقہ چکھ لیتے ہیں تو پھر واپس پلٹنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ اس سے مزید بلند تو ہو سکتے ہیں تاہم ماضی کی جانب واپس نہیں پلٹ سکتے، واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ آپ آگے جا سکتے ہیں، اس سے بھی آگے جا سکتے ہیں مگر آپ کے لیے واپسی کا سفر اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ ایک مرتبہ پھر پہلے جیسے عام بچے نہیں بن سکتے۔ کیسے؟ آپ جو کچھ جان گئے ہیں اسے بھلانا کیونکر ممکن ہے؟ تاہم آپ دوسری جانب اور بلندی کی طرف ضرور بڑھ سکتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھیں وگرنہ آپ بچوں جیسا بننے کی کوشش شروع کر دیں گے اور یہ مصنوعی بچپنا ''مکاری'' ہوگا اور اسے خود غرضی سمجھا جائے گا۔ مسیحؑ نے کہا تھا کہ ''بچوں کی طرح ہو جاؤ'' چنانچہ آپ بچہ بننے کی مشق شروع کر دیتے ہیں جبکہ حقیقی بچہ ایسی کوئی مشق نہیں کرتا۔ بچہ محض بچہ ہوتا ہے، اسے تو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ بچہ ہے۔ وہ اپنی اس معصومیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اس کی معصومیت موجود ہے مگر وہ خود اس سے آگاہ نہیں ہوتا۔ تاہم اگر آپ بچہ بننے کی مشق کرتے ہیں تو آپ کی خود آگاہی بھی موجود ہوگی جس کے ہوتے ہوئے آپ کا ''بچپن'' نقلی شے بن کر رہ جائے گا۔ آپ بچہ بننے کی اداکاری تو کر سکتے ہیں مگر حقیقت میں بچہ نہیں بن سکتے۔

تاہم عارف یا دانا قطعی مختلف مفہوم میں بچے جیسا بن جاتا ہے۔ وہ بلندی کو چھو سکتا ہے اور ذہن کی حدود سے پرے بھی جا سکتا ہے کیونکہ اس پر دماغ کی بیکاری عیاں ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ اس دنیا میں کامیاب آدمی ہونے کی بیہودگی سے آگاہ ہو چکا ہے۔ وہ کامیابی، دوسروں کو متاثر کرنے، عظیم اور اہم ترین آدمی بننے اور انا کی تسکین کی خواہش سے دستبردار ہو چکا ہے۔ وہ اس کے مطلق فضول ہونے سے آگاہ ہو گیا ہے۔ یہ آگاہی انسان کو اس کی موجودہ سطح سے بلند کر دیتی ہے اور اس سمجھ بوجھ کی بدولت آپ ایک مختلف سمت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ایسے میں آپ ایک مرتبہ پھر بچپن میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسے دوسرا بچپن کہا جائے گا۔ ہندو اسے ''دوسرا جنم'' کہتے ہیں۔ اب آپ نے ایک مرتبہ پھر جنم لیا ہے مگر یہ ایک مختلف جنم ہے اور اس میں باپ اور ماں کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ آپ نے اپنی ہی ذات سے یہ جنم لیا ہے۔

مسیحؑ کی پیدائش کا حقیقی مفہوم یہی ہے اور مندرجہ بالا وضاحت کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دو انسانی اجسام کے باہم ملاپ والے طریقہ کار کے بغیر پیدا ہوئے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ لوگ اس ''پیدائش'' کو ظاہری مفہوم میں لیتے ہیں اور یوں اصل بات سمجھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کنواری عورت سے پیدا ہونے کا مطلب ''ایک'' سے پیدا ہونا ہے، دوسرا موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اسے کون خراب کر سکتا ہے؟ اس میں کون داخل ہو سکتا ہے؟ کنوارا پن مطلق خالص رہتا ہے کیونکہ وہاں کسی دوسرے کا وجود نہیں ہوتا۔ کسی دوسرے کی موجودگی میں آپ کنوارا پن کھو دیتے ہیں کہ کنوارا ہونا ایک ہونے کا نام ہے۔ آپ کے ذہن میں کوئی اور بھی موجود ہے لہٰذا آپ اپنی معصومیت کھو چکے ہیں۔ چنانچہ دوسرے سے متعلق آگاہی اور دوسرے کی خواہش کنوارا پن کھونے کا نام ہے۔ دوسری پیدائش پاکیزہ ہو سکتی ہے جبکہ پہلی پیدائش جنسی عمل سے مشروط تھی، اس کے لیے اور کوئی راستہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔

دوسروں کی طرح مسیحؑ کی پیدائش بھی فطری انداز میں ہوئی اور اسے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بیج کی حیثیت میں مسیحؑ بھی آپ جیسے ہیں مگر پھول بننے کے عمل میں وہ بالکل مختلف ہیں کیونکہ اس دوران انہوں نے دوسرا جنم لیا ہے اور ایک نیا انسان پیدا ہوا ہے۔ حضرت مریمؑ کے بطن سے جنم لینے والا مسیحؑ باقی نہیں رہا۔ اب وہ اپنے آپ کو دوسرا جنم دے چکا ہے۔ قدیم Essene فرقے کی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی شخص تبدیل ہو جاتا ہے تو وہ گویا اپنا ہی باپ بن جاتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مسیحؑ کا کوئی باپ نہیں تو دراصل یہ بات اپنے اندر گہرا مفہوم رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسیحؑ اب خود اپنا باپ بن چکے ہیں۔ اگرچہ یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے مگر درست ہے۔

دوسری پیدائش پاکیزہ جنم ہوتا ہے اور اس میں آپ ایک مرتبہ پھر معصوم بن جاتے ہیں۔ یہ معصومیت بچے کی معصومیت سے برتر ہوتی ہے کہ بچے نے ایک دن اپنی معصومیت کھو دینی ہے۔ اس کی معصومیت قدرت کا تحفہ ہے، اس نے یہ معصومیت خود حاصل نہیں کی اور ایک روز یہ اس سے واپس لے لی جائے گی۔ جب بچہ بڑا ہو گا تو اپنی معصومیت کھو دے گا اور اسے بہر طور بڑا ہونا ہے۔ تاہم عارف ہمیشہ معصوم رہتا ہے۔ اب اس سے یہ معصومیت واپس نہیں لی جا سکتی کیونکہ یہ منتہائے کمال ہے۔ یہ بڑھوتری کا عروج ہے اور اس سے مزید آگے کوئی بلندی نہیں۔ اگر مزید بلندی کی جانب بڑھنے کی گنجائش موجود ہو تو صورتحال تبدیل ہو جائے گی۔ اگر آپ اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جس سے پرے کسی کا وجود نہیں تو اسی صورت میں حالات تبدیل نہیں ہوں گے۔

بچے کو ہر روز بڑا ہونا ہے۔ وہ اپنی معصومیت کھو دے گا اور تجربہ کار ہو جائے گا۔ اسے علم حاصل کرنا ہے اور چالاک و خود غرض بننا ہے۔ تاہم اگر آپ اپنے خود غرضی پر مبنی نظام کے زیر تسلط ہیں تو پھر آپ محض جنسی عمل کے نتیجے میں جنم لینے والا ہی کہلائیں گے۔ ایسے میں آپ کی ذات میں مسلسل آویزش بپا رہے گی کیونکہ آپ ''دو'' ہیں۔

جب آپ ''دو'' سے جنم لیتے ہیں تو دو ہی رہتے ہیں کیونکہ کوئی مرد محض مرد نہیں ہوتا بلکہ وہ عورت بھی ہوتا ہے اور کوئی عورت محض عورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک مرد بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان دو سے جنم لیتا ہے۔ آپ میں آپ کا باپ اور ماں دونوں وجود رکھتے ہیں کیونکہ آپ کو تخلیق کرنے میں ان دونوں نے حصہ لیا ہے۔ آپ کے جسم میں ان دونوں کا اثر ہے اور دونوں کے دھارے بہہ رہے ہیں۔ آپ دو ہیں۔ اگر آپ دو ہیں تو پھر پرسکون کیسے رہ سکتے ہیں؟ اگر آپ دو ہیں تو پھر ایک مستقل آویزش ہو گی۔ اگر آپ کی ذات میں دو متضاد رجحانات پائے جاتے ہیں تو پھر ہمیشہ تناؤ کی کیفیت رہے گی۔ یہ تناؤ ختم نہیں ہو سکتا اور آپ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خاموش اور پرسکون رہنا کیونکر ممکن ہے اور خوشی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ تاہم ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ آپ دو ہیں۔

خاموشی اور سکون ایک ہونے کی صورت میں ہی ممکن ہیں چنانچہ آپ کو دوسرا جنم لینا ہے۔

مسیح نے Nicodemus سے یہی بات کہی تھی۔ Nicodemus نے ان سے پوچھا تھا کہ ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

مسیح نے جواب دیا ''سب سے پہلے تمہیں نیا جنم لینا ہے، اسی صورت میں کچھ ہو سکتا ہے۔ موجودہ حالت میں تمہارے لیے کچھ کرنا ممکن نہیں ہے''

اسی طرح میں بھی آپ سے کہتا ہوں کہ اس وقت آپ جس حالت میں ہیں اس میں کچھ ہونا ممکن نہیں ہے۔ جب تک آپ نیا جنم نہیں لیتے، جب تک اپنے باپ نہیں بنتے اور جب تک آپ کا دہرا پن ختم نہیں ہوتا اس وقت تک آپ واحد ذات میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ آپ کی ذات میں موجود مرد اور عورت آپس میں ملتے ہیں اور ایک دائرے کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما نہیں ہوتے۔ وہ غائب ہو جاتے ہیں، ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں اور تب صرف یکدلی باقی رہ جاتی ہے اور یہی کنوارا پن اور پاکیزگی ہے۔

جب مسیح نے کہا ''بچوں جیسے ہو جاؤ'' تو ان کا یہی مطلب تھا۔ اس بات کو لفظی مفہوم میں مت لیں۔ مگر ''بچوں کی طرح'' کیوں ہوا جائے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حمل ٹھہرتا ہے تو ابتدائی چند ہفتوں کے دوران بچے کی جنس کا تعین نہیں ہوا ہوتا۔ اس وقت وہ نر ہوتا ہے نہ مادہ۔ ماہرین حیاتیات سے پوچھئے، وہ آپ کو بتائیں گے کہ اس وقت بچہ نر ہوتا ہے نہ مادہ۔

ابتدائی چند ہفتوں میں بچہ نر ہوتا ہے نہ مادہ، یا تو وہ دونوں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے یا پھر اس میں کوئی جنسی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ اس وقت تک ہم بچے کی صریح جنس کے حوالے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اب طبی سائنس بچے کی جنس تبدیل کرنے پر قدرت حاصل کر چکی ہے۔ چند انجکشن بچے کی جنس تبدیل کر سکتے ہیں کیونکہ اس مرحلے پر بچہ نر اور مادہ دونوں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ تاہم یہ توازن بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور بچے پر نر یا مادہ میں سے کوئی ایک خصوصیت غالب آ جاتی ہے۔ جو خصوصیت غالب آ جائے وہی بچے کی مستقل جنس ہوتی ہے۔ تاہم ابتدا میں بچہ متوازن ہوتا ہے اور اسے ہم مکمل نر یا مکمل مادہ نہیں کہہ سکتے، اب تمام تر حالات کا دارومدار ہارمونز پر ہوگا۔ اس مرحلے پر اگر ہم بچے کے جسم میں مردانہ ہارمونز داخل کر دیں تو بچہ نر بن جائے گا اور مادہ ہارمونز داخل کیے جانے کی صورت میں مادہ کے روپ میں ڈھل جائے گا۔

جنس تبدیل کرنا ممکن ہے کیونکہ یہ بیرونی شے ہے اور اس کا وجود سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ محض جسمانی محیط سے متعلق ہے۔ یہ ہارمونز سے متعلقہ جسمانی چیز ہے۔ ہستی یا حقیقی وجود خاکی جسم سے مختلف شے ہوتی ہے۔ تاہم کچھ دیر کے بعد فرق ابھرتا ہے اور بچہ نر یا مادہ بننا شروع ہو جاتا ہے۔

ابتداء میں یگانگت تھی، اس کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے اور کچھ دیر کے بعد یہ جسمانی اعتبار سے مرد یا عورت بن جاتا ہے۔ تاہم ابھی تک اس کے شعور کی گہرائیوں میں یہ فرق سرایت نہیں ہوا۔ شعوری اعتبار سے وہ تا حال ''کچھ نہیں'' بچے کو اس امر سے آگاہی نہیں ہوتی کہ وہ نر ہے یا مادہ۔ چند ماہ کے بعد یہ فرق اس کے ذہن میں جگہ بنا لے گا۔ ایسے میں بچے کی حالت بدل جائے گی اور وہ اپنے آپ سے آگاہ ہو جائے گا۔

ابتداء میں جسم ایک تھا۔ بعد ازاں یہی الگ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جسم الگ ہو جانے کے باوجود بچہ ''ایک'' ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد بچہ بھی الگ ہو جاتا ہے۔ انسان غائب ہو جاتا ہے اور آپ نر یا مادہ کے طور پر پہچانے جانے لگتے ہیں۔ یہ سلسلہ تا عمر جاری رہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کبھی اپنے منبع تک دوبارہ نہیں پہنچے اور دائرہ نامکمل رہتا ہے۔ سب سے پہلے انسانی ذہن میں ''فرق'' غائب ہوتا ہے۔ یہ الٹی سمت واپس جانے جیسا ہے۔

بچے میں سب سے پہلے اس کے جسم میں فرق نمودار ہوتا ہے اور پھر ذہن اس امتیاز سے آگاہی پاتا ہے۔ عارف اور دانا کے معاملے میں سب سے پہلے شعور سے ''فرق'' غائب ہوتا ہے اور پھر یہ جسم کو چھوڑتا ہے۔ مرنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پھر ''واحد'' اور ''اکہرا'' بن جاتا ہے۔ یہ دوسرا بچپن ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر معصوم بن جاتا ہے مگر یہ معصومیت بے حد گہری ہوتی ہے۔

بچے کی معصومیت کمزور ہوتی ہے کیونکہ اس کے پاس کسی قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ بچپن کی معصومیت کسی شے کی غیر موجودگی جیسی ہوتی ہے۔ تاہم اس کے برعکس عارف و دانا کی معصومیت کسی شے کی موجودگی کا پتا دیتی ہے۔ وہ دنیا کے تمام انداز جانتا ہے، وہ ہر جگہ گھوم چکا ہے، وہ تمام اقسام کا تجربہ حاصل کر چکا ہے۔ وہ انتہائی متضاد سمت میں بھی جا چکا ہے۔ وہ گناہ گار بنا، اس نے گہری چھان بین کی، اس نے زندگی سے جی بھر کر لطف اٹھایا اور ہر اس شے کا تجربہ کیا جو دنیا دے سکتی تھی، تاہم اب وہ اس سے باہر آ چکا ہے۔ اس کی معصومیت بے حد گہری ہے اور یہ تجربے سے بھرپور ہے۔ اب آپ اسے برباد نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان تمام باتوں سے واقف ہے جن سے

واقف ہوا جا سکتا ہے۔ اب آپ اسے کیسے ختم کر سکتے ہیں؟ آپ اسے مزید کسی ترغیب سے نہیں پھسلا سکتے کیونکہ تمام تر ترغیبات ختم ہو چکی ہیں۔

اگر آپ اس مرحلے پر پہنچتے ہیں تو (ابتداء میں آپ بچے تھے اور اختتام پر ایک مرتبہ پھر بچے بن جاتے ہیں) آپ کی زندگی ایک مکمل دائرہ بن جاتی ہے۔ تکمیل اسی کا نام ہے۔ اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے منبع تک نہیں پہنچتے تو آپ کی زندگی نامکمل کہلائے گی اور نامکمل پن گھاٹا ہے۔ بدھا نے اسے ''دکھا'' یعنی مصیبت کا نام دیا ہے۔ اگر آپ نامکمل ہیں تو پھر آپ کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر مکمل ہیں تو یوں سمجھئے کہ آپ کی تکمیل ہو گئی۔

دانا تکمیل پا کر مرتا ہے، اس کے بعد دوسرا جنم نہیں ہوتا کیونکہ تب تجربے کی دنیا میں دوبارہ قدم دھرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ نامکمل حالت میں مرتے ہیں اور اسی نامکمل پن کے باعث آپ کو دوبارہ جنم لینا پڑتا ہے۔ آپ کا وجود باقی رہے گا اور آپ مکمل ہونے کے لیے بار بار جنم لیتے رہیں گے۔ جب تک آپ مکمل نہیں ہو جاتے اس وقت تک آپ پیدائش اور موت کے دائرے میں محوِ سفر رہیں گے۔ ہندو اس عمل کو ''آواگون'' یا زندگی و موت کا چکر کہتے ہیں۔ دانا اس چکر سے باہر چھلانگ لگا دیتا ہے کیونکہ وہ خود دائرہ بن چکا ہوتا ہے چنانچہ اسے اس چکر کی ضرورت نہیں رہتی۔

تاہم عام ذہن کے ساتھ کیا پیش آتا ہے؟ عام آدمی کے ذہن میں فرق اور جنس اپنی انتہا موجود ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر جسم کمزور بھی ہو جائے تو ذہن چلتا رہتا ہے۔ جنس بنیادی دہرا پن ہے۔ چنانچہ جب تک جنس غائب نہیں ہو جاتی اس وقت تک یکتائی، غیر تثنیہ اور براہما کا وجود ممکن نہیں۔ یاد رہے کہ یکتائی، ادویتا، براہما یا ایک ہونا مفروضہ نہیں ہے، اسے فرض کردہ بات یا نظریہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ کوئی فلسفیانہ بات بھی نہیں کہ آپ اس پر بحث کرنے لگ جائیں۔ یہ عقیدہ بھی نہیں، اس کے بجائے یہ جنس کی ماورائیت ہے۔ یہ ایک انتہائی گہرا حیاتیاتی مظہر ہے۔ یہ کیمیائی معاملہ ہے کیونکہ آپ کا سارا جسم تبدیلی کا متقاضی ہے۔

تین بوڑھے باغ میں بنچ پر بیٹھے اپنے مصائب کا تذکرہ کر رہے تھے۔ چونکہ بوڑھوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا اس لیے عموماً وہ ماضی کے قصے سنایا کرتے ہیں۔ ان میں ایک بہتر سالہ بوڑھا کہنے لگا ''میری قوت سماعت ختم ہو رہی ہے، لوگوں کو میرے کان میں چلا کر بات کرنا پڑتی

ہے اور تب بھی میں ان کی بات درست طور سے نہیں سمجھ پاتا''

دوسرا بوڑھا بولا ''میری نظر کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے'' اس کی عمر اٹھہتر برس تھی۔ اس نے مزید کہا کہ ''میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا، یہاں تک کہ میرے لیے بھورے اور سرخ بالوں والی خاتون میں تمیز کرنا بھی ممکن نہیں رہا''

تب دونوں نے تیسرے آدمی سے (یہ ملا نصر الدین تھا اور اس کی عمر ترانوے برس تھی) کہا کہ ''تمہیں کون سے مسائل کا سامنا ہے؟'' نصر الدین نے جواب دیا ''میرا مسئلہ تم دونوں سے کہیں زیادہ گہرا ہے، گزشتہ شب میں نے کھانے کے بعد کچھ شراب پی اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اسی دوران میری آنکھ لگ گئی۔ نصف گھنٹے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میری بیوی سونے کے لیے بستر میں چلی گئی ہے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور خواب گاہ میں جا کر بیوی سے کہا کہ مجھے بھی بستر میں کچھ جگہ دو، ذرا دل لگی ہی ہو جائے'' میری بیوی بولی ''کیا کہا؟ ابھی بیس منٹ پہلے ہی تو دل لگی کی ہے''

ملا نصر الدین نے اپنے سر پر چپت لگائی اور اداس لہجے میں بولا ''دوستو! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری یادداشت جواب دینے لگی ہے''

اپنی جنس کا احساس آخری دم تک انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اگر آپ نے اس کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو آپ اس کے بارے میں کبھی نہ سوچتے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذہنی سطح بلند نہیں کرتا تو مرتے وقت اس کے ذہن میں باقی رہ جانے والا آخری احساس یہی ہوگا کہ وہ مرد یا عورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تو اسے سب سے پہلے اسی چیز کا علم ہوا تھا کہ وہ نر یا مادہ ہے۔ پہلا احساس ہی آخری احساس ہوتا ہے، یہ فطری امر ہے، تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔

رات کے وقت سونے سے پہلے اپنے آخری خیال پر غور کریں اور اسی پر توجہ مرکوز کریں۔ صبح جب آپ کی آنکھ کھلے گی تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ رات کا آخری خیال ہی نئی صبح آپ کا پہلا خیال ہوگا۔ اسے دوسری طرح بھی کیا جا سکتا ہے۔ صبح اپنے پہلے خیال پر غور کریں اور اسے ذہن میں رکھیں۔ رات کو یہی آپ کا آخری خیال ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی دائرے کا نام ہے۔ زندگی میں پہلی چیز جنس ہے اور اسے ہی آخری چیز ہونا ہے۔ اگر آپ خود کو بلند نہیں کرتے تو آپ ستم رسیدہ کہلائیں گے، آپ اپنی ذات کے مالک نہیں ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو پھانسی دی جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ جب مرد کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے تو فوراً اس کا مادہ تولید (نطفہ) خارج ہو جاتا ہے۔ پھانسی پانے والے ہر شخص کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی آخری شے ہوتی ہے۔ گویا کہ مرتے وقت نطفہ خارج ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ ایسا کیوں ہونا چاہئے؟ زندگی ایک دائرہ ہے، یہ مکمل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ پہلی شے تھی جس کے ذریعے وہ زندگی میں آیا اور اسی نے آخری شے ہونا ہے جس کے ذریعے وہ ایک مرتبہ پھر نئی زندگی میں داخل ہو جائے گا۔

عارف خود کو جنس سے بلند کر لیتا ہے، تاہم یاد رہے کہ اس نے جنس کو دبایا نہیں ہے۔ دبانا یا کچلنا بلندی نہیں ہیں۔ اگر آپ خود کو کچلتے ہیں تو آپ بدستور اس میں موجود ہیں اور تقسیم شدہ ہی کہلائیں گے۔ دانا نے کبھی کسی شے کو دبایا یا کچلا نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس کی ذات میں موجود مردانہ وزنانہ توانائی اکٹھی ہوگئی ہے اور اب وہ مرد یا عورت نہیں رہا۔ اسی حالت کو مسیح نے ''خدا کا ہیجڑا'' کہا تھا۔ ہندومت میں ''شیوا'' اسی حالت کا نام ہے جو کہ آدھا مرد اور آدھی عورت ہے۔ گویا وہ ''ایک'' ذات میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہندو ''شیوا'' کو مکمل ترین خدا قرار دیتے ہیں اور اسے عظیم مہادیو گردانتے ہیں۔ وہ اسے مہادیو یا عظیم ترین کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ آدھا مرد اور آدھی عورت ہے اور جب آپ شعوری اعتبار سے آدھے مرد اور آدھی عورت ہوتے ہیں تو دونوں ایک دائرے میں تبدیل ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔ دہرا پن غائب ہو گیا اور انسان ''ایک'' بن گیا۔

مسیح اسی ''یکتائی'' کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو نصف مرد اور نصف عورت ہونے کا نام ہے۔ ایسے میں آپ مرد ہوتے ہیں نہ عورت بلکہ آپ کا نیا بچپن شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا بچپن ہے اور آپ دوسرا بچپن لے چکے ہیں۔ اب معصومیت کی نئی دنیا دریافت ہو چکی ہے۔

''مسیح نے دودھ پیتے بچوں کو دیکھا تو اپنے حواریوں سے کہا ''یہ دودھ پیتے بچے ان لوگوں کی طرح ہیں جو سلطنت میں داخل ہوں گے''

حواریوں نے مسیح سے کہا ''تو کیا ہم بچے بن کر سلطنت میں داخل ہوں گے''

یوں حواری ہمیشہ بات کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ باتوں کو ان کے ظاہری مفہوم میں دیکھتے ہیں۔ وہ الفاظ کو حد سے زیادہ سمجھ لیتے ہیں جبکہ پیغام الفاظ کے بغیر ہوتا ہے۔ وہ علامتوں سے چمٹ جاتے ہیں اور انہیں ٹھوس شکل دے دیتے ہیں جبکہ مسیح نے ان علامتوں کی

بات کی تھی تو اس وقت یہ ٹھوس کے بجائے مائع حالت میں تھیں۔ وہ دکھاتی تو ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتیں۔ وہ اشاروں اور چاند کی جانب اٹھی انگلیوں جیسی ہیں جو بظاہر خاموش ہیں مگر حقیقت میں ان کے اندر بہت بڑا پیغام پوشیدہ ہے۔

ایک مرتبہ مسیح نے کہا ''یہ بچے..... ان لوگوں جیسے ہیں جو سلطنت میں داخل ہوں گے'' تو ہمارے ذہن میں فوراً یہی بات آتی ہے کہ اگر ہم ان بچوں جیسے بن جاتے ہیں تو پھر خدا کی سلطنت میں داخلے کے اہل ہوں گے۔

حواری بولے ''کیا ہمیں بچہ بن کر سلطنت میں داخل ہونا ہے؟''

مسیح نے جواب دیا ''نہیں، محض بچہ بننے سے بات نہیں بنے گی''

مسیح نے ان سے کہا ''جب آپ دو کو ایک بنا دیتے ہیں، جب باطن کو ظاہر جیسا کر دیتے ہیں اور ظاہر باطن سے مشابہ ہو جاتا ہے، جب اوپر نیچے کی طرح ہو جاتا ہے اور جب آپ نر اور مادہ کو ایک کر دیتے ہیں تو تبھی آپ سلطنت میں داخل ہو سکتے ہیں''

بچوں جیسا بننے کے حوالے سے مسیح کے قول کی یہی تشریح ہے۔ ان کے بیان کردہ ہر فقرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

''جب آپ دو کو ایک بنا دیتے ہیں.......''

یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ کیا آپ نے کبھی مشاہدہ کیا کہ سورج کی روشنی منشور سے گزرتی ہے تو ایک رنگ کی کرن سات رنگوں میں بدل جاتی ہے؟ ایسے میں قوس قزح کے تمام رنگ ابھر آتے ہیں۔ قوس قزح اسی طرح بنتی ہے۔ برسات کے موسم میں جب ہوا بخارات یا پانی کے چھوٹے چھوٹے قطروں سے بھر جاتی ہے تو فضا میں لٹکے یہ قطرے قوس قزح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جب سورج کی روشنی ان قطروں سے گزرتی ہے تو سات رنگوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اس کو قوس قزح بننا کہتے ہیں۔ برسات کے موسم میں جب سورج بادلوں سے نکلتا ہے تو قوس قزح واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ سورج کی کرن مکمل سفید ہوتی ہے مگر طیف (منشور) سے گزرنے پر یہ سات رنگوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سفیدی گم ہو جاتی ہے اور سات رنگ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

آپ کا دماغ بھی منشور کی طرح کام کرتا ہے۔ دنیا ایک ہے، اس کا وجود مکمل طور سے سفید ہے تاہم آپ کے ذہن کے بدولت یہ آپ کو بے شمار رنگوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ دماغ کے

ذریعے ہر شے کئی اشیاپر مشتمل دکھائی دیتی ہے۔ اگر آپ بے حد چوکنا ہیں تو پھر آپ کو ہر ذہنی تصور سے سات چیزیں نظر آئیں گی۔ ذہن بھی چیزوں کو منشور کی طرح سات حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہفتے کو سات ایام میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اسی ذہنی رویے کے باعث مہاویرا نے اپنی تمام تر منطق کو سات مراحل میں تقسیم کر دیا۔ انہیں منطق کے سات پہلو کہا جاتا ہے۔ اگر آپ مہاویرا سے کوئی سوال کریں تو وہ اس کے سات جواب دے گا۔

آپ اس سے ایک سوال کریں گے تو وہ فوراً آپ کو سات جواب دے ڈالے گا۔ یہ بات بے حد پریشان کن تھی کیونکہ آپ ایک سوال کرتے ہیں اور وہ سات جواب دیتا ہے۔ اس طرح آپ مطمئن ہونے کے بجائے اس کے پاس آ کر الٹا پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان سات جوابات کے سبب مہاویرا کو سمجھا نہیں جاسکا۔ اسے سمجھنا ناممکن تھا۔ تاہم وہ اپنی جگہ بالکل درست تھا کیونکہ وہ کہہ رہا ہے کہ ''آپ ذہن کی مدد سے سوال پوچھتے ہیں تو مجھے ذہن سے ہی جواب دینا ہے اور ذہن ہر شے کو سات حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہ ساتوں ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں، انہیں ایسا ہی ہونا ہے کیونکہ سچائی ایک ہی ہوسکتی ہے، اس کے سات حصے نہیں ہوسکتے''

جب آپ سات باتیں کرتے ہیں تو آپ کو تضادات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر آپ مہاویرا سے پوچھیں کہ ''آیا خدا موجود ہے؟'' تو وہ جواب دے گا کہ ''ہاں خدا کا وجود ہے، نہیں خدا وجود نہیں رکھتا'' اس کے بعد وہ کہے گا ''خدا وجود رکھتا ہے اور خدا وجود نہیں رکھتا'' اس کے بعد وہ اسی طرز پر سات مختلف جوابات دے گا۔

ذہن ہر شے کو طیف کی طرح تقسیم کر دیتا ہے۔ جب آپ اپنے دماغ کے ذریعے کسی شے کو پرکھتے ہیں تو وہ سات حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اگر آپ باریک بینی سے دیکھتے ہیں تو آپ کو سات چیزیں نظر آئیں گی، اگر سرسری نگاہ دوڑائیں گے تو یہ دو اشیا معلوم ہوں گی۔ اگر آپ کسی عام آدمی سے پوچھیں تو وہ کہے گا ''صرف دو جواب ہی ممکن ہیں، اگر آپ خدا کے بارے میں پوچھتے ہیں تو دو جواب ہی ممکن ہیں کہ خدا کا وجود ہے یا خدا کا وجود نہیں ہے'' تاہم یہ شخص پانچ دیگر جوابات سے آگاہ نہیں ہے کیونکہ وہ زیادہ مستعد نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو امکانات کی تعداد دو کے بجائے سات ہوتی۔ چنانچہ دو متعدد اور بے شمار کی ابتداء ہوتی ہے جبکہ سات ''متعدد'' کا اختتام ہوتا ہے۔

مسیح نے کہا ''جب آپ دو کو ایک بناتے ہیں.....''

وہ بے حد عام لوگوں سے مخاطب ہیں۔ مہاویرا عظیم علماء و ماہرین منطق سے مخاطب تھا۔ یہ سامعین کا فرق ہے۔ مسیح بے حد غریب اور عام لوگوں سے بات کر رہا ہے جبکہ مہاویرا چنیدہ لوگوں سے مخاطب تھا جو کہ بہت کم تعداد میں تھے۔ اس نے سات سے متعلق بات کی جبکہ مسیح نے دو کا ذکر کیا تاہم دونوں کا مفہوم یکساں ہے۔

مسیح کہتے ہیں ''جب آپ دو کو ایک بناتے ہیں.....'' مہاویرا کہتا ہے کہ ''جب آپ سات کو ایک بناتے ہیں تو....'' اور جب سات غائب ہو جاتے ہیں اور ایک باقی رہ جاتا ہے تو آپ پا لیتے ہیں۔ مسیح کہتے ہیں ''جب دو غائب ہو گئے اور ایک باقی رہ گیا تو آپ نے پالیا'' فرق سامعین میں ہے، مطالب ایک سے ہیں۔

دو کیسے غائب ہوسکتے ہیں؟ آپ کو کیا کرنا چاہئے؟ دماغ کے ذریعے کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر ذہن ہے تو پھر ایک کے بجائے دو ہوں گے۔ قوس قزح کیسے غائب ہوسکتی ہے؟ آپ منشور کو ہٹا دیں تو قوس قزح بھی باقی نہیں رہے گی۔ ہوا میں معلق پانی کے قطروں کو نیچے گرا دیں تو قوس قزح غائب ہو جائے گی۔ ذہن کے ذریعے دیکھنا چھوڑ دیں تو متعدد کی دنیا غائب ہو جائے گی، ذہن کے ذریعے دیکھیں تو ایک کی متعدد اشکال موجود پائیں گے۔

ذہن کے ذریعے مت دیکھیں۔ اسے ایک جانب رکھ کر دیکھیں۔ بچے دنیا کو ذہن کے بغیر دیکھتے ہیں کیونکہ ذہن کو نشوونما پانے میں وقت درکار ہوتا ہے۔ جسم پہلے آتا ہے اور ذہن اس کے پیچھے ہوتا ہے۔ اس میں واقعتاً کئی سال بیت جاتے ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ پہلے دن ہی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ دنیا ایک ہے۔ وہ اس میں فرق پیدا نہیں کر سکتا۔ اسے سب کچھ ایک سا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کیسے فرق پیدا کر سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شے سبز اور فلاں سرخ ہے۔ وہ سرخ سے آگاہ نہیں ہے، وہ سبز سے بھی واقف نہیں ہے، وہ ہر شے کو سادگی سے دیکھتا ہے، اس کے لیے دنیا ایک جیسی ہے۔ اس کے لیے سب کچھ ''ایک'' ہے کہ وہ اپنے اور اپنی ماں کے جسم کے درمیان تمیز بھی نہیں کر سکتا۔

جین پیگٹ نے بچے کی ذہنی نشوونما کے حوالے سے خاصا کام کیا ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی اسی کام کے لیے وقف کر دی تھی۔ نتیجتاً اس نے بچوں کی ذہنی نشوونما کے حوالے سے بہت سی

حیران کن سچائیوں کا انکشاف کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ بچہ اپنے جسم اور دوسری چیزوں کے مابین تمیز کرنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہی پاؤں کا انگوٹھا چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ چیزوں کے مابین فرق نہیں سمجھ سکتا۔ وہ یہ بات نہیں سوچ سکتا کہ یہ اس کا اپنا پاؤں ہے اور اسے چوسنا بیکار ہے، مگر وہ دوسری چیزوں کی طرح اسے بھی پکڑ لیتا ہے، اس کے لیے سب چیزیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہ پاخانہ کر کے اسے بھی کھانا شروع کر دے گا۔ اس کے لیے کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ ہم کہیں گے ”یہ تو گندگی“ ہے، مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا، چنانچہ وہ کیا کر سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو صدیوں سے بچے کی نقالی کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ جس جگہ پاخانہ کرتے ہیں وہیں کھانا بھی کھاتے ہیں جبکہ احمق لوگ انہیں ”پہنچے ہوئے“ اشخاص سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ محض بچوں کی نقالی کرتے ہیں۔ بچوں کی طرح یہ لوگ بھی بہت سی چیزوں میں فرق روا نہیں رکھتے۔ تاہم کیا یہ لوگ وہ سب کچھ بھی کرتے ہیں جو ہونا چاہیے؟ وہ فرق کرتے ہیں مگر خود پر ایسا نہ کرنے کیلئے دباؤ ڈالتے ہیں۔ بدھا ایسا نہیں کرے گا، مسیحؑ اور کرشنا بھی ایسا نہیں کریں گے مگر آپ ملک بھر میں جابجا پھیلے ان خود ساختہ مہاتماؤں کو خود پر جبر کر کے امتیاز سے دور رکھنے کی کوشش کرتا دیکھیں گے۔

تاہم چاہے آپ مختلف چیزوں میں فرق روا رکھیں یا خود کو فرق نہ رکھنے پر مجبور کریں، ہر دو صورتوں میں ذہن مرتکز رہتا ہے۔ فرق موجود ہے تاہم آپ اسے دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ نابالغوں جیسا بن رہے ہیں مگر آپ معصوم نہیں ہیں۔

جب دو باہم مل کر ایک ہو جاتے ہیں تو پھر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور ادھر ادھر دیکھتا ہے تاہم ایسے میں اس کا ذہن خالی ہوتا ہے۔ دیکھنے کا مرحلہ پہلے آتا ہے اور اس کے بعد سوچنے کی باری آتی ہے۔ اس میں کچھ وقت لگے گا اور چند سال کے بعد ہی بچہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگا اور مختلف چیزوں کے مابین فرق کر سکے گا۔ تب بچہ دوسرے بچے سے فوراً کھلونا چھین لے گا اور آپ کہیں گے ”ایسا مت کرو، یہ اچھی بات نہیں، کھلونا تمہارا نہیں ہے“ یہ کہتے ہوئے آپ ملکیت کا فرق پیدا کر رہے ہیں کیونکہ آپ انفرادی ملکیت پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ سوچتے ہیں کہ ”یہ میرا ہے اور وہ میرا نہیں ہے“ بچے کے لیے کسی قسم کا امتیاز وجود نہیں رکھتا۔ اس

کے لیے کھلونا محض کھلونا ہی ہے اور اسے اس سے کھیلنا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ”یہ میرا کیوں نہیں ہے؟“، اگر میرا ہاتھ اس تک پہنچتا ہے اور میں اسے چھین سکتا ہوں تو یہ میرا ہے“ اس کے لیے ”میرا“ اور ”اس کا“ تاحال واضح نہیں ہیں۔

بچہ خواب اور حقیقت کے مابین تمیز نہیں کر سکتا۔ اسی لیے بچہ رات کو خواب میں خوبصورت کھلونا دیکھ کر صبح اسے پانے کی ضد بھی کر سکتا ہے ”وہ کھلونا کہاں گیا؟“ وہ فوری طور پر اسے واپس لینا چاہتا ہے۔ وہ خواب اور حقیقت کے مابین فرق نہیں سمجھ سکتا۔ وہ اسی لیے معصوم ہے کیونکہ وہ تاحال امتیاز کرنے سے محروم ہے۔

عارف اس وقت معصوم بنتا ہے جب وہ امتیاز کرنا ترک کر دیتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہ لی جائے تاکہ وہ سبز اور سرخ نیز روٹی اور پتھر کے مابین تمیز نہیں کر سکتا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنا ذہن ایک جانب رکھ دیا ہے۔ اب وہ سوچنے کے بجائے دیکھ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اپنے فلسفے کو ”درشنا“ کہتے ہیں۔ درشن کا مطلب ”دیکھنا“ ہے، اس کا مطلب سوچنا نہیں۔ فلسفہ درست ترجمہ نہیں ہے کیونکہ فلسفے کا مطلب سوچنا ہے، یہ درشن سے قطعی متضاد ہے۔

درشن کا مطلب دیکھنا اور فلسفے کا معنی سوچنا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد حالتیں ہیں۔ یہ دونوں حالتیں کسی بھی طور اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ جب امتیازات ختم ہو جاتے ہیں تو بچے کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ ”جب آپ دو کو ایک اور باطن کو ظاہر جیسا بنا دیتے ہیں ......“ کیونکہ یہ ”باطن“ اور ”ظاہر“ بھی ”امتیاز“ ہے۔

مجھے خود بھی کہنا ہے کہ ظاہر کو چھوڑ دیں، باطن کی طرف آئیں، اپنے اندر آئیں، باہر کو چھوڑ دیں۔ تاہم آپ یہ تمام باتیں غلط طور سے ان کے ظاہری مفہوم میں لے کر گمراہ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ جب آپ باہر کو ختم کر دیتے ہیں تو اندر بھی خود بخود ختم ہو جائے گا۔ جب ظاہر کا وجود نہیں ہے تو باطن کیونکر موجود ہو سکتا ہے؟ یہ ایک دوسرے سے متضاد اصطلاحات ہیں۔ باطن ظاہر کے متضاد کے طور پر وجود رکھتا ہے لہٰذا جب ظاہر باقی نہ رہے تو باطن بھی نہیں رہتا۔ آپ پہلے باہر کو ختم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اندر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اب اندر یا باہر نامی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور آپ ایک بن گئے ہیں۔ اگر اب بھی آپ میں ظاہر و باطن موجود ہیں تو پھر آپ ”دو“ ہیں اور ابھی تک تقسیم ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ Zen راہبوں نے انتہائی عجیب وغریب باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا خدا ہے اور عام زندگی ہی مذہب ہے۔ جو شے جیسی ہے ٹھیک ہے۔ کوئی شے تبدیل نہیں ہوتی کیونکہ تبدیلی کا نظریہ ہی ''دو'' کو تخلیق کرتا ہے۔ اے نے بی میں تبدیل ہونا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں دو چیزیں درآئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہ دنیا ہی خدا ہے، خدا کہیں اور موجود نہیں ہے کیونکہ ''کہیں اور'' سے دہراپن پیدا ہوتا ہے۔ خدا تخلیق کار ہے نہ آپ تخلیق ہیں، بلکہ آپ خدا ہیں۔ خدا تخلیق نہیں ہے، تخلیق خدا ہے اور تخلیقیت بھی خدا ہے''

ذہن ہر وقت فرق پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، ذہن کی یہی خصوصیت ہے۔ آپ جتنے زیادہ امتیازات تخلیق کرتے چلے جائیں گے، آپ کا ذہن اتنا ہی چالاک ہوتا چلا جائے گا۔ ذہن ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ یہ صوفی قدرے بیوقوف ہوتے ہیں، کیونکہ حدود واضح نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہب کو تصوف کہتے ہیں اور تصوف سے ان کی مراد کوئی بہت اچھی چیز نہیں ہوتی۔ ان کا مطلب دھند کی طرح مبہم، غیر واضح اور خواب جیسی کوئی شے ہوتی ہے جسے حقیقت کی طرح واضح نہیں کیا جا سکتا۔

اہل منطق کے نزدیک صوفی لوگ احمق ہوتے ہیں کیونکہ یہ تمیز کے وصف سے محروم ہوتے ہیں جبکہ امتیاز ہی وہ سب کچھ ہے جو آپ کو کرنا ہے۔ آپ کو جاننا ہے کہ کون سی شے کیا ہے؟ آپ جس قدر فرق کر سکیں گے اور جس قدر منطقی انداز میں سوچ سکیں گے اسی قدر ''حقیقت'' سے قریب ہوتے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس (جو منطق کی پیروی کرتی ہے اور جو منطق کے اطلاق کے سوا کچھ نہیں) ایٹم تک پہنچ گئی ہے۔ اہل سائنس فرق پیدا کر کے اور ہر شے کو الگ کرتے کرتے ایٹم تک رسائی پا گئے ہیں۔

دوسری جانب مذہب چیزوں کو الگ کرنے کے بجائے جوڑتے ہوئے اور حدود کو قائم کرنے کے بجائے ختم کرتے ہوئے حتمی منزل یعنی ''ایک'' تک پہنچ گیا ہے۔

سائنس ایٹم تک پہنچی ہے جس کا مطلب ''بہت سے'' اور لامتناہی تک ''بہت سے'' ایٹم ہیں جبکہ مذہب ''ایک'' تک پہنچا ہے، سائنس دماغ استعمال کرتی ہے اور ذہن حدود متعین کرتا ہے جو کہ فرق روا رکھنے کا واضح ثبوت ہے۔ مذہب ذہن کو استعمال نہیں کرتا جب کے نتیجے میں تمام حدود غائب ہو جاتی ہیں اور ہر شے ہر چیز بن جاتی ہے، تمام چیزیں ایک دوسرے سے ملنے لگتی ہیں۔

درخت آسمان سے جا ملے ہیں، آسمان درختوں پر جھک آیا ہے، زمین جنت سے مل رہی ہے اور جنت زمین تک پہنچ رہی ہے۔

اگر آپ زندگی کی گہرائی پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ صوفی درست راہ پر ہیں۔ تمام حدود انسانی ساختہ ہیں اور حقیقت میں کسی حد کا کوئی وجود نہیں ہے۔ حدود افادی ہیں مگر انہیں حقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مخصوص انداز میں فائدہ دیتی ہیں مگر رکاوٹیں بھی پیدا کرتی ہیں۔

فرق معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ آپ گزشتہ ہفتے سے ناخوش چلے آ رہے ہیں، کیا آپ واضح طور سے بتا سکتے ہیں کہ آپ کس لمحے ناخوش ہوئے تھے؟ کیا آپ ناخوشی کے آغاز اور خوشی کے اختتام کے مابین صریح خط کھینچ سکتے ہیں؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ''میں فلاں دن ٹھیک صبح ساڑھے نو بجے ناخوش ہو گیا تھا؟'' نہیں، آپ کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ تلاش کریں تو اچانک آپ کو ہر شے مبہم دکھائی دینے لگے گی۔ آپ بالکل بھی نہیں بتا سکتے کہ آپ کب ناخوش ہونا شروع ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ خوش ہو جائیں گے۔ ذرا دیکھیں کہ آپ کب دوبارہ خوش ہوئے۔ ہو سکتا ہے آپ کو یاد نہ رہے کیونکہ آپ ماضی میں آگاہ نہیں تھے مگر اب آپ ناخوش ہیں اور بعض اوقات خوش ہو جائیں گے کیونکہ ذہن ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ اگر آپ مستقل ناخوش رہنا چاہتے ہوں تو بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ تو پھر دیکھیں کہ آپ کس وقت دوبارہ خوش ہوئے؟ آپ خوش ہو جائیں گے جبکہ اس لمحے کا ادراک ایک مرتبہ پھر کھو بیٹھیں گے۔ یہ مبہم ہو گا۔

اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اور ناخوشی دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ فرق معلوم کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور ان کی حدود ایک دوسرے میں گھسی ہوئی ہیں۔ حقیقت میں کسی قسم کی حدود کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ ایک موج کی مانند ہیں۔ یہ پہاڑی اور وادی کی طرح ہیں۔ وادی پہاڑی سے جڑی ہوتی ہے۔ لہر آتی ہے اور پانی کا خلا اس کے پیچھے ہوتا ہے۔ پہاڑی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے؟ وادی کہاں ختم ہوتی ہے؟ کہیں نہیں، یہ دونوں ایک ہیں۔

یہ آپ کا ذہن ہی ہے جو کہتا ہے کہ ''یہ وادی اور وہ پہاڑی ہے'' کیا وادی کے بغیر پہاڑی کا تصور ممکن ہے؟ کیا کوئی وادی پہاڑی کے بغیر بھی ہو سکتی ہے؟ کیا غمی کے بغیر خوشی کا وجود ممکن ہے؟

اگر آپ کوشش کر رہے ہیں تو پھر آپ ناممکن کے حصول کیلئے کوشاں ہیں۔ کیا آپ خوشی کے بغیر ناخوشی پا سکتے ہیں؟ اسے چھوڑ دیں کیونکہ خوشی اور ناخوشی شاعرانہ باتیں ہیں۔ صحت اور بیماری زیادہ عضویاتی چیزیں ہیں۔ ذرا دیکھئے تو آپ کب بیمار پڑے؟ اس حوالے سے آپ واضح طور سے کہاں خط کھینچ سکتے ہیں؟ اسی طرح آپ صحت یاب کب ہوئے؟ کوئی شخص اپنی صحت یابی کے لمحے کا درست طور سے تعین نہیں کر سکتا۔ بیماری صحت بن جاتی ہے اور صحت بیماری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پیار نفرت میں بدل جاتا ہے اور نفرت پیار بن جایا کرتی ہے، غصہ رحم دلی میں بدل جاتا ہے اور رحم دلی غصے میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے، اسے سمجھنا غیر اطمینان بخش ہو سکتا ہے مگر صوفیاء سچے ہیں۔

آپ بچے تھے، آپ کب جوان ہوئے؟ آپ پر جوانی کب آئی؟ آپ جوان ہیں، کسی دن آپ بوڑھے ہو جائیں گے، غور کریں اور کیلنڈر پر نشان لگا کر لکھ لیں کہ ''فلاں دن میں بوڑھا ہو گیا'' اگر آپ اپنے بوڑھا ہونے کے وقت کا قطعیت سے تعین نہیں کر سکتے تو اپنے زندہ اور مردہ ہونے کا تعین کیسے کر سکتے ہیں؟ یہاں تک کہ سائنسدانوں کو بھی اس حوالے سے بے پناہ مشکلات کا سامنا ہے کہ انسان کو کب ''مردہ'' قرار دیا جانا چاہئے۔ اب تک اس حوالے سے جو کچھ بھی جانا گیا ہے اسے محض افادی تو کہا جا سکتا ہے تاہم یہ سچائی نہیں ہو سکتی۔

انسان کو کب مردہ قرار دیا جانا چاہئے؟ کیا اسے اس وقت مردہ کہا جائے گا جب وہ سانس لینا بند کر دے گا؟ تاہم دنیا میں ایسے یوگی بھی پائے جاتے ہیں جو سائنسی لیبارٹریوں میں دس دس منٹ تک سانس روکنے کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

لہٰذا ''جب انسان مرجائے تو وہ سانس نہیں لیتا'' والی بات موت کا پیمانہ نہیں کہلا سکتی۔ ہو سکتا ہے وہ دوبارہ سانس لینے کے قابل نہ ہو مگر یہ مردہ ہونے کی ٹھوس علامت نہیں ہے کیونکہ لوگ دس منٹ تک سانس روکنے کا مظاہرہ بھی کر چکے ہیں۔ وہ شخص یوگی بھی ہو سکتا ہے، ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ زندگی کی طرف واپس نہ آنا چاہے مگر آپ کو اسے مردہ کہنے کا کوئی حق نہیں۔ تاہم ہمیں اسے مردہ کہنا پڑتا ہے کیونکہ ہمیں اسے تلف کرنا ہے۔

انسان واقعتاً کب مرجاتا ہے؟ کیا انسان اس وقت مردہ تصور کیا جاتا ہے جب اس کا دل کام کرنا بند کر دیتا ہے؟ یا پھر جب اس کا دماغ رک جاتا ہے؟ اب سائنسی لیبارٹریوں میں جسم کے

بغیر دماغ موجود ہیں اور وہ کام بھی کر رہے ہیں۔ کون جانے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہو سکتا ہے وہ خواب دیکھ رہے ہوں؟ وہ اس امر سے آگاہ بھی نہیں ہوں گے کہ انہوں نے اپنا جسم کھو دیا ہے۔ ان دماغوں کا مشاہدہ کرنے والے سائنسدان کہتے ہیں کہ ان میں بھی ویسا ہی اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ سوتے اور جاگتے ہیں اور ایسی علامات ظاہر کرتے ہیں جیسے خواب دیکھ رہے ہوں۔ ان دماغوں کا مشاہدہ کرنے والے سائنس دان ان میں غصے، سوچنے، غور و فکر، تناؤ اور سکون کی علامات بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اندر سے کیا سوچتے ہوں گے؟ وہ اس امر سے آگاہ نہیں ہوں گے کہ اب ان کے پاس جسم نہیں رہا، مگر کیا آپ ان دماغوں کو مردہ کہہ سکتے ہیں؟ وہ اچھی طرح کام کر رہے ہیں۔ کون سا حصہ اور کون سا لمحہ موت کی علامت ہو سکتا ہے؟

دوسری جنگ عظیم کے دوران روس میں تجربہ کیا گیا اور اچانک دل بند ہو جانے کے باعث مردہ قرار دیے جانے والے کم از کم چھ افراد تا حال زندہ ہیں۔ انہیں مردہ سمجھ لیا گیا تھا مگر ان کا دل اور دماغ خون کھینچتا ہے۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے ہیں اور تا حال زندہ ہیں۔ کیا ہوا؟ وہ واپس آ گئے۔

کیا زندگی کے اختتام اور موت کے آغاز کے مابین واقعی کوئی سرحد موجود ہے؟ نہیں، یہ محض لہر جیسا مظہر ہے۔ زندگی اسی طرح موت کے پیچھے ہوتی ہے جس طرح موج کے پیچھے پانی کا خلا موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک ہیں۔ یہ ایک ہی شے کا اتار چڑھاؤ ہے۔

صوفیاء کا کہنا ہے کہ افادی مقصد کیلئے آپ کا تقسیم کرنا درست ہے مگر حقیقت ناقابل تقسیم ہے۔ اسی ناقابل تقسیم سے آگاہی پانے کیلئے کیا کیا جائے؟ بس تقسیم کرنے والے نظام کو ایک جانب رکھ دیں۔ یہی مراقبہ اور استغراق ہے۔ ذہن کو ایک جانب رکھ دیں اور دیکھیں۔ ذہن کے بغیر دیکھیں۔ ذہن کے بغیر آگاہ رہیں۔ دیکھیں اور خیالات کو اپنے اور کائنات کے مابین پردہ مت بننے دیں۔ جب خیالات کے بادل موجود نہیں ہوتے تو سورج پوری آگہی کے ساتھ چمکتا ہے اور دنیا ایک ہو جاتی ہے۔

''جب آپ دو کو ایک بنا دیتے ہیں اور جب آپ باطن کو ظاہر، ظاہر کو باطن اور اوپر کو نیچے جیسا بنا دیتے ہیں، جب آپ نر اور مادہ کو ایک اکائی میں تبدیل کر دیتے ہیں تو تبھی آپ سلطنت میں داخل ہو سکتے ہیں''

سب سے بڑا اور گہرا ترین فرق نر اور مادہ کے مابین ہوتا ہے۔ کیا آپ نے مشاہدہ کیا کہ آپ کبھی یہ بات نہیں بھولے کہ فلاں انسان مرد یا عورت ہے۔ آپ اس کا نام بھول سکتے ہیں، مذہب بھی بھول سکتے ہیں، آپ اس کے چہرے کو بھی مکمل طور سے بھلا سکتے ہیں مگر آپ یہ بات کبھی نہیں بھول سکتے کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اس بات کو بھولنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی یادداشت پر مرتب ہونے والا سب سے گہرا اثر امتیاز/فرق کے باعث ہے۔

آپ کو کسی شخص سے ملاقات کیے بیس برس بیت گئے ہوں تو آپ کو اس کے حوالے سے کوئی بات یاد نہیں رہتی، اس کا چہرہ اور نام آپ کی یادداشت سے غائب ہو جاتا ہے مگر یہ بات یادداشت سے چپک کر رہ جاتی ہے کہ وہ مرد تھا یا عورت۔ آپ کسی کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کے ذہن میں اس کی جنس کی پہچان پیدا ہوتی ہے اور آخر میں اس شخص کو بھولنے کے باوجود اس کے حوالے سے یہی پہلی بات آپ کے ذہن میں رہ جاتی ہے۔ اگرچہ آپ شعوری طور پر کسی کو مرد یا عورت کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے تاہم جب بھی آپ کسی کو دیکھتے ہیں تو آپ کا دماغ اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ یہ شخص مرد یا عورت ہے۔ اگر وہ عورت ہو تو آپ اس سے کسی اور انداز میں پیش آتے ہیں جبکہ مرد ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ آپ کا رویہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اگر وہ عورت ہو تو آپ کے اندر موجود مرد اس کے حوالے سے کشش محسوس کرتا ہے (خواہ آپ اس سے واقف ہوں یا نہ ہوں) ہوسکتا ہے آپ شعوری طور سے ایسا نہ کر رہے ہوں مگر عورت سے معاملے کے وقت آپ کا رویہ زیادہ محبت آمیز اور محتاط ہوتا ہے۔

کاروباری حضرات اس بات کو خوب سمجھتے ہیں لہٰذا اب اشیاء بیچنے والے ملازموں کو خواتین ملازماؤں سے تبدیل کیا جارہا ہے۔ ایسا ہونا ہی ہے۔ اگر خریدار مرد ہے تو بیچنے کیلئے عورت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ خریدار عورت کو باآسانی ''نہیں'' نہیں کہہ سکتا۔ جب کوئی عورت آپ کو جوتا دکھاتی ہے اور اسے آپ کے پاؤں میں پہنانے کی کوشش کرتی ہے اور اس دوران جب اس خوبصورت عورت کے ہاتھ آپ کے پاؤں کو چھوتے ہیں تو یکلخت جوتا غیر اہم ہو جاتا ہے۔ جوتا ثانوی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ جوتا آپ کو تنگ ہو مگر آپ کہتے ہیں ''خوبصورت، یہ بہت زبردست ہے'' آپ کو اسے خریدنا پڑتا ہے۔ دراصل آپ جوتے کے بجائے عورت کو خرید رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اشتہار کے ساتھ (خواہ یہ کار کا اشتہار ہو یا جوتے کا) آپ کو نیم عریاں

تصویر لگانا پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کار کے بجائے عورت کو خریدا جاتا ہے۔ جنس ہی خریدی اور بیچی جاتی ہے، اس کے علاوہ ہر شے سطحی ہے۔

آپ کو ہر طرف جنس کی تلاش ہے۔ مسیح کہتے ہیں ''اگر جنس کی تلاش جاری رہے تو آپ معصوم نہیں بن پائیں گے'' ایسے میں آپ تقسیم شدہ ہی رہیں گے۔ اگر آپ مرد ہیں تو عورت کو تلاش کر رہے ہیں، اگر آپ عورت ہیں تو آپ کو مرد کی تلاش ہے۔ ایسی تلاش ظاہری جستجو کہلائے گی، یہ باطنی جستجو نہیں ہوگی۔ آپ اپنے اندر داخل نہیں ہوسکتے، آپ گیانی نہیں بن سکتے۔ عورت آپ کو پریشان کر دے گی، وہ آپ کا پیچھا کرے گی۔ اگر آپ مزاحمت کریں، لڑیں یا اپنی آنکھیں بند کرلیں تو وہ مزید خوبصورت ہوتی چلی جائے گی، وہ آپ کو پھسلا لے گی۔

کیا ہونا چاہئے؟ اس دہرے پن سے اوپر اٹھنا کیونکر ممکن ہے؟ بہت سے طریقۂ کار استعمال ہوچکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر محض دھوکہ اور فریب ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہر عورت کو اپنی ماں سمجھیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، یہ دھوکہ ہے۔ ہر عورت کو اپنی بہن سمجھیں۔ اس سے بھی کچھ نہیں ہوگا کیونکہ وہ عورت ہی رہے گی۔ بہن یا ماں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ عورت ہے اور آپ مرد ہیں۔ ایک گہری جستجو جاری رہتی ہے، یہ اس قدر حیاتیاتی جستجو ہے کہ آپ کے لاشعور میں جاری رہتی ہے۔

آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں اور ایک عورت اندر داخل ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو دیکھیں، کیا ہوا؟ اچانک آپ ایک مختلف شخص بن گئے۔ اگر وہ خوبصورت ہے تو پھر آپ مزید تبدیل ہو گئے ہیں۔ کیا ہوتا ہے؟ اب آپ کچھ اور نہیں بلکہ صرف مرد ہیں۔ آپ کچھ اور نہیں صرف جنسی ہارمون ہیں۔ یہ ہارمون کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ آپ کو ایک جانب ہٹا دیتے ہیں۔ آپ کا شعور گم ہوگیا ہے، آپ تقریباً غیر شعوری حالت میں آگئے ہیں۔ آپ کا طرزعمل کچھ ایسا ہے جیسے آپ نشے میں ہوں۔

تاحال جنسی جذبے سے بڑی شراب اور اس سے بڑا نشہ دریافت نہیں ہوا۔ یہ فوری طور پر ہر شے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ جب آپ جنسی ہو جاتے ہیں تو چیزیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ہر شے مختلف دکھائی دینے لگتی ہے اور اس کی چمک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ مزید زندہ ہو گئے ہیں۔ اب آپ چلتے نہیں بلکہ بھاگتے ہیں، آپ کچھ نہیں کہتے بلکہ صرف گاتے ہیں۔ آپ کی زندگی

ترس کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اب آپ ایک مختلف سمت میں زندہ ہیں۔ جنس مخالف کی [illegible]گی میں آپ ہموار دنیا میں واپس آجاتے ہیں۔ یہ بے رنگ و بے کیف دنیا ہے۔ آپ گا سکتے ہیں نہ آپ کیلئے بھاگنا ممکن ہوتا ہے۔ ہر شے سست ہو جاتی ہے۔ اب ایک مرتبہ پھر کوئی مرد یا عورت آپ کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں اور اچانک ہر شے رنگین لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟ ایسا ہوتا ہے تو آپ ایک مرتبہ پھر دہرے پن کا شکار ہیں۔ یہ بے حد گہرا دہرا پن ہے جو آپ کو حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرنے دے گا۔ دراصل حقیقت ہی خوشی کی ضامن ہے، یہ خوش ہوتی ہے نہ ہی ناخوش۔

حقیقت خوشی اور ناخوشی سے آگے کی چیز ہے۔ اس میں تناؤ کی کیفیت ہوتی ہے نہ ہی سکون پایا جاتا ہے۔ یہ تاریکی اور روشنی سے بھی پرے ہے۔ اب تمام تر دہرا پن ختم ہو گیا ہے اور آپ کو خوشی حاصل ہو گئی ہے۔ یہ ''دو'' سے آگے جانے کا مرحلہ ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی عارف ''خوش'' ہے۔ وہ خوش نہیں ہوتا کیونکہ خوشی کے پیچھے غم ہوتا ہے۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ ناخوش ہے۔ عارف مبارک ہوتا ہے، وہ دہرے پن سے آگے گزر آیا ہے۔ اب وہاں پہاڑیاں ہیں نہ وادیاں، وہ زمین پر چلتا ہے اور ایک سطح پر محوِ خرام ہوتا ہے۔ وہاں اتار چڑھاؤ نہیں ہوتے کیونکہ اتار چڑھاؤ دہرا پن ہیں۔

چنانچہ مسیح کا کہنا ہے کہ ''جب اوپر اور نیچے کا وجود باقی نہیں رہتا'' اور جب دو باقی نہیں رہتے تو آپ کیلئے انتخاب کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں آپ محض موجود ہوتے ہیں۔ یہ موجودگی ایک جیسی سطح ہے۔ یہاں لہروں کا کوئی وجود نہیں۔ سمندر کی سطح مطلق خاموش ہے اور اس پر کسی موج کا نشان نہیں ملتا کیونکہ پانی میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اب سمندر آئینے جیسی چیز بن گیا ہے جس پر کوئی موج دکھائی نہیں دیتی۔ تمام اضطراب ختم ہو چکا ہے۔

اضطراب کا سبب دہرا پن ہوتا ہے اور جنس ہی تمام تر دہرے پن کی بنیاد ہے۔ آپ تمام دوسری چیزوں کو باآسانی چھوڑ سکتے ہیں مگر چھوڑنے والی بنیادی شے جنس ہے۔ یہی کام سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ آپ کے جسم کے ہر خلیے میں موجود ہے۔ آپ ایک جنسی وجود ہیں اور اسی حالت میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح نے کہا تھا کہ ''جب تک آپ دوسرا جنم نہیں لیتے، اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا'' آپ جس حالت میں ہیں اس میں اتار چڑھاؤ کا شکار رہیں

گے اور آپ کی موجودہ حالت آپ کو غمزدہ رکھے گی۔

''اور جب آپ نر اور مادہ کو ''ایک'' کر دیں گے تا کہ نر نر نہ رہے اور مادہ مادہ نہ ہو تو تبھی آپ سلطنت میں داخل ہوں گے''

لہٰذا کیا ہونا چاہئے؟ ذات کے اندر ایک دائرہ بننا ہے۔ مسیح نے واضح طور سے نہیں بتایا کہ یہ ہونا چاہئے کیونکہ ایسے راز ہر ایک پر عیاں نہیں کیے جاتے بلکہ صرف حواریوں کو بتائے جاتے ہیں۔ مسیح نے بہر طور اپنے حواریوں کو ان سے آگاہ کیا ہوگا کیونکہ محض ''ایک ہو جاؤ'' کہنے سے کوئی ایک نہیں ہو جاتا۔ محض یہ کہنا کافی نہیں کہ نر کو مادہ اور مادہ کو نر ہونا چاہئے تا کہ دہرا پن ختم ہو سکے۔ یہ تو مقصد ہے۔ اس مقصد کے حصول کا طریق کار کیا ہے؟

یقیناً مسیح نے طریق کار خفیہ رکھا۔ انہوں نے یہ راز صرف اپنے خاص حواریوں پر آشکار کیا کیونکہ ایسے عظیم راز آپ کو خطرناک بھی بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ غلطی کر بیٹھیں اور ان کا ذرا بھی غلط استعمال کر گزریں تو آپ پاگل ہو جائیں گے۔ یہی سب سے بڑا مسئلہ اور خوف ہے۔

عام طور پر جیسے آپ ہیں اس حالت میں آپ کو تقسیم شدہ کہا جائے گا۔ آپ کی مردانہ توانائی زنانہ توانائی کو تلاش کر رہی ہے اور آپ کی زنانہ توانائی مردانہ توانائی کی جستجو میں ہے۔ عام انسان کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ اس تمام صورتحال کو تبدیل ہونا ہے۔ آپ کی مردانہ توانائی زنانہ توانائی کو اپنے اندر تلاش کر رہی ہے۔ آپ کے اندر موجود مرد کا اپنے اندر کی عورت سے ملنا بے حد خطرناک ہے کیونکہ اسے فطرت نے مہیا نہیں کیا۔

فطرت نے آپ کو مرد یا عورت سے ملنے کی خواہش عطا کی ہے۔ یہ خواہش فطری ہے۔ تاہم محض آپ کی اکیلی ذات کے اندر اس ہونے کے ہونے کی کوشش فطری نہیں ہے۔ چابی کا استعمال نہایت نفاست سے ہونا چاہئے۔ یہ کسی ماہر یا ایسے شخص کے ذریعے ہونا چاہئے جو اس راستے پر سفر کا تجربہ رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے گہرے ترین راز صحیفوں کے بجائے صرف روشناسی کے ذریعے دیے جا سکتے ہیں۔

تاہم میں آپ کو چند ایسے اشارے دوں گا جن کی مدد سے آپ ایسا کر سکتے ہیں، البتہ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیں کہ اگر آپ ایسا کرنے کے خواہشمند ہیں تو احتیاط سے ساکت ہو جائیں، میں جو کچھ بھی کہوں آپ نے راہ سے نہیں ہٹنا بصورت دیگر معاملات بگڑ جائیں گے، اس کے

بجائے عام آدمی ہونا زیادہ بہتر ہے کیونکہ بہت سے مذہبی لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ چابی کا مالک ہونے کے باوجود اسے استعمال کرنا نہیں جانتے۔ آپ اسے غلط انداز میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے ایک مرتبہ بھی چابی غلط انداز میں لگائی تو تالا بگڑ جائے گا اور پھر اس کی مرمت کرنا آسان نہیں ہوگا۔

ایسا صرف ماہر کی نگرانی میں ہونا چاہئے تاکہ اسے علم ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں آپ کو چند باتیں بتاتا ہوں۔ چونکہ میں یہاں موجود ہوں اس لیے اگر آپ چاہیں تو ان پر عمل کر سکتے ہیں۔

پہلی بات: جب آپ اپنے ساتھی (مرد یا عورت) کے ساتھ مباشرت کرتے ہیں تو وہ اندرونی مرد یا عورت کو دیکھنے کا درست ترین لمحہ ہوتا ہے۔ جب آپ کسی عورت سے جنسی اختلاط کریں تو اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس عمل کو استغراق میں تبدیل کر لیں۔ ظاہری عورت ہمیشہ اندرونی عورت کو جگانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جب آپ جنسی عمل کرتے ہیں تو آپ کی مردانہ اور زنانہ اندرونی توانائیاں عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ جب آپ لذت جماع حاصل کرتے ہیں تو یہ آپ اور ظاہری عورت کے مابین نہیں بلکہ ہمیشہ آپ اور آپ کی اندرونی عورت کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ مستعد ہیں تو پھر یقیناً اس مظہر سے آگاہ ہو جائیں گے کہ آپ کے اندر توانائیوں کا ملاپ ہو رہا ہے۔ جب بھی ایسا ہوگا تو آپ اپنے پورے جسم میں لذت محسوس کریں گے۔ ایسے میں جنسی عمل کی لذت جسم کے کسی ایک حصے تک محدود نہیں رہے گی۔ اگر جنسی عمل کی لذت جسم کے مخصوص حصے تک محدود رہے تو پھر اس عمل کی حیثیت مشت زنی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لذت جماع کا حقیقی مطلب جسم کے ہر حصے، ہر بافت اور ہر دھڑکن میں نئی زندگی اور نئی توانائی محسوس کرنا ہے کیونکہ اس عمل میں بے حد توانائی خارج ہوتی ہے۔ حقیقی ملاپ آپ کی ذات کے اندر ہوتا ہے تاہم اگر آپ نے باہر کی جانب دیکھا تو اس سے محروم رہ جائیں گے۔

ظاہری عورت یا ظاہری مرد محض باطن کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جب آپ کو کسی عورت یا مرد سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ مرد یا عورت کسی نہ کسی طرح باطن سے رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کہتے ہیں ''مجھے اس سے محبت کیوں ہوگئی ہے؟ آپ کے پاس اس کی کوئی توجیہہ نہیں ہوتی کیونکہ بہرحال یہ عقلی شے نہیں ہے۔ آپ اپنے اندر ایک عورت لیے پھرتے ہیں۔ جب بھی کوئی عورت اس اندرونی عورت سے مطابقت اختیار کر لیتی ہے تو آپ

کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس پیار کا جال آپ نے نہیں بنا ہوتا۔ آپ کا ذہن پیار کے جال میں گرفتار نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ بے حد غیر شعوری عمل ہے۔ اس عورت میں آپ ایک مخصوص جھلک دیکھتے ہیں اور اچانک آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ عورت ہے جس کی آپ کو تلاش تھی۔

اس عورت کو آپ کی مطلوبہ عورت کون بناتا ہے؟ دوسروں کیلئے وہ ان کی مطلوبہ عورت نہیں ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے دیکھ کر نفرت اور اس سے کراہت کا اظہار کریں گے۔ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اس عورت پر دوسری نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ ایسے لوگ بھی ملیں گے جنہیں اس عورت میں کوئی شے دکھائی نہیں دیتی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے جو آپ پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ ''تمہیں اس عورت سے پیار کیوں ہو گیا؟، کیا تم پاگل ہو؟'' تاہم وہ عورت کسی نہ کسی طرح آپ کے اندر کی عورت سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیار کی عقلی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ پیار خود بخود ہو جاتا ہے۔ آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اگر پیار نہیں ہو رہا تو ایسی صورت میں آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

جب آپ کسی عورت سے جسمانی تعلقات قائم کرتے ہیں تو آپ کی اندرونی توانائی نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اس نقطے پر پہنچ کر باہر مت دیکھیں وگرنہ آپ بہت خوبصورت شے سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ نہایت پراسرار شے ہے جو آپ کے اندر وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ آپ ایک دائرے کی صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کے دو یعنی مرد اور عورت باہم ملاپ کر رہے ہیں اور آپ دو سے ایک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لمحے میں ایڑھی سے چوٹی تک آپ کا پورا جسم کانپنے لگ جائے گا۔ جسم کا ہر پٹھہ زندگی کا ارتعاش محسوس کرے گا کیونکہ یہ دائرہ پورے جسم پر محیط ہے۔ یہ جنس نہیں بلکہ جنس سے آگے کی چیز ہے۔ غور کریں، نقطۂ عروج کو محسوس کریں اور اندرونی توانائیوں کو باہم ملتا محسوس کریں۔ اس کے بعد جوار بھاٹے کو ختم ہوتا اور خود کو پاتال میں گرتا دیکھیں۔ آپ آہستہ آہستہ توانائیوں کو ایک دوسرے سے الگ ہوتا محسوس کریں گے۔

اگر آپ چند مرتبہ ایسا کریں گے تو آپ کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ بیرونی عورت یا مرد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ کسی ظاہری جسم کے بغیر بھی ممکن ہے کیونکہ یہ ظاہر کے بغیر وقوع پذیر ہوتا ہے کہ ظاہر تو محض لبلبی ہوتی ہے اور آغاز کا ذریعہ ہوتا ہے۔ آپ اپنے اندر سے بھی آغاز کر سکتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ آپ یہ جان جائیں گے تو پھر خود بخود اپنے اندر سے آغاز کرنے کے قابل ہو

جائیں گے۔ آپ تجربے کے ذریعے ہی اسے جان پائیں گے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیسے ہوگا۔ آپ کو مشاہدہ کرنا اور دیکھنا ہوگا اور اسی صورت میں آپ یہ جان پائیں گے کہ توانائیاں کیسے آتی ہیں، لذت کیسے حاصل ہوتی ہے اور یہ توانائیاں کیسے ایک دوسرے سے الگ ہوجاتی ہیں۔

ایک لمحے کیلئے آپ بھی دو سے ایک ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی عمل میں اس قدر کشش پائی جاتی ہے اور جماع سے اس قدر لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ واحد لمحے میں آپ بھی دو سے ایک ہو چکے ہوتے ہیں۔ لذت جماع کے لمحات میں ذہن کا وجود باقی نہیں رہتا۔ دماغ کی موجودگی میں لذت جماع کا حصول ناممکن ہے۔ لذت جماع کے لمحے میں نہ صرف ایک خیال بلکہ ہر قسم کے خیالات پرے ہٹ جاتے ہیں۔ ایسے میں آپ خیالات کے بغیر ہوتے ہیں۔ آپ کا وجود تو برقرار ہوتا ہے مگر اس میں دماغ موجود نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ محض چند لمحوں کیلئے ہوتا اور آپ اس سے باآسانی محروم رہ سکتے ہیں۔ یہ اس قدر چھوٹا سا وقفہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کی توجہ بیرونی جانب مرکوز ہو تو آپ اس سے محروم رہ جائیں گے۔

چنانچہ اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنے اندر دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کچھ کرنے کی کوشش مت کریں بلکہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے دیکھیں۔ ایسا بار بار ہوتا ہے، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ سورج کی روشنی میں چلنے کے بعد کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ایسے میں آپ کو ہر طرف تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ آپ کی آنکھیں کمرے کے ماحول سے آشنا نہیں ہوئیں اس لیے آپ کو ہر جگہ تاریکی نظر آتی ہے۔ انتظار کریں اور خاموشی سے دیکھتے رہیں۔ آہستہ آہستہ تاریکی چھٹ جائے گی اور آپ اردگرد کی چیزوں سے واقف ہوجائیں گے۔ اب آپ کی آنکھیں اس کی عادی ہوگئی ہیں۔

باہر سے اندر آنا بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے کیونکہ آپ کی آنکھیں بیرونی دنیا کی عادی ہیں۔ اندر تاریکی ہے اور جب تک آپ خود کو تیار کرتے ہیں اس وقت تک وہ مخصوص لمحہ گزر چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا بند آنکھوں کے ساتھ بار بار مراقبہ کریں۔ اپنے اندر دیکھیں تاکہ آپ اندرونی تاریکی سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ دراصل یہ تاریکی نہیں ہے۔ آپ کو یہ اس لیے تاریکی معلوم ہوتی ہے کہ آپ باہر سے آئے ہیں۔ آہستہ آہستہ چیزیں واضح ہونے لگتی ہیں۔ تبھی ایسا لمحہ آتا ہے کہ چیزیں بے حد واضح ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ آپ آنکھیں کھولتے ہیں تو آپ کو روشنی نظر آنے لگتی ہے۔

اروند کہتا ہے کہ جب مجھے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ اندر کیا ہے تو مجھے باہر تاریکی کا راج دکھائی دینے لگا۔ ایسے میں بیرونی دنیا مردہ معلوم ہونے لگی کیونکہ اب کچھ اونچا اور بڑا وقوع پذیر ہو رہا تھا۔

غور کریں کہ اندرونی دائرہ کیسا بنتا ہے اور دو توانائیاں کیسے ایک میں تبدیل ہوتی ہیں۔ اس ''ایک'' میں کوئی دماغ اور کوئی خیالات نہیں ہوتے۔ دیکھیں، آہستہ آہستہ آپ یہ دیکھنے کے قابل ہوجائیں گے کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آپ نے یہ ہوتا دیکھ لیا تو بیرون ختم ہوسکتا ہے۔ اسے ختم کرنے کی ضرورت نہیں، مگر یہ ختم ہوسکتا ہے۔

عورت خوبصورت ہے، مرد بھی خوبصورت ہے۔ پیار اچھی چیز ہے اور کچھ بھی غلط نہیں۔ یہ صحت مند سرگرمی ہے۔ اسے ختم کرنے کی ضرورت نہیں، مگر یہ ختم ہوسکتا ہے اور آپ اس کے محتاج نہیں رہتے۔ اب آپ اس مظہر کو اپنے اندر وقوع پذیر ہونے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ تب ایسا لمحہ آتا ہے جب اندرونی دائرہ ابدی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ بیرون کی مدد سے یہ ابدیت حاصل نہیں ہوسکتی۔ بیرون نے علیحدہ ہونا ہے اور یہ علیحدگی لازمی ہے۔ اندرون کے ساتھ الگ ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اندرونی شادی کی صورت میں طلاق کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ہمیشہ اندر ہوتی ہے اور اس میں دونوں فریق موجود ہوتے ہیں۔ جب یہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تو پھر کسی طلاق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیرون کے ساتھ مسلسل طلاق ہوتی رہتی ہے۔ ایک لمحے آپ اکٹھے ہوتے ہیں اور دوسرے لمحے ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔

جب آپ کے اندر یہ دائرہ مسلسل جاری رہتا ہے تو آپ ''ایک'' ہوجاتے ہیں، جیسا کہ مسیح کا کہنا ہے۔

''اور جب آپ نر اور مادہ کو ایک کردیتے ہیں (تاکہ نر نر نہ رہے اور مادہ مادہ نہ رہے) تو تبھی آپ سلطنت میں داخل ہوسکتے ہیں''

آپ اندر داخل ہوگئے۔ آپ مکمل ہوگئے ہیں۔ آپ تقسیم شدہ نہیں ہیں اور ناقابل تقسیم بن گئے ہیں۔ اب آپ ایک ذات ہیں۔ اب آپ آزاد ہیں اور آپ کو کسی شے کی کمی نہیں۔ آپ اپنی ذات میں مکمل ہوگئے ہیں۔ جب تک یہ دائرہ نہیں بنا تھا اس وقت تک آپ میں کسی شے کی کمی تھی اور آپ اپنی تکمیل کے لیے دوسروں کے محتاج تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جنس غلامی جیسی دکھائی دیتی ہے اور یہ ایسی ہی چیز ہے۔ یہ محتاجی جیسی ہے اور جب آپ خود کو محتاج محسوس کرتے ہیں تو اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ اس طرح آپ کی اپنے پیار کے ساتھ مخاصمت شروع ہو جاتی ہے۔ آپ آزردہ ہوتے ہیں اور اپنے پیار کو چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے کیونکہ آپ اس کے محتاج ہیں۔

کوئی شخص دوسروں کا محتاج نہیں ہونا چاہتا کیونکہ ہر محتاجی کا مطلب محدود کا پابند ہونا ہے۔ دوسرا آپ پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا آپ کو اپنے زیر اثر لینے کی سعی کرتا ہے۔ اگر آپ محتاج ہوں تو آپ کو ایک پر دوسرے کی بالا دستی کو ترجیح دینا پڑتی ہے کیونکہ آپ خوفزدہ ہوتے ہیں۔ یہ باہمی معاہدہ ہے کہ ''میں تم پر انحصار کروں گا اور تم مجھ پر انحصار کرو گے، تا کہ ہم مخصوص انداز میں ایک دوسرے کو اپنے اثر میں لے سکیں اور مخصوص انداز میں ایک دوسرے پر اپنی بالا دستی قائم کر سکیں''

تاہم کوئی شخص تسلط اور قبضہ پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ پیار مصیبت کا نام ہے۔ اگر آپ کسی شخص سے محبت کرتے ہیں اور اسے برا بھلا بھی کہتے ہیں تو آپ کیسے خوش رہ سکتے ہیں؟ یہاں تک کہ انتہائی خوبصورت شخص بدصورت دکھائی دینے لگتا ہے۔

ملا نصر الدین ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسی دوران اس کی بیوی وہاں آ گئی۔ اسے دیکھ کر دوست بولا ''ملا، میرا خیال ہے کہ یہ تمہاری خوبصورت ترین بیوی ہے''

ملا نصر الدین نے اسے اداسی سے دیکھا اور جواب دیا ''یہ میری واحد بیوی ہے''

پیار کرنے والوں کو ہمہ وقت ایسی ہی اداسی کا سامنا رہتا ہے کیونکہ کوئی عورت تکمیل نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ اگر آپ کو دنیا کی تمام عورتیں بھی مل جائیں تو تب بھی آپ خود کو مکمل محسوس نہیں کریں گے کیونکہ ''اندرون'' اس ''تمام'' سے کہیں بڑا ہے۔ دنیا کے تمام مرد ایک عورت کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہو گی، اور یہ وقت کا مسئلہ، کیونکہ ملاپ صرف ایک لمحے کیلئے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد علیحدگی ہی ہونا ہوتی ہے کیونکہ کوئی مرد اندرون جیسا نہیں ہو سکتا۔

جب تک آپ اندرونی یگانگت حاصل نہیں کر پاتے اس وقت تک آپ مصائب سے بھری ایک زندگی سے دوسری کی جانب سفر کرتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے تبدیلی آپ کو امید دلا دے مگر یہ

نا امیدی ہے۔ یہ تمام معاملہ نا امیدی پر مبنی ہے۔ جب یہ دائرہ بنتا ہے تو آپ ایک ہو جاتے ہیں اور بچے کی طرح معصوم بن جاتے ہیں۔ نہ صرف بچہ بلکہ آپ بچے سے بھی زیادہ معصوم ہو جاتے ہیں اور عارف کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

مسیح کے ان الفاظ پر دھیان کیجئے اور میں نے جو کہا ہے ویسا ہی کرنے کی کوشش کیجئے۔ اگر آپ اندرونی دائرے کے لیے کام کرنا شروع کرتے ہیں تو مجھے اس امر سے مسلسل آگاہ رکھیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کچھ غلط ہوتا ہے اور دو توانائیاں غلط انداز میں باہم ملتی ہیں تو آپ پاگل ہو جائیں گے۔

عارف بننے کی راہ میں یہی خوف حائل ہے۔ اگر آپ گر گئے تو پھر انتہائی گہرائی میں جا پڑیں گے۔ اسی طرح اگر آپ پہنچ گئے تو نہایت بلندی پر پہنچ جائیں گے۔ ایسے میں آپ دانا بن جائیں گے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص بلندیوں کا سفر کرنا چاہتا ہے تو اس کے پاس ایسا کرنے کا حوصلہ اور ہمت ہونی چاہئے کیونکہ اگر آپ گرے تو پاتال میں جا گریں گے۔ ہر اونچائی کے ساتھ گہری کھائی بھی موجود ہوتی ہے۔

لہٰذا یاد رکھیں کہ آپ کو متوازن کوشش کی ضرورت ہے۔ اگر آپ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو بتاؤں گا، تاہم یہ صرف نجی طور پر ہی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح نے مقاصد کی بات تو کی مگر طریقہ کار پر کبھی بات نہیں کی۔ طریقہ کار سے ذاتی طور پر آگاہی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ روشناسی کا معاملہ ہے۔

☆☆☆

مسیح نے کہا

''تم اپنے بھائی کی آنکھ میں تنکا تو دیکھ لیتے ہو مگر تمہیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا''

''تم اپنی آنکھ سے شہتیر نکال کر ہی اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا نکالنے کے لیے واضح طور سے دیکھ سکتے ہو''

دوسرا باب

میری بیوی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟

اپنی ذات کا علم سب سے مشکل ہوتا ہے کیونکہ آپ اپنے بارے میں جاننے سے خوف کھاتے ہیں۔ اس حوالے سے انسان میں ایک گہرا خوف پایا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ سے فرار حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اگر یہ خوف موجود ہے تو پھر آپ جو چاہیں کر لیں اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ ہوسکتا ہے آپ اپنے بارے میں جاننا چاہتے ہوں تاہم اگر یہ غیر شعوری خوف موجود ہو تو پھر آپ اس آگہی سے شعوری طور پر اجتناب برتیں گے۔ آپ شعوری طور پر چھپنے اور دھوکہ کھانے کی کوشش کریں گے۔ ایک جانب تو آپ اپنی ذات کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے جبکہ دوسری جانب اس آگاہی سے بچنے کیلئے ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کریں گے۔

شعوری طور پر آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ''میں اپنے بارے میں جاننا پسند کروں گا'' مگر آپ کا لاشعور (جو کہ شعور سے کہیں زیادہ بڑا اور قوی ہوتا ہے) آپ کو اس علم کے حصول سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔ آپ کیوں خوفزدہ ہیں؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اگر آپ واقعی اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنا چاہتے ہیں تو اس دنیا کے سامنے آپ کی موجودہ شخصیت جھوٹی ثابت ہو جائے گی۔ آپ کا تمام تر ماضی بے معنی ہو کر رہ جائے گا کیونکہ ذات کی پہچان کے بعد اس کی حیثیت خواب سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دوسری جانب آپ نے ماضی میں بے حد سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ آپ اس میں زندہ رہے، اب جبکہ آپ کو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ تو جھوٹ تھا تو ایسے میں خود کو زخمی محسوس کرنا فطری امر ہوگا۔ چنانچہ آپ کو اپنی تمام تر زندگی برباد شدہ محسوس ہوگی۔

اگر آپ کی زندگی جعلی انداز میں بسر ہوتی رہی ہے اور اگر آپ حقیقی کے بجائے بناوٹی پیار

کرتے یا کرواتے رہے ہیں تو پھر آپ اپنا سامنا کیسے کر سکتے ہیں؟ اس صورت میں آپ پر یہ بات آشکار ہوگی کہ آپ کا سب کچھ بناوٹی تھا۔ آپ نے نہ صرف بناوٹی پیار کیا بلکہ یہ بھی ظاہر کیا کہ آپ اپنے پیار سے خوش ہیں۔ آپ نے کسی اور کو نہیں بلکہ اپنی ہی ذات کو دھوکہ دیا ہے چنانچہ اب اگر آپ اپنے ماضی اور اپنے باطن میں جھانکنا چاہیں تو خوف آپ کو گرفت میں لے لیتا ہے۔

آپ یہ سوچتے چلے آئے ہیں کہ آپ منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ ہر شخص ایسا ہی سوچتا ہے۔ خود کو معمولی اور چنیدہ انسان سمجھنا اس دنیا کی عام ترین بات ہے۔ تاہم اگر آپ اپنی ذات پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ میں کچھ بھی خاص بات موجود نہیں ہے۔ آپ کی ذات میں ایسا کچھ نہیں جس پر فخر کیا جا سکتا ہو۔ ایسے میں انا کا وجود کیونکر ممکن ہے؟ بالآخر یہ گر جائے گی اور خاک میں مل جائے گی۔

خوف موجود ہے۔ اپنے آپ کو مت دیکھیں۔ جب آپ اپنی ذات کا بغور مشاہدہ نہیں کرتے تو پھر اپنے متعلق خواب تخلیق کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی خود ساختہ شبیہوں کو ذہن میں بٹھا لیتے ہیں جبکہ حقیقت میں اہم ہونا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ سستی شے کو ترجیح دیتا ہے اور آپ سستے کا انتخاب کر چکے ہیں۔ اب اسے دیکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

رات کے پچھلے پہر ایک گھر میں فون کی گھنٹی بجی۔ گھر کا مالک جاگ اٹھا اور ریسیور اٹھا کر غصے میں بولا ''کیا چاہتے ہو؟'' دوسری جانب سے جواب دیا گیا ''کچھ بھی نہیں'' یہ سن کر وہ مزید غصے میں آ گیا اور کہنے لگا ''تو پھر تم نے مجھے آدھی رات کو فون کیوں کیا؟'' جواب ملا ''اس لیے کہ رات کو فون کال کا ریٹ سستا ہوتا ہے''

اگر قیمت کم ہو تو آپ ''کچھ نہیں'' بھی خرید سکتے ہیں۔ درحقیقت آپ نے یہی کچھ کیا ہے۔ آپ نے اپنے منفرد ہونے کی سستی شبیہ تخلیق کی ہے تاہم منفرد ہونا بے حد مشقت طلب ہے۔ منفرد ہونے کے عمل میں کوشش، محنت اور جدوجہد سے عبارت متعدد زندگیاں صرف ہوتی ہیں۔ تاہم خود کو منفرد سمجھ لینا نہایت سستی بات ہے، آپ بالکل ابھی خود کو منفرد سمجھ سکتے ہیں اور ایسا کرنے پر کچھ خرچ نہیں آئے گا۔ چونکہ آپ سستی چیزوں پر یقین کر رہے ہیں اس لیے آپ کو خوف کا سامنا ہے۔

آپ خود کو نہیں دیکھ سکتے۔ آپ اپنے بارے میں جو کچھ سوچتے چلے آئے ہیں وہ سب کچھ

آپ کو اپنی ذات میں کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ آپ اپنے بارے میں جو کچھ فرض کرتے ہیں اس سے دوسرے کیسے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ خوبصورت ہیں تو اس خوبصورتی کے محض ایک خیال ہونے کی صورت میں آپ کیلئے آئینہ دیکھنا ممکن نہیں۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ آئینہ دیکھنے کے بجائے آپ تمام آئینے توڑنے کو ترجیح دیں گے۔ جب بھی کوئی بدصورت مرد یا عورت آئینہ دیکھتے ہیں تو ان کے دماغ میں یہی خیال آتا ہے کہ اس آئینے میں کوئی خرابی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بے وقعت دیکھنا بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔

آپ اپنی نگاہوں میں کچھ نہ کچھ ضرور ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے علاوہ ہر شخص یہی سمجھتا ہو کہ آپ کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ پاگل بھی ساری دنیا کو پاگل سمجھتا ہے۔ ساری دنیا اسے پاگل کہتی ہے مگر وہ دنیا والوں کی بات نہیں سنے گا کیونکہ اس کے جواب میں وہ اپنے آپ کو عقلمند ثابت کرنے کیلئے بے شمار دلائل کے انبار لگا دے گا اور کہے گا کہ ''میں پاگل نہیں ہوں''

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ ملا نصر الدین بھاگتا ہوا ایک کھیت میں داخل ہوا اور کسان سے پوچھنے لگا ''کیا تم نے کسی مخبوط الحواس عورت کو یہاں سے گزرتے دیکھا ہے؟''

کسان نے پوچھا ''اس عورت کا حلیہ کیسا تھا؟''

نصر الدین نے جواب دیا ''وہ چھ فٹ اچار انچ لمبی اور بے حد موٹی تھی، اس کا وزن تقریباً پینتالیس پاؤنڈ ہوگا''

کسان قدرے حیران ہوا اور کہنے لگا ''اگر وہ چھ فٹ چار انچ لمبی اور بے حد موٹی ہو تو اس کا وزن محض پینتالیس پاؤنڈ کیونکر ہو سکتا ہے؟''

نصر الدین ہنسا اور بولا ''احمق مت بنو، کیا میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ قدرے پاگل ہے''

ہمیشہ دوسرے لوگ ہی غلط اور پاگل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی نام نہاد ہوشمندی کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ حفاظت ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا وہ بنیادی طور پر اس لیے خود کو نہیں دیکھ سکتا کہ اسے نہ صرف اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے بلکہ وہ دیکھنے سے بھی خوف کھاتا ہے۔ جب آپ دوسروں کو دیکھتے ہیں تو وہ آئینے بن سکتے ہیں۔ جب آپ دوسروں میں دیکھتے ہیں تو وہ آپ کی ذات میں کسی شے کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ چونکہ آپ دوسروں کی نگاہوں میں منعکس ہوتے ہیں اس لیے دوسروں کو نہیں دیکھ سکتے۔ آپ اپنے بارے میں افسانے تخلیق کرتے ہیں اور

بھ دوسروں کے بارے میں بھی ایسے ہی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔اس کے بعد آپ خوابوں کی دنیا میں رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ہر شخص اسی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔آپ پوچھتے ہیں کہ خوشی کا حصول کیونکر ممکن ہے؟ آپ کا ڈراؤنا خواب فطری ہے۔آپ نے جو کچھ کیا ہے اس پر ڈراؤنا خواب ہی آ سکتا ہے۔آپ پوچھتے ہیں کہ ''سکون کیسے مل سکتا ہے؟'' افسانوی زندگی سکون بخش نہیں ہو سکتی۔صرف حقیقت ہی سکون بخش ہوتی ہے۔حقیقت کو قبول کرنا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو بالآخر حقیقت ہی سکون مہیا کرتی ہے۔صرف حقیقت ہی آپ کو سچائی کی جانب لے جا سکتی ہے۔ اگر آپ حقیقت سے انکار کرتے ہیں تو پھر آپ کیلئے کوئی سچائی نہیں ہو گی، ایسے میں آپ مسلسل دائرے میں گھومتے رہیں گے اور کبھی مرکز کو نہیں چھو پائیں گے۔

کہتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر اپنی مریضہ کو دیکھنے آیا جو بے حد بیمار تھی۔وہ کمرے میں داخل ہوا اور پانچ منٹ کے بعد باہر آ گیا۔کمرے سے باہر مریضہ کا شوہر بھی موجود تھا۔ڈاکٹر نے اس سے کہا ''مجھے ایک پیچ کس لا دو'' شوہر قدرے پریشان ہوا اور سوچنے لگا کہ ڈاکٹر کو پیچ کس کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔تاہم اس نے کوئی سوال کرنے کے بجائے ڈاکٹر کو پیچ کس لا دیا۔پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر دوبارہ باہر آیا۔اب کے وہ پسینے میں تر بتر تھا۔اس نے مریضہ کے شوہر سے کہا ''مجھے بڑا پیچ کس چاہئے'' شوہر کو مزید حیرانی ہوئی تاہم وہ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ ڈاکٹر اپنا کام بہتر طور سے سمجھ سکتا ہے۔پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر ایک مرتبہ پھر کمرے سے باہر آیا اور بولا ''مجھے چھینی اور ہتھوڑا چاہئے'' اب شوہر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ سراسیمہ ہو کر بولا ''میری بیوی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟'' ڈاکٹر نے جواب دیا ''فی الوقت میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ میں تاحال اپنا بیگ کھولنے میں کامیاب نہیں ہو پایا''

میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ تاحال بیگ کھولنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔یہی نہیں بلکہ آپ اس بیگ کو کھولنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔آپ اسے کھولنا ہی نہیں چاہتے۔یہ تمام پیچ کس، چھینی اور ہتھوڑے بے کار ہیں۔آپ بیگ نہیں کھولنا چاہتے کیونکہ جب بیگ کھل گیا تو آپ کیا کریں گے؟ ایسے میں آپ کے مرض کی تشخیص ہو جائے گی اور آپ کو اپنے اندر دیکھنا پڑے گا۔

چنانچہ ہر شخص بیگ پر قابض ہے۔یہ بیگ آپ کا کاروبار اور پیشہ ہے۔آپ شاعر، مصور یا موسیقار بھی ہو سکتے ہیں۔آپ کے تمام پیشے محض ظاہر سے وابستہ رہنے کے ذرائع ہیں۔یہی وجہ

ہے کہ کوئی شخص اکیلا ہونے کو تیار نہیں۔حتیٰ کہ کوئی ایک لمحے کیلئے بھی اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔یہ خوفناک بات ہے کیونکہ اکیلے ہونے کی صورت میں آپ کو اپنی ذات کے مشاہدے کا موقع مل سکتا ہے۔اگر آپ اکیلے ہوں تو کیا کریں گے؟ جب آپ اکیلے ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ ہوتے ہیں، ایسے میں حقیقت کا آتش فشاں پھٹ سکتا ہے۔

چنانچہ ہر شخص چوبیس گھنٹے مشغول رہنے کی کوشش کرتا ہے۔جب آپ مصروف ہوتے ہیں تو قدرے خوش نظر آتے ہیں۔اسی طرح جب آپ مصروف نہیں ہوتے تو ناخوش دکھائی دیتے ہیں۔ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو طویل عرصہ کیلئے بیکار چھوڑ دیا جائے تو وہ دیوانہ ہو جائے گا۔مگر کیوں؟ اگر آپ طویل عرصہ تک بیکار رہیں تو ہوشمند سے پاگل کیوں ہو جائیں گے؟ اگر آپ ہوشمند ہیں تو بیکاری کے طویل دور میں آپ کو مزید ہوشمند ہو جانا چاہئے۔یہی نہیں بلکہ آپ کی جسمانی و ذہنی بالیدگی پہلے سے کہیں بڑھ جائے گی۔تاہم یہ بات ناقابل فہم ہے کہ طویل عرصہ تک اکیلا چھوڑ دیے جانے کی صورت میں آپ کو دیوانہ کیوں ہو جانا چاہئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں آپ پاگل ہیں اور آپ کا پیشہ اس پاگل پن کو چھپائے رکھتا ہے۔

ادھر ادھر دیکھیں، چونکہ اپنے آپ پر دیکھنا مشکل ہے اس لیے ارد گرد دیکھیں، لوگوں کو دیکھیں۔ایک شخص مسلسل رقم کے لین دین میں مشغول ہے۔حقیقت میں وہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے اپنا ذہن رقم پر مرکوز کر رکھا ہے تاکہ اپنے آپ کا سامنا کرنے سے بچ سکے۔وہ رقم کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے تاکہ اپنے بارے میں نہ سوچ سکے۔وہ صبح، شام اور رات بھر رقم کے بارے میں غور و فکر کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ وہ بستر پر بھی روپے پیسے اور بینک بیلنس کے حوالے سے سوچ بچار میں مصروف رہتا ہے۔وہ روپے کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ روپے حاصل کرتا ہے تو نقصان میں رہتا ہے؟ اب کیا کیا جائے؟ چنانچہ روپیہ وصول ہونے کے لمحے وہ سوچ بچار میں مصروف تھا۔روپیہ ملنے کے بعد وہ مزید سوچ بچار شروع کر دیتا ہے کہ مزید رقم کیونکر حاصل کی جائے۔وہ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ دراصل اسے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی۔بصورت دیگر رقم ملنے کے بعد اسے مطمئن ہو جانا چاہئے، حقیقت تو یہ ہے کہ روپیہ راک فیلر اور فورڈ ایسے کھرب پتیوں کو بھی مطمئن اور مکمل نہیں کر سکا۔

آپ کو روپیہ ملتا ہے اور آپ فوراً مزید روپے کا تقاضا کرنے لگتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ

بنیادی محرک روپے کے بجائے مصروف رہنا ہے۔ کسی کام یا مصروفیت کے بغیر آپ بے چینی محسوس کرتے ہیں اور غیر مطمئن رہتے ہیں۔ کیا ہونا چاہئے؟ اگر کرنے کیلئے کچھ نہ ہوتو آپ ایک ہی اخبار بار بار پڑھیں گے۔ یہ وہی اخبار ہوگا جسے آپ پورا پڑھ چکے ہیں۔ اگر کرنے کو کچھ نہ ہوتو آپ کوئی ایسا کام بھی کرنے لگیں گے جس کی آپ کو ضرورت ہی نہیں ہوتی تاہم آپ کیلئے فارغ بیٹھنا ممکن نہیں ہے۔ تمام اہل دانش یہی کہتے ہیں کہ اگر آپ چند گھنٹے کوئی کام کیے بغیر بیٹھ سکتے ہیں تو بہت جلد آگاہی پالیں گے۔

ذہن کی خالی حالت ''دھیان'' کا نام ہے۔ مصروف ذہن دنیادی ہوتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا ذہن کس حوالے سے مصروف ہے۔ آپ روپے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا سیاست میں، سماجی خدمات میں مصروف ہیں یا انقلاب لانا چاہتے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی ہوشمندی ایک جیسی ہے۔ اگر آپ لینن کو اکیلا چھوڑ دیں تو وہ بھی پاگل ہوجائے گا۔ اسے سماج اور انقلاب کی ضرورت ہے، اگر کرنے کو کچھ نہ ہوتو اس کیلئے زندہ رہنا بھی مشکل ہوجائے گا اور اس کی ہوشمندی جاتی رہے گی۔ وہ آپ کے ذریعے عقلمند بنا ہے۔ چونکہ بے تحاشہ کام کے باعث توانائی خرچ ہوئی ہے لہٰذا آپ تھک گئے ہیں اور سو سکتے ہیں۔

بوڑھے عموماً پاگل اور سنکی نظر آتے ہیں جبکہ اس کی وجہ کوئی نہیں ہوتی۔ بڑھاپا کوئی وجہ نہیں، بات یہ ہے کہ اب وہ مصروف نہیں رہے، اب ان کی ضرورت نہیں رہی، وہ ریٹائر ہوچکے ہیں۔ ریٹائر لوگ ہمیشہ قدرے سنکی ہوجاتے ہیں۔ انسان ہر لحاظ سے ٹھیک ہوتا ہے، وہ صدر یا وزیراعظم بھی رہ چکا ہوتو ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی حالت ابتر ہوجائے گی۔ اس کا جسم اور ذہن دونوں زوال کا شکار ہوجائیں گے اور وہ قدرے سنکی، دیوانہ اور پاگل بننا شروع ہوجائے گا۔ ایسا اس لیے ہوگا کہ اب اس کیلئے کوئی مصروفیت باقی نہیں بچی، کوئی شخص اس کی طرف نہیں دیکھتا اور کوئی اس میں دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کیلئے کرنے کو کوئی کام نہیں بچا اور اب اس کا ذہن کسی شے پر مرتکز نہیں ہے۔ یہ تمام افراتفری جاری رہتی ہے اور وہ خود ہنگامہ بن جاتا ہے۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ریٹائر لوگ دس برس پہلے مرجاتے ہیں اور اگر انہیں مصروف رکھا جائے تو وہ اپنی عمر سے دس برس زائد بھی جی سکتے ہیں۔ ہوتا کیا ہے؟ اپنے ساتھ رہنا اس قدر مشکل کیوں ہوتا ہے؟ آپ ہمیشہ یہی سوچتے ہیں کہ دوسروں کو آپ کے ساتھ خوش رہنا چاہئے۔

آپ کی بیوی کو آپ کے ساتھ خوش رہنا چاہئے۔ آپ کے شوہر کو آپ کے ساتھ خوش رہنا چاہئے۔ دوسری جانب آپ خود اپنے ساتھ کبھی خوش نہیں رہتے۔ اگر ایسا ہے تو پھر کوئی دوسرا آپ کی موجودگی میں کیونکر خوشی محسوس کرے گا؟ اگر آپ اس قدر بیزار کردینے والی شخصیت کے مالک ہیں کہ خود آپ کیلئے بھی اپنے ساتھ رہنا ممکن نہیں تو پھر دوسرے آپ پر رحم کیوں کھائیں؟ وہ آپ کو اس لیے برداشت نہیں کرتے کہ آپ پیار کے قابل ہیں بلکہ وہ آپ کو بعض دوسری وجوہات کی بنا پر برداشت کرتے ہیں۔ وہ آپ کو اس لیے برداشت کرتے ہیں کہ آپ انہیں مصروفیت مہیا کرتے ہیں۔ بیوی کیلئے شوہر کافی مصروفیت ہوتی ہے اور شوہر کیلئے بیوی خاطر خواہ مشغولیت ہے۔ یہ باہمی دھوکہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کو فریب دینے اور مصروف رکھنے پر متفق ہوگئے ہیں۔

آپ خود کو نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کو اپنی ذات کا احساس نہیں ہوسکتا کہ یہ بہت دور از کار مقصد ہے۔ آپ منہ موڑ کر اپنی حقیقت کا سامنا نہیں کرسکتے اور اس کی وجہ یہ جھوٹی شبیہ، جھوٹی شناخت اور جھوٹا خیال ہے کہ آپ بے حد اہم ہیں اور آپ کی موت کی صورت میں ساری دنیا ٹھہر جائے گی۔ جب آپ نہیں ہوں گے تو دنیا کے ساتھ کیا پیش آئے گا؟ جب آپ دنیا میں نہیں تھے تو کیا تھا؟ محض یہی کہ دنیا قدرے مزید پرامن تھی، بس۔ جب آپ دنیا میں نہیں ہوں گے تو اس کے مسائل میں بھی رتی بھر کمی آجائے گی کیونکہ ایسے میں دنیا سے ایک بے چین شخص کا خاتمہ ہوجائے گا جو کہ دوسروں میں بے چینی پیدا کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ تاہم انا کو تقویت دینے کیلئے یہ تمام تر افسانے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

نپولین زندگی کے آخری ایام میں قیدی بنا لیا گیا۔ اسے سینٹ ہیلینا نامی چھوٹے سے جزیرے پر رکھا گیا تھا۔ اب وہ کچھ نہیں تھا۔ وہ شہنشاہ رہ چکا تھا اور یہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کے عظیم ترین شہنشاہوں میں سے ایک تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس حقیقت کو ذہن میں کیسے جگہ دی جائے کہ اب میں کچھ بھی نہیں ہوں اور میری حیثیت عام قیدی سے زیادہ نہیں؟ تاہم وہ حقیقت کی طرف نہیں دیکھے گا بلکہ پرانے افسانے میں ہی زندہ رہے گا۔ اس نے چھ سال تک اپنا لباس تبدیل نہ کیا کیونکہ جیل میں اسے اس کے سابقہ مرتبے کے شایان شان لباس نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ نپولین کا شاہی لبادہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا، اس کا رنگ اڑ گیا اور وہ میلا ہوگیا، تاہم اس نے لباس تبدیل نہ کیا۔ ایک دن جیل کے ڈاکٹر نے نپولین سے کہا ''ہم آپ کو بہتر اور صاف لباس مہیا

کر دیتے ہیں، آپ اس لبادے کو تبدیل کیوں نہیں کر لیتے ؟ یہ بیحد گندا ہو چکا ہے'' نپولین نے اس کی جانب دیکھا اور بولا '' یہ شہنشاہ کا لباس ہے، ہوسکتا ہے یہ میلا ہو مگر میں اسے کسی عام لبادے سے تبدیل نہیں کر سکتا'' وہ اس طرح چلتا تھا جیسے اب بھی شہنشاہ ہو اور یوں گفتگو کرتا تھا جیسے تا حال فرانس کے تخت و تاج کا مالک ہو۔ جیل خانے میں اس نے احکامات دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا حالانکہ وہاں اس کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے خط لکھے اور احکامات جاری کیے، وہ اپنا لیٹر پیڈ بھی ساتھ لایا تھا، اپنے تئیں وہ اب بھی حکمران تھا۔

اس بیچارے کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ مصروفیت نہ ہونے کے باعث وہ بیمار رہنے لگا۔ اس کی دیکھ بھال پر مامور ڈاکٹر نے ایک روز نامچہ لکھا جس میں وہ کہتا ہے '' میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ واقعتاً بیمار نہیں ہے۔ اب بیماری محض مصروفیت ہے۔ بعض اوقات وہ کہتا ہے '' ہائے میرا پیٹ'' بعض اوقات وہ سر اور ٹانگ میں تکلیف کی شکایت شروع کر دیتا ہے'' ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اسے کچھ نہیں ہوا اور اس کا جسم ہر لحاظ سے تندرست ہے۔ تاہم اب نپولین کیلئے مصروفیت باقی نہیں رہی۔ اب اس کے پاس ''دوسری'' شے صرف اس کا اپنا جسم ہے جسے وہ کسی نہ کسی طرح مصروف رہنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ تمام دوسری دنیا غائب ہو چکی ہے، اب وہ اکیلا ہے۔ چونکہ اپنے جسم کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں بچا اس لیے وہ اسی میں مصروف رہتا ہے۔

دنیا میں بہت سے لوگ مشغولیت کے طور پر بیمار پڑتے ہیں۔ دنیا میں پچاس فیصد بیماریاں بطور مصروفیت وجود رکھتی ہیں۔ آپ مصروف رہتے ہیں اور آپ کو اپنا سامنا نہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر نپولین قید خانے میں اپنی حقیقت پر غور کر لیتا تو کیا ہوتا؟ ایسے میں وہ خود کو بھکاری محسوس کرتا اور یہ اس کیلئے بہت بری بات تھی۔ وہ بادشاہ کی حیثیت سے مرا۔ مرنے سے پہلے اس نے ہدایات جاری کیں کہ اسے آخری سلامی کس انداز میں دی جانی چاہئے۔ یہ تفصیلات سننے کیلئے کوئی موجود نہیں تھا مگر اس نے خود ہی احکامات جاری کیے، یقیناً وہ یہ سوچ کر پرسکون انداز میں مرا ہوگا کہ اسے شہنشاہ کے شایان شان انداز میں آخری سلامی دی جائے گی۔

نپولین کے حوالے سے یہ بات بالکل واضح ہے کیونکہ وہ شہنشاہ رہ چکا تھا۔ یہ بھی افسانہ ہے جسے سماج کی تائید حاصل تھی۔ اب بھی کچھ نہیں بدلا، وہی نپولین ہے البتہ تائید غائب ہو چکی ہے۔ اسے سمجھنا آسان نہیں۔ جب سماج آپ کی حمایت کرتا ہے تو افسانے ہوتے ہیں اور جب سماج

آپ کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے تو بھی یہی صورتحال ہوتی ہے۔ ہوشمند اور دیوانے کے درمیان یہی فرق ہوتا ہے۔ ہوشمند وہ ہوتا ہے جس کے افسانے کو سماج کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنے افسانے کی حمایت کیلئے سماج کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتا ہے۔ دوسری جانب پاگل کے افسانے کی کوئی حمایت نہیں کرتا۔ وہ اکیلا ہے لہٰذا آپ کو اسے پاگل خانے میں بند کرنا ہے۔

تاہم آپ کی حمایت کسی شے کو حقیقت میں نہیں بدل سکتی۔ اگر یہ افسانہ ہے تو پھر افسانہ ہی رہے گا۔ اگر آپ اپنی ذات پر غور کریں تو فوراً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کچھ بھی نہیں ہیں اور کوئی بھی شے اہم نہیں ہے۔ تب آپ کے قدموں تلے زمین سرک جائے گی اور آپ اتھاہ گہرائیوں میں جا گریں گے۔ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو نہ دیکھا جائے اور خوابوں کی دنیا میں ہی زندگی بسر کی جائے۔ اگرچہ یہ خواب ہیں مگر یہ آپ کو ہوشمند انداز میں زندگی بسر کرنے میں آپ کی مدد کرتے ہیں۔

آپ نہ صرف اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ دوسرے کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ دوسرا بھی آپ کی طرح ایک نمائندہ ہے۔ لہٰذا آپ دوسروں کے حوالے سے بھی افسانے تخلیق کرتے ہیں۔ نفرت کے ذریعے آپ یہ افسانہ تخلیق کرتے ہیں کہ دوسرا شیطان ہے، پیار کے ذریعے آپ یہ افسانہ گھڑتے ہیں کہ دوسرا فرشتہ یا خدا ہے۔ آپ دوسروں کے بارے میں افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔ آپ اسے براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کا ادراک فوری نہیں ہوتا۔ آپ خود ساختہ فریب میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ مبالغہ آمیز ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کسی سے نفرت ہے تو وہ فوراً شیطان بن جاتا ہے۔ اگر آپ کو کسی سے پیار ہے تو وہ آپ کی نظروں میں خدا کا رتبہ پا لیتا ہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں، اگر آپ کو برا دکھائی دیتا ہے تو آپ مبالغہ کرتے ہوئے اسے حتمی برائی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ اچھائی دیکھتے ہیں تو اسے حتمی اچھائی میں بدل ڈالتے ہیں اور اسے خدا بنا دیتے ہیں۔

تاہم ان افسانوں کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا آپ انہیں بار بار تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے اندازوں میں اس قدر مبالغہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ ہر شے اور ہر معاملے کو اس طرح کیوں نہیں دیکھتے جس طرح وہ ہوتا ہے؟ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ آپ واضح طور سے دیکھنے سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ آپ مبہم دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہر شے دھند میں لپٹی رہتی ہے۔ آپ

اپنے آپ کو نہیں دیکھنا چاہتے اور جو لوگ آگاہ ہو چکے ہیں ان کا اصرار ہے کہ "اپنے آپ کو دیکھو" بدھا، مسیحؑ اور سقراط یہی تلقین کرتے رہے کہ "اپنے آپ کو دیکھو" مذہب کی تمام تر ہدایت یہی ہے کہ "اپنے آپ کو دیکھو"۔ آپ نہ دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات آپ اپنی ذات کے مشاہدے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ میں نے متعدد مرتبہ ایسے لوگ دیکھے ہیں جو خود کو دیکھنے کا کھیل کھیل رہے ہیں مگر وہ خود کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ ایک کھیل ہے۔ اب وہ نئے افسانے تراشنا چاہتے ہیں۔ یہ مذہبی افسانہ ہوگا اور وہ میرے پاس آئیں گے تاکہ میں ان کی حمایت کروں۔ وہ کہتے ہیں "مجھے یہ حاصل ہو چکا ہے اور مجھے وہ حاصل ہو چکا ہے" وہ مجھے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھیں بھیک مانگ رہی ہوتی ہیں۔

اگر میں کہوں کہ "ہاں آپ کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے" تو ان کو حمایت مل جائے گی اور وہ خوشی خوشی واپس جائیں گے۔ اگر میں کہوں "نہیں" تو وہ ناخوش ہو جائیں گے اور دوبارہ کبھی میرے پاس نہیں آئیں گے۔ وہ اس لیے غائب ہو جائیں گے کہ انہیں کسی اور کو تلاش کرنا ہے۔ آپ کو کسی مقتدر کی تلاش کیوں ہے؟ آپ کو گواہ کیوں درکار ہے؟ اگر آپ کچھ پا چکے ہیں تو پا چکے ہیں، آپ کو کسی بااختیار ہستی کی کیا ضرورت ہے؟ تجربہ بذات خود ایک گواہ ہی ہے لہٰذا کسی اور کی کوئی ضرورت نہیں۔

اگر آپ کو اپنی روح کا احساس ہو گیا ہے تو پھر آپ کو کسی کی جانب سے سراہے جانے یا سند لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں تک کہ ساری دنیا یہ کہے کہ "آپ کو احساس نہیں ہوا" تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ووٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کیا ہو چکا ہے۔ اگر اندھے کی بینائی لوٹ آئے تو اسے اپنے بینا ہونے کے حق میں کسی گواہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہ خود دیکھ سکتا ہے۔ تاہم اگر اندھا یہ خواب دیکھ رہا ہے کہ وہ بینا ہو گیا ہے تو پھر اسے کسی مقتدرہ کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ اپنے دعوے کے حق میں گواہی پیش کر سکے۔

لوگ کھیل کھیلتے ہیں، حتیٰ کہ روحانی کھیل بھی کھیلے جاتے ہیں۔ جب تک آپ کھیلنا بند نہیں کرتے اور اس حقیقت کو قبول نہیں کرتے کہ افسانے چھوڑ کر ترش حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے، اس وقت تک کچھ بھی ہونا ممکن نہیں کیونکہ یہی دروازہ ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کی حمایت نہیں کرتا تو پھر آپ خود اپنی حمایت کرتے ہیں۔ تب آپ لوگوں سے بات کرنا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ آپ کو سمجھ

نہیں پاتے۔

چند ماہ قبل ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا "آپ مجھے سمجھ سکتے ہیں، کوئی شخص مجھے نہیں سمجھ پایا کیونکہ مجھے ہر شب خدا کی جانب سے پیغامات موصول ہوتے ہیں" اس کے پاس ایک بھاری بھرکم فائل بھی تھی۔ یہ مطلق بیہودہ بات تھی، مگر وہ سوچتا ہے کہ اسے خدا کی جانب سے پیغامات موصول ہو رہے ہیں اور اس کے خیال میں یہ تازہ ترین قرآن ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس بات کا علم ہو جائے تو وہ اسے ہلاک کر دیں گے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق قرآن خدا کی آخری کتاب ہے اور نیا قرآن بنانے کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا اور واجب القتل ہے۔ بہرحال خدا سے پیغامات وصول کرنے کا دعویٰ کرنے والا یہ شخص بیحد گھبرایا ہوا تھا اور مسلسل کانپ رہا تھا۔ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے اس بات کا منتظر تھا کہ میں اسے جواباً کیا کہتا ہوں۔ ایسا اس لیے تھا کہ مجھ سے پہلے اس نے جس شخص کو بھی یہ بات بتائی وہ جواباً اس پر ہنسا اور اسے مجنون کا خطاب دیا۔

تاہم وہ شخص مجھ سے کہنے لگا "میں جانتا ہوں کہ آپ پہنچے ہوئے ہیں اور ہر بات جانتے ہیں" یہ کہہ کر گویا وہ مجھے رشوت دے رہا تھا، وہ مسلسل بھیک مانگے جاتا تھا اور کہتا تھا کہ بس اتنا کہہ دیجیے کہ "ہاں، یہ درست ہے"

میں نے اسے کہا "اگر خدا تمہیں پیغامات بھیج رہا ہے تو تمہیں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے، تمہارے لیے خدا ہی کافی ہے"

یہ سن کر وہ شبے میں مبتلا ہو گیا اور کہنے لگا "مگر کون جان پائے گا؟ ہو سکتا ہے یہ میرے ذہن کا کوئی کھیل ہو" اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص سب کچھ اچھی طرح جانتا ہے۔ آپ جب بھی کوئی چال چلتے ہیں تو اندر سے آپ اس سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ کسی کو آپ پر یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں مگر آپ اس حقیقت کو چھپانا چاہتے ہیں۔

میں نے اسے بتایا "یہ پاگل پن ہے" وہ دوبارہ کبھی میرے پاس نہیں آیا، اب میں "پہنچا ہوا" شخص نہیں رہا۔ وہ ایک باہمی شے چاہتا تھا۔ اگر میں کہوں کہ "ہاں تم خدا کی طرف سے پیغامات وصول کر رہے ہو" تو وہ واپس جا کر کہتا "یہ شخص راز پا گیا ہے"

اگر میں آپ کا افسانہ قبول کر لوں تو آپ میرے افسانے کی معاونت کر سکتے ہیں۔ یہی وہ باہمی کھیل ہے جو کھیلا جا رہا ہے۔ یہ کھیل اس قدر باعث اطمینان ہے کہ آپ اسے روکنا نہیں

چاہتے۔ تاہم ایک گہرا عدم اطمینان بھی سائے کی طرح پیچھا کرتا ہے۔ ایسا ہونا ہی ہے کیونکہ سارا معاملہ ہی افسانوی ہے۔ خود کو شہنشاہ سمجھنے والا بھکاری اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ وہ دراصل بھکاری ہے۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ بادشاہ ہے اور خود کو بادشاہ جیسا ہی ظاہر کرتا ہے مگر شعور کی گہرائیوں میں اسے علم ہے کہ وہ محض ایک بھکاری ہے۔ وہ خود کو شہنشاہ سمجھ کر بے حد خوش ہوتا ہے مگر بھکاری ہونے کا احساس سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ اپنے بارے میں کچھ سوچتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ سچ نہیں ہے۔

آپ سے کبھی پیار نہیں کیا گیا، آپ چاہے جانے کی اداکاری کرتے ہیں۔ آپ کبھی دیانت دار نہیں رہے۔ آپ بناوٹی دیانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی سچ نہیں بولا، آپ سچائی کا سوانگ رچاتے ہیں۔ آپ کی تمام تر زندگی بناوٹ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اب جبکہ آپ اپنی بیشتر زندگی اس میں ضائع کر چکے ہیں۔ یہ سوچنا بیحد تکلیف دہ ہے کہ یہ سب کچھ محض ایک افسانہ تھا۔ اب آپ یہ سوچتے ہیں کہ ''کسی نہ کسی طرح اسے آخر تک لے جانا چاہئے'' تاہم اگر آپ اسے ختم نہیں کرتے تو یہ آپ کو کچھ نہیں دے گا۔ یہ محض ضیاع ہے۔ یہ محض بیکار شے ہے اور آخر میں آپ مایوس ہو کر پھٹ پڑیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ موت بے حد مشکل بن گئی ہے۔ موت میں کوئی خطرناک بات نہیں ہوتی۔ یہ اس دنیا کے بہترین مظاہر میں سے ایک ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ نیند کی حالت میں چلے جاتے ہیں اور ہر شے سو جاتی ہے۔ بیج پھوٹتا ہے اور درخت بن جاتا ہے۔ درخت پر دوبارہ بیج لگتے ہیں جو زمین پر گرتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر درخت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہر سرگرمی کے بعد آرام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ زندگی سرگرمی کا نام ہے جبکہ موت آرام کی حالت ہے۔ موت سے ہی نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ موت میں کچھ خرابی نہیں اور اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہئے۔

ہر شخص مرنے سے خوفزدہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے وقت آپ کے تمام افسانے ختم ہو جائیں گے۔ موت کے وقت آپ کو اپنی تمام زندگی تضیع دکھائی دے گی۔ ایسا کیوں کہا جاتا ہے کہ ''بوقت مرگ انسان کی ساری زندگی اس کی نظروں میں گھوم جاتی ہے؟ ایسا ہوتا ہے، یہ درست ہے۔ موت کے وقت انسان کو اپنی تمام تر گزشتہ زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ

اب اس کے پاس کوئی مستقبل نہیں ہوتا اور وہ مزید افسانے تخلیق نہیں کر سکتا۔

افسانوں کیلئے مستقبل درکار ہوتا ہے کیونکہ افسانے امید پر تخلیق کیے جاتے ہیں اور یہ کل کے لیے ہوتے ہیں۔ موت اس حقیقت کو ہمارے سامنے لے آتی ہے کہ آگے کسی کل کا کوئی وجود نہیں۔ کل ختم ہوگئی ہے اور مزید کوئی مستقبل نہیں بچا۔ آپ کہاں خواب دیکھ سکتے ہیں؟ اب آپ اپنے افسانوں کی منصوبہ بندی کہاں کر سکتے ہیں؟ اب آپ اور آپ کی زندگی پھنس گئی ہے۔ آپ جہاں جا پھنسے ہیں وہاں کوئی مستقبل نہیں، اب آپ کہاں دیکھیں گے؟ آپ کو ماضی میں دیکھنا ہے اور موت کے وقت سماج غائب ہو رہا ہے۔ آپ کو اپنی ذات میں دیکھنا ہوگا، وہاں اب کچھ نہیں بچا۔ تب آپ کو تمام زندگی کی تضیع کی تکلیف اور اذیت کا احساس ہوگا۔

اگر آپ کو موت سے پہلے یہ تجربہ ہو جائے تو آپ مذہبی آدمی بن سکتے ہیں۔ مذہبی آدمی وہ ہے جو موت سے پہلے ہی وہ سب کچھ سمجھ جاتا ہے جو لوگ موت کے وقت سمجھتے ہیں۔ مذہبی آدمی وہ ہے جو زندہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے، وہ ماضی کو دیکھتا ہے، سارا کھیل دیکھتا ہے اور زندگی کے افسانوی پن کا احساس کر لیتا ہے، وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔

اگر آپ اپنے اندر دیکھیں تو تبدیلی یقینی ہوتی ہے۔ تبدیلی مطلق یقینی ہوتی ہے کیونکہ ایک مرتبہ افسانے کو افسانہ سمجھ لیا جائے تو یہ غائب ہونے لگتا ہے۔ جس لمحے آپ کو احساس ہو جاتا ہے اور آپ کے ذہن میں یہ بات سرایت کرنے لگتی ہے کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے تو افسانہ ختم ہونے لگتا ہے۔ یہ پہلے ہی آپ کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ آپ اسے پکڑ نہیں سکتے۔ خواب کو جاری رکھنے کیلئے آپ کو یہ یقین کرنا ہوگا کہ یہ خواب نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ جس لمحے آپ خواب کو خواب سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اسی لمحے خواب ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

نہ جاننا ہی آپ کی تمام تر کاوش ہے، آپ جاننے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اکیلے ہوتے ہیں تو بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ ہمالیہ پر چلے جائیں تو وہاں بھی اپنا ریڈیو ساتھ لے جاتے ہیں جبکہ ریڈیو ساری دنیا ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر تفریح کیلئے کہیں جائیں تو ذہن میں آپ کی بیوی، بچے اور دوست بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ آپ چھٹیاں منانے گئے ہیں مگر حقیقت میں آپ کہیں نہیں جاتے۔ آپ اپنا گرہستی کا سارا ماحول اپنے ساتھ ساحل سمندر اور پہاڑوں پر لے جاتے ہیں اور تمام

تر بیہودگی ایک مرتبہ پھر آپ کا احاطہ کیے ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ یوں ہوا کہ کسی تباہ شدہ بحری جہاز کا ملاح بے آباد جزیرے پر پہنچ گیا۔ اسے وہاں پانچ سال تک رہنا پڑا کہ اس جگہ سے کسی بحری جہاز کا گزر نہ ہوتا تھا۔ اس نے وہاں رہنے کیلئے چھوٹا سا جھونپڑا بنالیا تاہم وہ تمام وقت دنیا کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا۔ جزیرے پر بیحد سکون تھا اور اس نے کبھی ایسے سکون کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جزیرہ بالکل غیر آباد تھا جہاں کسی انسان کا نام ونشاں تک نہ تھا اور یہی واحد مسئلہ تھا۔ وہاں انسانوں کے علاوہ ہر شے موجود تھی۔

جزیرے پر خوبصورت ندیاں اور پھلوں سے لدے درخت تھے۔ وہ کھا سکتا تھا، پی سکتا تھا اور آرام کر سکتا تھا۔ کوئی پریشانی نہ تھی۔ پریشان کرنے کیلئے وہاں کوئی نہ تھا۔ ماضی میں وہ ایسی ہی جگہ کا تصور کیا کرتا تھا جبکہ اب وہ حقیقت میں ویسی ہی پرسکون جگہ پر موجود تھا۔ تاہم یہ ماحول اس کیلئے ناقابل برداشت ہوگیا، خاموشی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ انسان کو اسے جھیلنے کے قابل ہونا چاہئے وگرنہ یہ آپ کو ہلاک بھی کرسکتی ہے۔

اس شخص کو بیحد مشکل صورتحال کا سامنا تھا۔ وہ معمار بھی تھا چنانچہ اس نے چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانا شروع کر دیں۔ اس نے مصروف رہنے کیلئے چھوٹے چھوٹے نمونے تیار کرنا شروع کردیا۔ اس نے ایک چھوٹی سی گلی بنائی اور اس کا نام بھی رکھ دیا۔ مزید برآں اس نے دو گرجا گھر بھی تعمیر کیے جن میں سے ایک گھر سے قریب اور دوسرا ''قصبے'' کے دوسرے سرے پر واقع تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی دکانیں بنائیں جہاں سے خریداری کی جا سکتی تھی۔ غرضیکہ اس نے پورا قصبہ تعمیر کر ڈالا۔

آخر کار پانچ برس کے بعد جب ایک جہاز آیا اور کنارے پر لنگر انداز ہوا تو اسے بے حد خوشی ہوئی۔ جہاز سے چھوٹی کشتی میں سوار ایک شخص جزیرے پر اترا۔ ہمارا ملاح خوشی کے عالم میں بھاگ کر اپنے جھونپڑے سے باہر نکلا اور ساحل کی جانب لپکا تاکہ دوبارہ اپنی دنیا میں واپس جا سکے۔ تاہم اسے یہ دیکھ کر بیحد حیرانی ہوئی کہ کشتی والا آدمی اخبارات کا بنڈل اٹھائے چلا آرہا تھا۔

ملاح نے اس سے پوچھا ''ان اخبارات کا کیا کام، تم انہیں یہاں کیوں لائے ہو؟''

کشتی والے شخص نے جواب دیا ''پہلے تم اخبار پڑھو اور دیکھو کہ دنیا میں کیا ہوتا رہا ہے، اس کے بعد ہمیں بتانا کہ تم واپس جانا چاہتے ہو یا نہیں''

ملاح نے اخباروں کا بنڈل سمندر میں پھینک دیا اور کہنے لگا ''یہ کیا بیہودگی ہے، تاہم کشتی میں بیٹھنے سے پہلے میں تمہیں اپنا تعمیر کردہ قصبہ دکھانا چاہوں گا''

ملاح نے کشتی والے آدمی کو اپنا قصبہ دکھایا تاہم وہ قصبے کے دوسرے سرے پر واقع گرجا گھر کو دیکھ کر بیحد حیران ہوا اور پوچھا ''میں یہ بات سمجھ سکتا ہوں کہ تم نے عبادت کی غرض سے گرجا گھر تعمیر کیا ہے، مگر دوسرا گرجا گھر بنانے کا کیا مقصد تھا؟''

ملاح نے جواب دیا ''ایک گرجا گھر وہ ہے جہاں میں جاتا ہوں اور دوسرا وہ ہے جہاں میں نہیں جاتا''

آپ کو کم از کم دو گرجا گھروں کی ضرورت ہے کیونکہ ذہن دہرے پن کا شکار ہے۔ یہ وہ گرجا گھر ہے جو مجھے قبول ہے اور ایک گرجا گھر وہ ہے جو مجھے قبول نہیں۔ وہ اچھا گرجا گھر نہیں۔ وہاں برے لوگ جاتے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہمارا ملاح اکیلا ہے مگر اس نے پوری دنیا تخلیق کر رکھی ہے۔ وہ دنیا کی طرف واپس جانے کا متمنی ہے۔ وہ اخبارات دیکھنے کو تیار نہیں۔ اس کا یہ فعل درست تھا کیونکہ اگر آپ اخبارات دیکھ لیں تو پھر واپس جانا پسند نہیں کریں گے۔

اپنے اخبارات کی جانب دیکھیں۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ رہنے کے قابل ہے؟ تاہم آپ صرف پڑھتے ہیں اور دیکھنے کا تکلف گوارا نہیں کرتے۔ آپ کا پڑھنا دیکھنا نہیں کہلا سکتا۔ آپ بند آنکھوں سے پڑھتے ہیں۔ آپ کو احساس ہی نہیں ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ انسان دوسرے انسان سے کیا سلوک کر رہا ہے۔ انسان شعوری طور پر دوسرے انسان کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ اس قدر تشدد، اس قدر حماقت، ہر شے زہر آلود ہوگئی ہے۔ کیا آپ ایسی دنیا میں رہنا چاہیں گے؟ اگر آپ دیکھیں تو یہاں رہنے کا فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہوگا، سو بہتر یہی ہے کہ نہ دیکھا جائے اور تنویمی حالت میں چلتے رہیں۔

اپنے آپ کو مت دیکھیں، اس حوالے سے ایک اور طریقہء کار استعمال ہوتا چلا آرہا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ ''تمام تر خرابی دوسروں میں دیکھیں تاکہ خود کو اچھا سمجھ سکیں'' اچھا ہونے کے دو طریقے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ آپ کو واقعتاً اچھا ہونا چاہئے جو کہ مشکل کام ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو برا ثابت کر دیا جائے۔ آپ کو اچھا ہونے کی ضرورت نہیں، محض یہ ثابت کر

دیں کہ دوسرے برے ہیں۔آپ خود بخود اچھے نظر آنے لگیں گے۔اس سے آپ کو بھی یہ احساس ہوگا کہ آپ اچھے ہیں۔اب تک ہم یہی ثابت کرتے رہے ہیں کہ دوسرے چور، قاتل اور شیطان ہیں۔جب آپ ثابت کرتے ہیں کہ دوسرے تمام لوگ غلط ہیں تو اچانک آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ بہت ہی اچھے ہیں۔گویا اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں،بس یہی ثابت کر دیں کہ دوسرا غلط ہے۔ایسا کرنا بے حد آسان ہے،اس سے آسان کام اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ آپ دوسروں کی برائی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر سکتے ہیں۔آپ کو مبالغہ آرائی سے کوئی نہیں روک سکتا۔چنانچہ اس بڑھا چڑھا کر ظاہر کردہ برائی کے سامنے آپ معصوم دکھائی دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں یہ کہے کہ ''فلاں برا آدمی ہے'' تو آپ کبھی اس سے اختلاف نہیں کرتے۔کبھی نہیں۔آپ بس اس کی بات مان لیتے ہیں۔اس کے بجائے آپ یہ کہتے ہیں کہ ''مجھے ابتدا ہی سے علم تھا کہ وہ ایسا ہی ہے'' تاہم اگر کوئی کسی کے بارے میں اچھا کہے تو آپ اس سے بحث کرنے لگتے ہیں اور اس کے دعوے کے حق میں ثبوت مانگتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ لاکھوں لوگوں کا کہنا ہے کہ ''اگر ہمیں خدا کی موجودگی کے حق میں ثبوت مہیا کیے جائیں تو ہم اس پر یقین کرنے لگیں گے'' تاہم کسی شخص نے تا حال کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جس میں شیطان کی موجودگی کے حوالے سے ثبوت مہیا کیے گئے ہوں۔کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ ''اگر مجھے شیطان کی موجودگی کے حق میں ثبوت پیش کیا جائے تو میں اس پر یقین کرلوں گا'' شیطان تو ہمیشہ سے ہر جگہ موجود ہے،صرف خدا ہی کہیں گم ہوتا ہے۔

اچھے کو ثبوت کی ضرورت کیوں ہوتی ہے اور برے کو ثبوت کے بغیر کیوں قبول کر لیا جاتا ہے؟ ذرا اس رجحان کا مشاہدہ کیجئے۔آپ کو انسانی ذہن کے اسرار اور ایک خوبصورت مظہر کا سامنا ہوگا۔دل کی گہرائیوں سے ہر شخص اچھا بننا چاہتا ہے۔تاہم ایسا ہونا مشکل ہے۔چنانچہ کیا کیا جانا چاہئے؟ یوں کریں کہ دوسروں کو برا ثابت کر دیں۔یعنی کہ آپ مجھ سے زیادہ برے ہیں لہٰذا میں آپ کی نسبت قدرے اچھا ہوں۔

مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''آپ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں تنکا واضح طور سے دکھائی دیتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا'' آپ دوسروں کی برائیاں دیکھتے ہیں۔ہوسکتا ہے اس سے آپ کو یہ گمان ہو کہ آپ اچھے ہیں مگر اس طرح آپ اچھے نہیں ہو جاتے۔اگر آپ یہ سوچ کر دوسروں کو اچھا

بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ برے ہیں تو یہ اور بھی بری بات ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو انہیں آپ نے ہی برا سمجھا ہے اور پھر آپ خود بھی اچھے نہیں ہیں، ایسے میں آپ دوسرے کو اچھا نہیں بنا سکتے۔چنانچہ سماج کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنے والے دراصل فتنہ پرور ہیں۔دوسروں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنے والے لوگ ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔وہ قاتلوں جیسے ہیں مگر ان کی واردات اس قدر لطیف ہوتی ہے کہ آپ کو اس کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔وہ آپ کو براہ راست قتل نہیں کرتے مگر اپاہج کر دیتے ہیں۔وہ آپ کو کاٹ ڈالتے ہیں اور اپنے تئیں ''آپ کے فائدے کیلئے ایسا کرتے ہیں'' چنانچہ آپ ان کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے۔آپ کے خود ساختہ ولی اس تاریکی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو آپ میں پائی ہی نہیں جاتی۔وہ آپ میں ہو ہی نہیں سکتی۔تاہم ان کا خیال ہے کہ تاریکی آپ کی ذات میں موجود ہے۔انہیں آپ میں جہنم دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ اس طرح خود کو جنتی محسوس کر سکتے ہیں۔

ملا نصر الدین نے مرنے کے بعد جنت کے دروازے پر دستک دی۔سینٹ پیٹر نے دروازہ کھولا اور ملا کو دیکھ کر بولا ''آج تو مجھے کسی کا انتظار نہیں کیونکہ میری ریزرویشن لسٹ میں کسی کا نام شامل نہیں ہیں، آج کسی کو جنت میں نہیں آنا،تم کیسے آگئے؟ تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔باآواز بلند اپنا نام بولو اور پورے ہجے ادا کرو تا کہ میں اپنی فہرست کا از سر نو جائزہ لے سکوں''

چنانچہ ملا نصر الدین نے باآواز بلند اپنے نام کے ہجے شروع کر دیے ''م ل ا ، ن ص ر ا ل د ی ن'' سینٹ پیٹر نے اپنی فہرست کا از سر نو جائزہ لیا مگر اسے اس دن کسی کی جنت آمد بارے کوئی ہدایت لکھی نظر نہ آئی۔

وہ ملا کے پاس واپس آیا اور کہنے لگا ''تمہاری آج یہاں آمد متوقع نہ تھی، بلکہ آئندہ دس برس تک تمہاری باری نہیں آسکتی،تمہارا ڈاکٹر کون ہے؟''

ڈاکٹر ہمیں قبل از وقت ہلاک کر سکتے ہیں۔اچھے ڈاکٹر آپ کو وقت سے پہلے موت کے منہ میں دھکیل سکتے ہیں اور اچھے ڈاکٹر ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔مگر آپ سب لوگ اپنے اپنے انداز میں اچھے ڈاکٹر ہیں۔کوئی بڑا ہے اور کوئی چھوٹا۔ہر شخص دوسرے کو تبدیل کرنا چاہتا ہے کیونکہ ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ دوسرا غلط ہے۔ہر شخص دنیا کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔سیاسی اور مذہبی ذہن کے مابین یہی فرق ہوتا ہے۔سیاسی ذہن ہمیشہ دنیا کو تبدیل کرنے کی خواہش رکھتا ہے کیونکہ وہ کبھی

یہ نہیں سوچ سکتا کہ وہ غلط ہے۔ اس کے بجائے وہ پوری دنیا کو غلط سمجھتا ہے۔ اگر وہ غلط ہے تو ایسا اس لیے ہے کہ پوری دنیا غلط ہے اور تمام تر صورتحال ہی خراب ہے۔ اسے خراب ہی ہونا ہے۔ مذہبی آدمی صورتحال کو اس سے بالکل برعکس انداز میں دیکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ''چونکہ میں خود غلط ہوں اس لیے ساری دنیا خراب ہے اور میں نے اپنی برائی کے ذریعے اس کی خرابی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ میری ہی وجہ سے دنیا خراب ہے، جب تک میں خود تبدیل نہیں ہو جاتا اس وقت تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی''

سیاست دان دنیا سے آغاز کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ دنیا بہت بڑی ہے اور یہ بذات خود کوئی مسئلہ نہیں۔ سیاست دان مزید مسائل تخلیق کر دیتے ہیں۔ ان کی دوا کے ذریعے الٹا مزید بیماریاں جنم لیتی ہیں جو اس سے پہلے کرہ ارض پر موجود نہ تھیں۔ سیاست دان کی مساعی مزید مصائب کا باعث بنتی ہیں۔ مذہبی آدمی اپنے آپ کو تبدیل کرتا ہے۔ وہ صرف اپنے آپ کو تبدیل کرتا ہے کہ یہ واحد کام ہی ممکن ہے۔

آپ صرف اپنے آپ کو ہی تبدیل کر سکتے ہیں اور جس لمحے آپ تبدیل ہو جاتے ہیں اسی لمحے دنیا بدلنا شروع ہو جاتی ہے کیونکہ آپ دنیا کا پراثر حصہ ہیں۔ جب آپ آگہی حاصل کر لیتے ہیں تو مزید پراثر بن جاتے ہیں۔ ایسے میں آپ کو اعلیٰ قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ بدھا محض درخت تلے بیٹھے اور دنیا تبدیل ہو گئی۔ دنیا کبھی دوبارہ ویسی نہیں ہو گی جیسی بدھا سے پہلے تھی۔

مسیحؑ کو سولی پر چڑھا دیا گیا، مگر یہ واقعہ پہچان بن گیا۔ اس دن کے بعد سے تاریخ تقسیم ہو گئی۔ تاریخ کبھی دوبارہ ویسی نہیں ہو گی جیسی مسیحؑ کو سولی پر چڑھائے جانے سے قبل تھی۔ چنانچہ مسیحؑ کے نام پر ہمارا تاریخ کو تقسیم کرنا اچھا ہے۔ ہم ''قبل از مسیحؑ اور بعد از مسیحؑ '' کہتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کیونکہ مسیحؑ سے پہلے کی انسانیت کچھ اور تھی اور ان سے بعد میں آنے والی انسانیت کچھ اور ہے۔ یہ بے حد پراثر مظہر ہے۔ جب مسیحؑ ہو گا اور شعور ان کے شعور جیسی بلندیوں کو چھو لے گا تو دوسرے تمام شعور بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ وہ بھی بلندیوں سے ہمکنار ہوں گے۔ اور پھر کبھی پہلے جیسے نہیں ہو پائیں گے۔ ایسے میں ان کا پرانی حالت میں واپس جانا ممکن نہیں رہے گا۔

مذہبی آدمی محض اپنے آپ کو تبدیل کرتا ہے مگر تبدیلی صرف ''دیکھنے'' کی صورت میں ہی ممکن ہوتی ہے۔ تبدیلی افسانے چھوڑ دینے کے نتیجے میں ہی واقع ہو گی۔ اگر آپ کو یہ احساس ہو جائے

کہ آپ ''کچھ نہیں'' ہیں اور آپ خود کو غیر صحت مند سمجھنا شروع کر دیں تو پھر افسانے خود بخود ختم ہو جائیں گے اور ان کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

علم انقلاب کا نام ہے۔ یہ وہ علم نہیں ہوتا جو آپ اپنے ذہن کے ذریعے اکٹھا کرتے ہیں بلکہ یہ علم اپنے آپ کا سامنا کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اپنی ذات کا علم دراصل تبدیلی کی قوت ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ لوگ سوچتے ہیں ''پہلے ہم جانیں گے پھر تبدیل ہوں گے''، نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آپ جس لمحے جان لیتے ہیں اسی لمحے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی لمحے تبدیلی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ علم بذات خود تبدیلی لاتا ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں کہ پہلے آپ جانیں اور پھر تبدیل ہونے کیلئے کچھ کریں۔ علم طریقہ کار کا نام نہیں، یہ ذریعہ نہیں ہے، یہ بذات خود مقصد ہے۔

تاہم جب میں لفظ ''علم'' استعمال کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ''اپنی ذات کا علم'' ہوتی ہے۔ تمام دوسرے علم محض ''ذرائع'' ہیں۔ ایسے علم کے حوالے سے آپ کو پہلے جان پہچان کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بعد ہی کچھ کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ مگر اپنی ذات کے علم کی خصوصیت بالکل مختلف ہے۔ اس میں جب آپ کچھ جان لیتے ہیں تو یہی جاننا آپ کو بدل ڈالتا ہے۔

افسانے ترک کر دیں۔ اپنے آپ کو جاننے کی ہمت پیدا کریں۔ خوف کو ترک کر دیں اور اپنے ذات سے بھاگنے کی کوشش چھوڑ دیں۔

مسیحؑ کہتے ہیں ''جب آپ اپنی آنکھ سے شہتیر نکالیں گے تبھی آپ کو صاف نظر آئے گا'' جب افسانے ترک کر دیے جائیں گے تبھی آپ حقیقت کو جان پائیں گے۔ یہ آپ کی آنکھ میں شہتیر جیسے ہیں۔ یہ آپ کی آنکھوں کے آگے دھند، دھوئیں اور بادل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ آپ واضح طور سے نہیں دیکھ سکتے، آپ کو کچھ بھی واضح دکھائی نہیں دیتا، ہر شے دھندلی ہو گئی ہے، جب آپ کی آنکھ کا شہتیر نکلے گا اسی وقت آپ کو صاف نظر آنا شروع ہو گا۔ شفافیت ہی مقصد ہونا چاہیے۔ آنکھیں صاف ہونی چاہئیں تاکہ آپ براہ راست دیکھ سکیں اور حقیقت تک پہنچ سکیں تاہم ایسا ہونا بے حد مشکل ہے کیونکہ آپ بے حد خود کار اور میکانکی ہو چکے ہیں۔

آپ پھول دیکھتے ہیں اور آپ کا ذہن بولنا شروع ہو جاتا ہے کہ ''ایسا خوبصورت پھول پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا'' ذہن میں شاعری ابھرتی ہے۔ پھول بھلا دیا گیا ہے، شفافیت موجود نہیں

ہے۔ الفاظ دھندلے ہیں، کیا آپ پھول کو کوئی نام دیے بغیر نہیں دیکھ سکتے؟ کیا اسے کوئی نام دینا یا اس کی تعریف کرنا ضروری ہے؟ کیا ایسا کرنے سے کوئی فائدہ ہوگا؟ اگر آپ پھول کے حوالے سے نباتاتی علم سے واقف ہیں تو کیا اس سے پھول زیادہ خوبصورت ہو جائے گا؟ ماہر نباتات اور شاعر کے مابین یہی فرق ہے۔ ماہر نباتات پھول سے متعلق ہر بات جانتا ہے جبکہ شاعر پھول کو جانتا ہے۔ ماہر نباتات لاعلم ہے، اگرچہ وہ زیادہ جانتا ہے مگر اس کا جاننا پھول سے ''متعلق'' ہے جبکہ شاعر پھول کو دیکھ سکتا ہے۔

سنسکرت زبان میں روشن ضمیر شخص اور شاعر کیلئے ایک جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور یہ الفاظ ''رشی'' اور ''قاوی'' ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی شاعر دراصل روشن ضمیر اور غیب دان ہی ہوتا ہے۔ وضاحت کے نتیجے میں زندگی شاعری بن جاتی ہے مگر اس کیلئے آپ کو نام دیے بغیر پھول کو دیکھنا ہوگا۔

الفاظ کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں کہ ''یہ خوبصورت ہے؟'' کیا آپ تعریف کیے بغیر خوبصورتی نہیں دیکھ سکتے؟ کیا یہ دہرانا ضروری ہے کہ ''فلاں شے خوبصورت ہے'' اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھول کافی نہیں ہے۔ آپ کو اس تصور کی ضرورت ہے کہ یہ خوبصورت ہے، تبھی آپ اس کے گرد حسن تخلیق کر سکتے ہیں۔ آپ پھول تو نہیں دیکھتے، پھول محض ایک پردہ ہے، آپ کو حسن کا اظہار کرنا ہے۔

پھول کو دیکھیں اور کچھ مت بولیں۔ ایسا کرنا مشکل ہوگا، دماغ بے چینی محسوس کرے گا کیونکہ یہ بولنے کا عادی ہو چکا ہے۔ یہ مسلسل چپڑ چپڑ باتیں کرتا رہتا ہے۔ پھول کو دیکھیں اور استغراق کریں۔ درخت کو دیکھیں اور اسے کوئی نام نہ دیں۔ کوئی بات نہ کریں۔ کوئی ضرورت نہیں، یہ درخت ہے...... کیوں؟

عظیم چینی صوفی لاؤزو ہر صبح سیر کیلئے جایا کرتا تھا۔ ایک ہمسایہ بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہمسائے کو علم تھا کہ لاؤزو خاموش طبع آدمی ہے اس لیے وہ اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا تھا۔ ہمسایہ سالہا سال تک لاؤزو کے ساتھ سیر کو جاتا رہا مگر اس دوران صوفی نے کوئی بات نہ کی۔ ایک دن ہمسائے کے ہاں آنیوالا مہمان بھی سیر کیلئے ان کے ساتھ ہولیا۔ ہمسائے نے اسے تنبیہ کی کہ منہ سے کچھ نہیں بولنا۔ تینوں سیر کیلئے باغ میں پہنچ گئے۔ صبح بے حد خوبصورت تھی، ہر طرف خاموشی

کا راج تھا، پرندے چہچہا رہے تھے۔ مہمان عادت سے مجبور ہو کر بول اٹھا ''کس قدر خوبصورتی ہے'' اس نے اتنا ہی کہا اور مزید کچھ نہ بولا۔ ایک گھنٹے کی چہل قدمی کے دوران یہ الفاظ کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتے، تاہم لاؤزو نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی گناہ کر بیٹھا ہو۔

گھر واپس پہنچ کر لاؤزو نے اپنے ہمسائے سے کہا ''دوبارہ اپنے ساتھ کسی اور کو مت لانا، یہ شخص بے حد باتونی معلوم ہوتا ہے'' ہمسائے کے مہمان کا ''کس قدر خوبصورتی ہے'' کہنا اس کا باتونی پن تھا۔ لاؤزو نے کہا ''اس شخص نے تمام منظر بگاڑ کر رکھ دیا'' مہمان کی بات خاموش تالاب میں پتھر کی طرح گری اور ہر شے اتھل پتھل ہو گئی۔

درخت کے قریب مراقبہ کریں، ستاروں کے ساتھ مراقبہ کریں، دریا اور سمندر کے قریب مراقبہ کریں، بازار اور قریب سے گزرتے لوگوں میں بھی استغراق کریں، مگر منہ سے کچھ مت بولیں۔ رائے قائم نہ کریں، الفاظ استعمال مت کریں، محض دیکھیں۔ اگر آپ اپنا ادراک واضح کر سکتے ہیں اور نظر کی شفافیت حاصل کرنے کے قابل ہیں تو گویا آپ نے سب کچھ پا لیا۔ یہ شفافیت اور واضح نظری حاصل ہونے کے بعد آپ خود کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اپنی ذات کا علم واضح ذہن پر ہی اترتا ہے۔ یہ علم سے بھرے اور اچھی بری آراء سے معمور ذہن پر نہیں اترتا۔ یہ خوبصورتی اور بدصورتی سے بھرے ذہن پر بھی نہیں اترتا بلکہ یہ الفاظ سے خالی ذہن میں جگہ بناتا ہے۔ ذات کا علم بے لفظ ذہن میں ہی سما سکتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ذہن میں موجود ہوتا ہے اور آپ کو اسے پانے کیلئے صرف ذہنی وضاحت درکار ہوتی ہے، یہی چیز اسے منعکس کرتی ہے۔ آپ کو آئینے جیسا ذہن درکار ہے تاکہ انعکاس ممکن ہو سکے۔ ایک بار ایسا ہو گیا تو پھر آپ اپنے ہمسائے کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ کسی کو نصیحت مت کریں۔ آپ کے تمام پند و نصائح خطرناک ہیں کیونکہ آپ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔

کسی کو تبدیل کرنے کی کوشش مت کریں، یہاں تک کہ اپنے بیٹے کو بھی تبدیل کرنے کا مت سوچیں۔ اپنے بھائی کے حوالے سے بھی ایسا مت سوچیں۔ کسی کو آپ کی جانب سے تبدیلی کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ خطرناک ہیں۔ آپ اپاہج بھی کر سکتے ہیں، آپ ہلاک بھی کر سکتے ہیں، آپ زخمی کر سکتے ہیں، مگر آپ تبدیل نہیں کر سکتے۔ خود تبدیل ہوئے بغیر کسی کی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش مت کریں۔ جب آپ روشنی سے معمور ہوں گے تو تبھی دوسروں کی مدد کر پائیں

گے۔ ایسے میں دوسروں کو تبدیل کرنے کیلئے کسی کوشش کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ آپ سے مدد اسی طرح نکلتی ہے جس طرح چراغ سے روشنی برآمد ہوتی ہے یا پھول سے خوشبو نکلتی ہے۔ اس کی مثال رات کے وقت چاند سے چاندنی پھوٹنے جیسی ہے۔ اس حوالے سے چاند کوئی کوشش نہیں کرتا۔ روشنی خود بخود پھیلتی چلی جاتی ہے۔

کسی نے معروف راہب باشو سے پوچھا ''اپنے خطبات کے بارے میں کچھ کہیں، آپ مسلسل بولتے چلے جاتے ہیں جبکہ آپ کا بولنا ہی بولنے کے خلاف ہے، اس حوالے سے آپ کیا کہتے ہیں؟''

باشو نے کیا جواب دیا؟ باشو نے کہا کہ ''دوسرے بولتے ہیں اور میں پھول کی طرح کھلتا ہوں'' ایسے میں کوشش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور آپ پھول کی طرح جوبن پر آجاتے ہیں۔ یہ سب پھول کے کھلنے اور جوبن حاصل کرنے جیسا ہوتا ہے جس کیلئے کوئی کوشش درکار نہیں ہوتی۔ باشو بولتا ہے، بدھا بولتا ہے، کوئی کوشش نہیں ہوتی، بس یہ ہو جاتا ہے، یہ فطری مظہر ہے، بدھا بولتا ہے، آپ کا بولنا فطری مظہر نہیں ہے بلکہ اس میں دوسری چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ آپ دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں، آپ دوسروں کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، آپ دوسروں کو اپنے زیر اثر لینا چاہتے ہیں، دوسروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنا چاہتے ہیں، دوسروں پر تسلط جمانا چاہتے ہیں اور انہیں یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ آپ بے حد باعلم ہیں۔ آپ اپنی انا کی آبیاری چاہتے ہیں۔ آپ کے بولنے میں بہت سی دوسری چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ آپ پھول کی طرح نہیں کھل رہے۔ آپ کا بولنا بہت بڑا سیاسی کھیل ہے۔ اس میں حکمت عملی اور چالیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

مگر جب باشو بولتا ہے تو وہ پھول کی طرح کھلتا ہے۔ اگر کوئی اس کے پاس موجود ہو تو وہ اس سے مستفید ہوگا۔ تاہم دوسروں کو فائدہ بخشنا مقصد نہیں۔ یہ فائدہ خود بخود ملتا ہے۔ پھول اس لیے نہیں کھلتا۔ اگر آپ راستے پر چلیں تو پھول کی خوشبو خود بخود آپ تک پہنچ جائے گی۔ آپ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ آپ کیف محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ شکر گزار ہو سکتے ہیں، مگر پھول آپ کیلئے نہیں کھلا، یہ بس کھل جاتا ہے۔

بدھا اور مسیحؑ پھول کی طرح کھلتے ہیں اور ان کی خوشبو سے ساری دنیا فیض حاصل کرتی ہے۔ آپ دوسروں کو فوائد بخشنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کے بجائے خود

آپ کو نقصان ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا میں شرارتی لوگوں کی تعداد کم ہوتی تو یہ رہنے کیلئے کہیں بہتر جگہ ہوتی۔ ہر انقلاب نے نقصان پہنچایا ہے اور ہر اصلاح مزید گہری بے ترتیبی کا باعث بنی ہے۔

ایک مرتبہ ڈی ایچ لارنس نے تجویز دی تھی کہ ہمیں سو سال تک تمام انقلابات روک دینے چاہئیں۔ تمام یونیورسٹیاں بند کر دینی چاہئیں، تمام اصلاحات اور ان سے متعلق گفتگو کرنے پر پابندی لگا دینی چاہئے اور قدیم ادوار کے لوگوں کی طرح رہنا چاہئے۔ لارنس کی تجویز خوبصورت ہے۔ ایسا ہوا تو انسانیت ایک مرتبہ پھر زندہ ہو جائے گی۔ توانائی ابھر سکے گی اور لوگ شفافیت حاصل کر سکیں گے۔

الفاظ دھندلا چکے ہیں، یہ بوجھ بن گئے ہیں۔ آپ نے اس قدر علم اٹھا رکھا ہے کہ آپ کیلئے آسمان میں اڑنا ممکن نہیں رہا۔ آپ کے کندھوں پر بے حد بوجھ ہے۔ آپ بے وزن نہیں ہیں۔ آپ کے پر آزاد نہیں ہیں۔ آپ انہی چیزوں سے چمٹے ہوئے ہیں جو آپ کی قید اور بیڑیاں بن گئی ہیں اور ایسا اس لیے ہے کہ آپ انہیں قابل قدر سمجھتے ہیں۔ بے قدر چیزیں، یہ نہ صرف بے وقعت ہیں بلکہ آپ کیلئے خطرناک بھی ہیں۔ الفاظ، صحیفے، علم، نظریے اور ازم جیسی تمام چیزیں آپ کو اپاہج کر دیتی ہیں۔ ان سے وضاحت حاصل نہیں ہو سکتی۔ تمام صحیفوں کو ایک جانب رکھ دیں، تمام آراء کو ایک طرف دھر دیں۔ زندگی کو بچے کی نظر سے دیکھیں جو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ وہ محض دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دیکھنا آپ کو ایک نیا ادراک مہیا کرے گا اور یہ وہ ادراک ہوگا جس کے بارے میں مسیحؑ نے بات کی ہے۔ میں ان کے الفاظ دہراتا ہوں۔

''آپ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں تنکا تو دکھائی دیتا ہے مگر آپ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے''

''جب آپ اپنی آنکھ کا شہتیر نکال لیں گے تو تبھی اپنے بھائی کی آنکھ سے تنکا نکالنے کے لیے واضح طور سے دیکھ پائیں گے''

یہی بات مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر آپ خود روشنی بن جائیں گے تو دوسروں کو بھی روشن کر سکیں گے۔ یہ پھول کے کھلنے جیسا ہوگا جس سے ہر ایک کو فائدہ پہنچے گا۔ کھلے پھول سے ہر ایک کو فائدہ پہنچتا ہے اور آپ رحمت بن جاتے ہیں۔

☆☆☆

تیسرا باب

آزادی

ہر شخص پہلے ہی دو گھوڑوں پر سوار ہے اور ہر انسان بیک وقت دو بلکہ دو سے بھی زیادہ کمانیں کھینچے ہوئے ہے۔ یہی شے اذیت کی تخلیق کا سبب بنتی ہے اور اسی وجہ سے آپ مستقل طور سے اندیشوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اندیشے اس امر کا اظہار ہیں کہ آپ کسی نہ کسی طرح دو گھوڑوں پر سواری کر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ کو سکون کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے کیونکہ دو گھوڑے دو مختلف سمتوں میں بھاگ رہے ہیں اور آپ کہیں حرکت نہیں کر سکتے۔

ایک گھوڑے پر بیٹھ کر نقل و حرکت کرنا ممکن ہے اور آپ کہیں نہ کہیں پہنچ سکتے ہیں۔ دو گھوڑوں پر بیٹھ کر نقل و حرکت ناممکن ہو جاتی ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے مخالف سمت میں بھاگنے کیلئے زور لگائیں گے اور آپ کہیں نہیں پہنچ پائیں گے۔ یہی اصل پریشانی ہے کہ آپ کہیں نہیں پہنچ پا رہے۔ آپ کی ذات کی گہرائیوں میں یہی اذیت پل رہی ہے۔ زندگی ہاتھ سے پھسل رہی ہے۔ وقت کم رہ گیا ہے، موت قریب آ رہی ہے اور آپ کہیں نہیں پہنچ پا رہے۔ آپ کی حالت اس ساکن تالاب کی سی ہے جو روز بروز خشک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی مقصد ہے نہ کوئی تکمیل۔ مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ شاید آپ ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں؟

اپنے اندر کام کرتے دماغ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ تبھی آپ مسیحؑ کے قول کو سمجھ پائیں گے۔ آپ غریب آدمی کی طرح آزاد ہونا چاہتے ہیں کیونکہ صرف غریب آدمی ہی آزاد ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غریب آدمی پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا، اسے کسی شے کی حفاظت نہیں کرنا پڑتی اور آپ اسے لوٹ بھی نہیں سکتے۔ اسے کوئی خوف نہیں ہے۔ آپ اس سے کوئی شے نہیں چھین سکتے کیونکہ

مسیحؑ نے کہا

''آدمی کیلئے بیک وقت دو گھوڑوں کی سواری اور دو کمانیں تاننا ممکن نہیں''

''نوکر بیک وقت دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا، بصورت دیگر وہ ایک کو خوش کرے گا اور دوسرے کو ناراض کر بیٹھے گا''

اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ کچھ نہ ہونے کے باعث وہ پرسکون ہے۔اس کے قبضے میں کچھ ہے نہ اسے چرایا جاسکتا ہے۔کوئی اس کا دشمن نہیں کیونکہ اس کا کسی سے مقابلہ ہی نہیں۔ وہ کسی سے مقابلہ نہیں کرتا۔آپ غریب آدمی اور بھکاری کی طرح آزاد ہونا چاہتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ امیر آدمی اور شہنشاہوں کی طرح امیر اور محفوظ رہنے کے بھی خواہشمند ہیں۔امیر آدمی محفوظ ہوتا ہے،اسے تحفظ حاصل ہے اور وہ مستحکم ہے۔ بظاہر اس نے تمام تر انتظامات کرر کھے ہیں۔ وہ ناگفتہ بہ حالت میں نہیں ہے۔ اس نے موت کے خلاف حفاظتی حصار بنا رکھا ہے۔ آپ اسے باآسانی ہلاک نہیں کرسکتے۔اس کے پاس ڈھال ہے۔آپ بھکاری کی طرح آزاد رہنا چاہیں گے اور بادشاہ کی طرح محفوظ رہنے کے خواہشمند ہوں گے۔ایسے میں آپ دو گھوڑوں پر سوار ہوں گے اور اس حالت میں کہیں بھی نہیں پہنچا جاسکتا۔

آپ کو کسی شخص سے محبت ہے مگر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس شخص کو کسی مادی چیز کی طرح ہونا چاہئے۔اسے مکمل طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔تاہم مادی شے سے پیار کرنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اشیا مردہ ہوتی ہیں اور آپ سے جواباً پیار نہیں کرسکتیں۔اس لیے اگر دوسرا شخص واقعی انسان ہے تو اس پر قبضہ نہیں جمایا جاسکتا۔ وہ پارے کی طرح ہوتا ہے۔آپ اسے اپنی مٹھی میں بند کرنے کی جتنی بھی کوشش کریں گے وہ اتنا ہی ہاتھ سے پھسل کر باہر نکل جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ انسان کا مطلب آزاد ہونا ہے۔اگر وہ انسان ہے تو آپ اس پر قبضہ نہیں جما سکتے۔اسی طرح اگر آپ اس پر قبضہ کرسکتے ہیں تو وہ انسان نہیں ہوگا اور اس سے محبت بھی نہیں کی جاسکتی۔ایسے میں وہ محض ایک مردہ چیز ہوگی اور مردہ چیزوں سے محبت نہیں کی جاسکتی۔

آپ دو گھوڑوں پر سوار ہیں۔آپ انسان کو مادی چیز جیسا سمجھتے ہین جو کہ ناممکن ہے۔ انسان کو آزاد اور زندہ ہونا چاہئے اسی صورت میں آپ اس سے پیار کرسکتے ہیں۔تاہم ایسا کرتے ہوئے آپ کو مشکل پیش آئے گی۔آپ اس پر تسلط جمانا شروع کردیں گے اور اسے ہلاک کرنے پر تل جائیں گے۔ جلد یا بدیر وہ ایک مادی شے بن کر رہ جائے گا۔ چنانچہ بیویاں گھروں میں سجی سجائی چیز بن کر رہ جاتی ہیں اور شوہروں کی حیثیت چوکیداروں سے زیادہ نہیں رہتی، پیار غائب ہو جاتا ہے۔ ہر طرف یہی کچھ ہو رہا ہے۔آپ میں شک پایا جاتا ہے کیونکہ یہ فائدہ مند چیز ہے۔اس سے آپ کو خودغرضی کی قوت ملتی ہے اور آپ مزید تحفظ پاتے ہیں۔ایسے میں آپ کو باآسانی دھوکہ

نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ شک کرتے ہیں۔تاہم شک اندیشے اور پریشانی بھی لاتا ہے اور آپ اندر سے بے چین رہتے ہیں۔ شک وشبہ بھی بیماری جیسا ہوتا ہے۔ کسی پر اعتماد کیے بغیر آپ پرسکون نہیں رہ سکتے کیونکہ شک کا مطلب تھرتھراہٹ ہے اور تھرتھراہٹ کی کیفیت میں سکون جاتا رہتا ہے۔شک کا مطلب ہے ''کیا کیا جائے؟.... یہ یا وہ؟ شک کا مطلب یہ ہے کہ ''ہوا جائے یا نہ ہوا جائے؟'' شک کی صورت میں فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔

شک کے ذریعے یک نکاتی فیصلہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے برتر ذہنی رجحان کی بنیاد پر کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں مگر ایک کمتر رجحان بھی برابر موجود ہوتا ہے اور یہ اس قدر کم نہیں ہوتا۔ یہ کمتر رجحان ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور موقع ملتے ہی آپ کو یہ باور کراتا ہے کہ آپ کا فیصلہ غلط تھا۔اقلیت ہمیشہ باغی ہوتی ہے اور یہ آپ کے اندر مسلسل افراتفری پھیلاتی رہتی ہے۔

شک کے باعث بےقراری جنم لیتی ہے۔ یہ بیماری ہے، یہ دوسری بیماریوں جیسی ہوتی ہے اور اسے ذہنی بیماری کہا جانا چاہئے۔جو شخص شک وشبہ کرتا ہے وہ بیمار سے بیمار تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ تاہم آپ اسے باآسانی دھوکہ نہیں دے سکتے، وہ بے حد مکار ہے اور دنیاوی معاملات میں بے حد چالاک ہوتا ہے۔آپ اسے دھوکہ نہیں دے سکتے، مگر وہ بیمار ہے، چنانچہ اس میں فائدہ ہے اور وہ فائدہ یہ ہے کہ اسے دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔تاہم اس میں ایک نقصان بھی ہے اور وہ بہت بڑا نقصان ہوتا ہے۔فائدہ بہت بڑی قیمت ہے، وہ ہمیشہ تھرتھراتا رہتا ہے، بے چین رہتا ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتا۔ یہاں تک کہ اگر وہ فیصلہ کر بھی لے تو وہ مخالفت کے مقابلے میں نسبتاً برتر موافقت ہوگی۔ وہ تقسیم ہوگیا ہے، اب اس میں ہمیشہ ایک کشمکش سی جاری رہے گی۔

آپ ہمیشہ اعتماد کے خواہاں ہوتے ہیں۔آپ اعتماد کی کیفیت میں رہنا چاہتے ہیں کیونکہ اعتماد آپ کو صحت بخشتا ہے۔ اعتماد کی بدولت تذبذب نہیں رہتا اور آپ واضح فیصلہ کرسکتے ہیں۔ یقینی کیفیت آپ کو خوشی عطا کرتی ہے، ایسے میں کپکپاہٹ اور تھرتھراہٹ نہیں ہوتی اور آپ پرسکون رہتے ہیں۔آپ تقسیم شدہ نہیں ہوتے اور مکمل ہونا ہی صحت مند ہونے کی علامت ہے۔اعتماد آپ کو صحت بخشتا ہے مگر ایسے میں آپ غیر محفوظ ہوجاتے ہیں اور کوئی بھی شخص آپ کو دھوکہ دے سکتا ہے۔اگر آپ اعتماد کرتے ہیں تو خطرے میں رہتے ہیں کیونکہ چہار جانب ایسے لوگ موجود ہیں جو

آپ کا استحصال کرنا چاہیں گے۔ وہ اسی صورت میں استحصال کر سکتے ہیں جب آپ کو ان پر اعتماد ہو۔ اگر آپ کو شک وشبہ ہوگا تو وہ آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

چنانچہ آپ شک اور اعتماد نامی دو گھوڑوں پر سوار ہیں تاہم آپ ناممکن کام کرنے چلے ہیں۔ آپ مسلسل اندیشوں اور اذیتوں کا شکار رہیں گے، آپ کی حالت ابتر رہے گی۔ دو گھوڑوں کی اس کشمکش میں آپ مارے جائیں گے۔ کسی نہ کسی دن حادثہ پیش آجائے گا اور یہ آپ کی موت ثابت ہوگا۔ ایسے میں آپ کہیں پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے۔ آپ پھول کھلنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے۔ آپ زندگی کو جانے بغیر ہی ختم ہو جائیں گے۔

مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''آدمی کیلئے دو گھوڑوں کی سواری ناممکن ہے..... '' تاہم ہر شخص یہ ناممکن عمل سرانجام دینے کی کوشش کر رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شخص مشکلات میں مبتلا ہے۔ چنانچہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہر طرف ایسا ہی ہو رہا ہے۔ محض دو گھوڑے ہی نہیں بلکہ لاکھوں گھوڑے اکٹھے ہیں اور آپ ہر لمحے تضادات کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ طریق کار کو سمجھ کر ہی اسے ترک کر سکتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہر بچے کی پرداخت کا انداز ہی اس کی بنیادی وجہ ہے۔ جس انداز میں بچہ پاگلوں کی اس دنیا میں داخل ہوتا ہے وہی اس کا سبب ہے۔ لوگ تضادات تخلیق کرتے ہیں۔ وہ آپ کو متضاد باتیں بتاتے ہیں۔

آپ کو پڑھایا جاتا رہا ہے کہ ''تمام انسانیت سے پیار کرو، ہر ایک سے بھائیوں جیسا سلوک کرو اور ہمسایوں سے بھی اسی طرح پیش آؤ جس طرح تم اپنے اہلخانہ سے پیش آتے ہو'' تاہم اس کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر ایک کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ جب آپ کسی سے اپنا مقابلہ اور موازنہ کریں گے تو وہ دوست نہیں رہے گا بلکہ آپ کا حریف بن جائے گا۔ آپ کو صرف یہ سکھایا گیا ہے کہ اسے شکست دینا ہے، اس پر فتح پانا ہے اور اسے تباہ کرنا ہے۔ ایسے میں آپ کو بے رحم ہونا پڑے گا بصورت دیگر وہ آپ کو تباہ کر دے گا۔ اگر آپ مقابلے کی روش اختیار کریں گے تو پھر پورا سماج آپ کے مقابل ہوگا۔ ایسے میں کوئی ہمسایہ ہوتا ہے نہ بھائی۔ آپ پیار نہیں کر سکتے، آپ کو نفرت کرنا ہے، آپ کو حسد کرنا ہے اور خفگی کا اظہار کرنا ہے۔ آپ کو لڑنے اور فتح پانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا ہے اور یہ بے حد مشکل جدوجہد ہے، اگر آپ نرم دل ہیں تو باآسانی ہار جائیں گے۔

چنانچہ مضبوط، متشدد اور جارح بنیں۔ دوسروں کے حملے سے پہلے آپ خود ان پر حملہ کر دیں۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے، آپ کو حملہ کر کے فتح پا لینی چاہئے۔ ایسا نہ ہوا تو آپ ہار جائیں گے کیونکہ لاکھوں دوسرے لوگ بھی اسی چیز کی خاطر لڑ رہے ہیں اور آپ اکیلے نہیں ہیں۔ مقابلے میں مصروف ذہن ہمسایے سے پیار کیونکر کر سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے، تاہم آپ کو دونوں طرز کی تعلیم دی گئی ہے۔ آپ کو پڑھایا گیا ہے کہ دیانت داری بہترین حکمت عملی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سکھایا گیا ہے کہ کاروبار کاروبار ہوتا ہے۔ دونوں چیزیں اکٹھی ہیں۔ آپ کو سواری کیلئے دو گھوڑے دے دیے گئے ہیں۔ بچہ معاملات دنیا سے ناواقف ہوتا ہے، وہ تضادات کو دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے۔

تضاد کو محسوس کرنے کیلئے بیحد پختہ ذہانت درکار ہوتی ہے۔ تضادات کی پہچان کیلئے مسیحؑ اور بدھا کی ضرورت پڑتی ہے۔ بچہ آگاہ نہیں ہوتا اور اپنے اساتذہ، ماں باپ اور خاندان سے پیار کرتا ہے۔ وہ یہ بات کیسے سوچ سکتا ہے کہ یہ لوگ اس میں تضادات تخلیق کر رہے ہیں؟ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ لوگ اس کے محسن ہیں۔ وہ اس پر مہربان ہیں اور اس کی پرورش کر رہے ہیں۔ وہ توانائی، زندگی اور ہر شے کا منبع ہیں۔ چنانچہ وہ تضادات کیوں تخلیق کریں گے؟ ماں اور باپ بچے سے پیار کرتے ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ بھی اسی غلط انداز میں پرورش پا کر بڑے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ کیا کرنا چاہئے۔ وہ محض اسی طریق کار کو دہرائے چلے جا رہے ہیں جو ان پر بھی آزمایا جا چکا ہے۔ انہیں ان کے والدین نے جو کچھ سکھایا تھا وہی یہ لوگ اپنے بچوں کو بھی سکھا رہے ہیں۔ وہ محض ایک بیماری اگلی نسل کو منتقل کر رہے ہیں۔ یہ بیماری ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہو رہی ہے۔ آپ اسے ''خزانہ'' یا ''وراثت'' بھی کہہ سکتے ہیں مگر حقیقت میں یہ ''بیماری'' ہے۔ یہ بیماری ہی ہے کیونکہ اس کے ذریعے آج تک کوئی بھی تندرست نہیں ہو سکا۔

تمام تر سماج اعصابی بدنظمی کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بچہ بیحد سادہ اور معصوم ہوتا ہے اور اسے متضاد انداز میں متعین کیا جا سکتا ہے۔ جب تک اسے تضاد کا علم ہوتا ہے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ تقریباً تمام زندگی ختم ہو جاتی ہے اور آپ کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ دو گھوڑوں پر سوار ہیں۔ آپ سوچیں تو اپنی زندگی میں تضادات ڈھونڈ سکتے ہیں۔ آپ کو اپنی زندگی میں لاکھوں تضادات ملیں گے۔ آپ کی زندگی پریشانی اور بے ترتیبی سے عبارت ہے۔

جب لوگ میرے پاس آتے ہیں اور خاموشی کے حصول کی بات کرتے ہیں تو میں ان کی طرف دیکھتا ہوں اور بے حد افسوس کرتا ہوں کیونکہ ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ تمام تضادات ختم ہونے کی صورت میں ہی خاموشی ممکن ہے۔ یہ بے حد مشکل جدوجہد، بے حد نفوذ پذیر ذہانت، سمجھ بوجھ اور پختگی کا تقاضا کرتی ہے۔ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ محض کوئی مخصوص راگ الاپ کر آپ سکوت کی دولت حاصل کر سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو ہر شخص سکوت حاصل کر چکا ہوتا۔ کیا محض رام رام دہرانے سے آپ سکوت پالیں گے؟ لاکھوں گھوڑوں پر سواری اور منتر الاپنے سے کیا آپ خاموش ہو جائیں گے؟ یہ منتر ایک اور گھوڑا ثابت ہوگا اور ایسا کرنے سے پریشانی میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ آپ کے گھوڑوں میں ایک اور گھوڑے کا اضافہ ہو جائے گا اور آپ مزید پریشانی کا شکار ہو جائیں گے۔

نام نہاد مذہبی آدمی کو دیکھیں۔ وہ دنیا دار آدمی کی نسبت زیادہ پریشان ہے کیونکہ نئے گھوڑے آتے چلے جا رہے ہیں۔ بازار اور بازاری دنیا کا آدمی کم پریشان ہے کیونکہ بہت سے گھوڑوں کا مالک ہونے کے باوجود وہ صرف اسی دنیا کے گھوڑوں پر ہی سوار ہے۔ ایک بات واضح ہے کہ اس کے تمام گھوڑے دنیاوی ہیں۔ اس کے بجائے مذہبی آدمی کے پاس ہر قسم کے گھوڑے ہیں۔ اس کے کچھ گھوڑے تو اسی دنیا سے متعلق ہیں جبکہ بعض گھوڑوں کا تعلق کسی اور دنیا سے ہے۔ اس نے بہت بڑا افتراق پیدا کر دیا ہے۔ دوسری دنیا، خدا اور خدا کی دنیا کی بات کرتے ہوئے وہ بدستور اسی دنیا میں گھوم پھر رہا ہے۔ وہ مزید پریشان ہو جاتا ہے اور اس کے وجود میں مزید انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور ہر حصہ دوسرے سے بعید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی تمام تر یگانگت جاتی رہی ہے اور یہی اعصابی بدنظمی ہے۔

آپ کی پرورش و پرداخت کا طریقہ غلط تھا مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اب آپ کی پرورش ہو چکی ہے اور آپ واپس نہیں پلٹ سکتے۔ چنانچہ آپ کو اسے سمجھنا ہے اور سمجھ کے ذریعے ترک کرنا ہے۔ اگر آپ اسے میرے کہنے پر ترک کرتے ہیں تو پھر آپ مزید گھوڑے پال لیں گے۔ اگر آپ اسے سمجھ بوجھ کے ذریعے ترک کریں گے تو پھر آپ متعدد گھوڑوں کے سوار نہیں کہلائیں گے۔ اس کے برعکس پرانے گھوڑے آزاد ہو جائیں گے جو کہ اپنے مقاصد کو پہنچنے کیلئے آزاد ہوں گے جبکہ آپ بھی آزادانہ طور سے اپنے مقصد کو حاصل کر پائیں گے۔

نہ صرف آپ بہت بڑی مشکل میں مبتلا ہیں بلکہ آپ کے باعث آپ کے گھوڑے بھی بے حد مشکلات کا شکار ہیں۔ وہ بھی کسی مقام پر نہیں پہنچ سکتے۔ خود اور اپنے گھوڑوں پر رحم کھائیں۔ تاہم یہ سب کچھ سمجھ بوجھ کے ذریعے ہونا چاہئے۔ یہ میری، مسیحؑ یا بدھا کی تعلیمات کے بجائے آپ کی سمجھ بوجھ کے ذریعے ہوگا۔ بدھا اور مسیحؑ راستہ دکھا سکتے ہیں تاہم اگر آپ نے سمجھ بوجھ کے بغیر ان کی پیروی کی تو کبھی اپنے مقصد کو نہیں پہنچ پائیں گے۔

اب سمجھنے کی کوشش کریں۔

مسیحؑ کا فرمان ہے ”آدمی کیلئے دو گھوڑوں پر بیک وقت سواری کرنا اور بیک وقت دو کمانیں تاننا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح ایک نوکر کیلئے دو مالکوں کی خدمت کرنا بھی ممکن نہیں، بصورت دیگر ایک مالک اس سے خوش اور دوسرا ناراض ہو جائے گا۔

ایسا ناممکن کیوں ہے؟ اور ناممکن کیا ہے؟ بہت مشکل شے ناممکن نہیں ہوتی۔ کوئی چیز مشکل تو ہو سکتی ہے مگر ناممکن نہیں ہو سکتی۔ آپ اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ تاہم ناممکن کا مطلب ناقابل حصول ہے، یعنی کوئی کام کرنے کا کوئی راستہ نہ ہونا۔

جب مسیحؑ ناممکن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب ”ناممکن“ ہی ہے۔ اسے ”بے حد مشکل“ نہ سمجھا جائے۔ آپ ناممکن کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا ہوگا؟ ایسا نہیں ہو سکتا، اس کے بجائے یہ کام کرنے کی کوشش میں آپ ختم ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا، تاہم اس ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش میں آپ پر کیا بیتے گی؟ آپ تقسیم ہو جائیں گے۔ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے مگر ایسا کرنے کی کوشش میں آپ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ایسا ہوگا اور ایسا ہو چکا ہے۔

اگر آپ کو میری بات پر شک ہے تو لوگوں کو دیکھیں۔ کیا آپ نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جو شبے کا شکار ہو اور اسے کسی شے پر یقین نہ رہا ہو؟ اگر آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہو جو صرف شبہ کرتا ہو تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ پاگل خانوں میں جائیں۔ وہاں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جنہیں ہر شے پر شک ہوگا۔ وہ حرکت کرنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں کیونکہ انہیں عام سی حرکت کرتے ہوئے بھی شک ہوتا ہے۔

میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اس قدر شبہات کا شکار تھا کہ بازار بھی نہیں جا سکتا تھا جبکہ بازار اس کی رہائش گاہ سے محض چند قدم کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہ بازار جانے کیلئے نکلتا تو گھر کا

تالا دیکھنے کیلئے بار بار راستے سے واپس مڑ آتا تھا۔ جب ہم بچے تھے تو اس بیچارے کے ساتھ نت نئی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ جب وہ بازار جانے کیلئے نکلتا تو ہم اسے کہتے ''کیا آپ نے دروازہ اچھی طرح بند کیا ہے؟'' ہماری بات سن کر اسے بے حد غصہ آتا مگر وہ دروازہ دیکھنے کیلئے واپس ضرور جاتا تھا۔ وہ اکیلا تھا، اس کے ساتھ اور کوئی نہ تھا اور وہ بے حد خوفزدہ رہتا تھا۔ جب وہ دریا میں نہاتا تو کوئی شرارتاً آواز لگاتا ''کیا تم نے دروازہ اچھی طرح بند کیا تھا؟'' یہ سن کر اسے غصہ آتا مگر وہ غسل ترک کر کے بھاگم بھاگ گھر واپس پہنچتا اور دروازے کا تالا چیک کیا کرتا تھا۔ مکمل متشکک ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر شک کی مقدار بڑھ جائے تو آپ کو پاگل خانے میں داخل ہونا پڑتا ہے کیونکہ ایسی حالت میں آپ ہر بات پر شک کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایسے شخص کی مثال ہے جو مکمل طور سے ٹکڑوں میں بٹ چکا ہوتا ہے۔

اس سے برعکس اگر آپ ایمان اور یقین کو منتخب کر لیں تو مطلق اندھے کہلائیں گے۔ ایسے میں کوئی بھی شخص آپ کو کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ تب آپ کے پاس اپنی کوئی ذہانت یا مستعدی نہیں رہے گی۔ ہٹلر کے اردگرد ایسے ہی لوگ جمع تھے۔ ہٹلروں کے پیروکار اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں اور یہی اندھا یقین انہیں لے ڈوبتا ہے۔

اسی باعث آپ ناممکن کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ سمجھوتہ کرتے ہیں۔ اس انتہا کی طرف بھی نہیں جانا کیونکہ وہاں جانے سے اعصابی بدنظمی کا شکار ہونا پڑے گا۔ دوسری انتہا کی طرف بھی نہیں جانا کہ بینائی جاتی رہے گی۔ تو پھر کیا کیا جانا چاہئے؟ ایسے میں سادہ بات یہی رہ جاتی ہے کہ دونوں پر سمجھوتہ کر لیا جائے۔ آدھا آدھا، قدرے شک اور قدرے یقین۔ تاہم ایسے میں آپ دو گھوڑوں پر سوار ہو جاتے ہیں۔ کیا شک اور یقین کے بغیر جینا ممکن نہیں ہے؟

ایسا ہونا ممکن ہے۔ درحقیقت یہی وہ واحد امکان ہے جسے نشوونما پانا ہے۔ شک اور یقین کے بغیر جینا۔ آگاہی کے ساتھ سادہ اور بیساختہ زندگی بسر کرنا۔ حقیقی اعتماد یہی ہے۔ یہ کسی کی ذات پر اعتماد نہیں بلکہ زندگی پر اعتماد کا اظہار ہے۔ یہ جہاں کہیں بھی لے جائے آپ شک اور یقین کے بغیر محض عمل کرتے ہیں اور معصومانہ انداز میں عمل کرتے ہیں۔

شبے کا شکار شخص معصومانہ انداز میں نہیں جی سکتا۔ ایسا شخص حرکت کرنے سے پہلے سوچے گا اور بعض اوقات اس قدر زیادہ سوچے گا کہ موقع ہی ضائع کر بیٹھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مفکر عموماً زیادہ

کام نہیں کرتے۔ وہ عمل نہیں کر سکتے، وہ محض غیر جذباتی بن کر رہ جاتے ہیں کیونکہ عمل سے پہلے انہیں بہرصورت فیصلہ کرنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا ہوتا ہے۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے چنانچہ عمل کیونکر ہو؟ ایسے میں عمل نہ کرنا اور انتظار کرنا ہی بہتر ہوتا ہے، تاہم زندگی آپ کا انتظار نہیں کرے گی۔ دوسری صورت میں آپ پریقین شخص بن جائیں گے اور اندھوں کی طرح ہوں گے۔ ایسے میں کوئی شخص، کوئی سیاستدان، کوئی پاگل، کوئی پادری اور کوئی مذہبی پیشوا آپ کو کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ بذات خود نابینا ہوتے ہیں۔ جب اندھا کسی اندھے کی رہنمائی کرنے لگتا ہے تو تباہی یقینی ہوتی ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ عام ذہانت تو یہی کہتی ہے کہ سمجھوتہ کر لیا جائے۔

جی ایف سکنر نامی سائنسدان نے ایک تجربہ کیا جو یاد رکھے جانے کے لائق ہے۔ یہ تجربہ ایک سفید چوہے پر کیا گیا۔ اس چوہے کو دو تین دن کھانے کے بغیر رکھا گیا۔ وہ اس قدر بھوکا تھا کہ کوئی بھی شے کھا سکتا تھا۔ اسے ایک پلیٹ فارم پر رکھا گیا جس کے نیچے ایک ہی حجم اور رنگت والے دو ڈبے رکھ دیے گئے۔ دونوں ڈبوں میں خوراک ڈال دی گئی۔ چوہے نے دائیں یا بائیں کسی ایک ڈبے میں چھلانگ لگانا تھی۔

چوہے نے توقف کیے بغیر چھلانگ لگا دی۔ تاہم جب وہ دائیں ڈبے میں چھلانگ لگاتا تو اسے کرنٹ لگتا تھا۔ اس ڈبے میں ایک خفیہ دروازہ تھا جس کے ذریعے وہ ایک اور ڈبے میں جا گرتا اور کھانے سے محروم رہتا تھا۔ اس کے برعکس بائیں ڈبے میں چھلانگ لگانے کی صورت میں نہ تو کرنٹ لگتا تھا اور نہ ہی وہاں کوئی خفیہ خانہ تھا۔ اس کے بجائے وہاں اسے خوراک مل جاتی تھی۔ دو تین روز میں اس نے یہ بات سمجھ لی اور صرف بائیں ڈبے میں ہی چھلانگ لگانے لگا۔

اب سکنر نے دونوں ڈبے تبدیل کر دیے۔ چوہے نے حسب عادت بائیں ڈبے میں چھلانگ لگائی تاہم اسے کرنٹ لگا اور وہ خفیہ خانے میں جا گرا۔ اس واقعے نے اسے پریشان کر دیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ چنانچہ اب چھلانگ لگانے سے پہلے اس پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی اور وہ شبے میں پڑ جایا کرتا تھا۔ تاہم آہستہ آہستہ وہ اس نئی ترتیب کا بھی عادی ہو گیا۔ چند روز کے بعد سکنر نے ڈبے دوبارہ سابقہ پوزیشن پر رکھ دیے۔ اب وہ چوہا بھوکا ہونے کے باوجود انتظار کرتا، دیکھتا اور فیصلہ کرنے میں وقت لیتا تھا۔ ایسے میں اس نے وہی کیا جو آپ کرتے ہیں۔ اس نے دونوں ڈبوں کے درمیان چھلانگ لگا دی۔ مگر وہاں خوراک ہی نہ تھی۔

چند ہفتوں کے تجربات کے بعد وہ سفید چوہا پاگل اور اعصابی بدنظمی کا شکار ہوگیا۔ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہورہا ہے۔ آپ پریشان ہو چکے ہیں کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ ایسے میں ذہن کو یہی آسان راہ سوجھتی ہے کہ سمجھوتہ کرلیا جائے اور درمیان میں چھلانگ لگادی جائے۔ تاہم وہاں کوئی خوراک نہیں ملتی۔ یقیناً درمیان میں کرنٹ بھی نہیں لگتا تاہم وہاں خوراک بھی نہیں ہوتی۔

اگر آپ نے درمیان میں چھلانگ لگائی تو آپ زندگی سے محروم ہو جائیں گے۔ اگر سفید چوہے کیلئے دوگھوڑوں پرسواری ممکن ہوتی وہ دونوں ڈبوں میں بیک وقت چھلانگ لگا چکا ہوتا۔ عام ذہانت کی رو سے دو امکانات یہی ہوسکتے ہیں کہ دونوں گھوڑوں پر سواری کرلی جائے یا درمیان میں چھلانگ لگادی جائے۔ معاملہ سمجھنے کیلئے بے حد گہری ذہانت اور نفوذ پذیری درکار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور حل موجود نہیں ہے۔ میں آپ کو کوئی حل پیش نہیں کررہا۔ مسیحؑ نے بھی کسی کو کوئی حل پیش نہیں کیا۔ مسئلے کی سمجھ بوجھ ہی اس کا حل ہے۔ جب آپ نے مسئلہ سمجھ لیا تو یہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

یقین کے بغیر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح شک وشبے کے بغیر بھی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ سمجھوتہ زہر بن جاتا ہے۔ یہ دونوں بے حد متضاد ہیں۔ آپ کی تمام زندگی تضادات بن کر رہ جائے گی اور اگر تضاد ہوا تو آپ تقسیم ہوکر بکھر جائیں گے جس کا نتیجہ شیزوفرینیا (فکروعمل میں تضاد کی بیماری) کی صورت میں نکلے گا۔ اس کے بجائے اگر آپ یقین یا شبے میں سے ایک کو منتخب کرلیتے ہیں اور دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں تو پھر دوسرے سے فوائد کے حصول کا امکان بھی ختم ہوجائے گا۔ شک آپ کو استحصال کیخلاف تحفظ مہیا کرتا ہے جبکہ یقین آپ کو قطعیت دیتا ہے۔ اگر آپ نے دونوں میں سے کسی ایک شے کو چھوڑ دیا تو اس کے فوائد سے بھی محروم رہ جائیں گے۔ مزید برآں دونوں کو قبول کرنے کا مطلب بیک وقت دوگھوڑوں کی سواری ہے۔

سمجھوتے کی صورت میں آپ اپنے اندر تقسیم تخلیق کردیں گے، ایسے میں آپ ایک سے دو ہوجائیں گے اور ہجوم میں تبدیل ہوکر رہ جائیں گے۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؟

مسئلے کو سمجھیں اور دوگھوڑوں سے نیچے اتر آئیں۔ کوئی بھی سمجھوتہ مت کریں۔ ایسا کرنے سے آپ کے شعور کے حوالے سے ایک بالکل مختلف خصوصیت جنم لے گی۔ مگر آپ ایسا کیوں نہیں کررہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوبی چوکسی کا تقاضا کرتی ہے اور اس خوبی کو آگاہی کی ضرورت ہوتی

ہے۔ ایسے میں آپ کو کسی پر شک نہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ پوری طرح چوکنا ہوتے ہیں۔ آپ کی چوکسی استحصال کیخلاف تحفظ کی ضامن ہوگی۔

اگر کوئی بھرپور مستعدی کا حامل انسان آپ کو دیکھے تو آپ اسے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس کی ایک نظر ہی آپ کو غیر مسلح کردے گی۔ اگر وہ استحصال کی اجازت دیتا ہے تو یہ آپ کی مکاری اور دھوکے بازی کی بدولت نہیں ہوگا بلکہ ایسا اس لیے ہوگا کہ وہ شخص رحم دل ہے اور اس نے خود آپ کو فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے۔ تاہم آپ پوری طرح چوکس انسان کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ ایسا کرنا ناممکن ہے کیونکہ وہ آپ میں سے دیکھتا ہے اور آپ شفاف ہیں۔ اس کا آپ کو دھوکہ بازی کی اجازت دینا اس کی رحم دلی کے باعث ہے۔ آپ کے لیے اسے دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

ایسا تصور مشکل دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ناممکن کا انتخاب کرلیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ ناممکن ناممکن ہی ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے دل کو جھوٹی تسلی دے رکھی ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ایسا ہوجائے گا۔ یہ کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ آپ نے اس لیے ناممکن کا انتخاب کیا ہے کہ بظاہر یہ آسان نظر آتا ہے۔ سمجھوتہ ہمیشہ آسان لگتا ہے۔ جب بھی آپ مشکل میں ہوں تو سمجھوتہ کرلیتے ہیں۔ مگر سمجھوتے نے کبھی کسی کی مدد نہیں کی کیونکہ سمجھوتے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذات میں دو متضاد چیزیں موجود رہیں گی۔ وہ آپ کو ہمہ وقت تناؤ میں مبتلا کیے رکھیں گی اور آپ کو تقسیم کردیں گی۔ تقسیم شدہ آدمی کبھی خوش نہیں ہوسکتا۔

مسیحؑ کی بات کا یہی مفہوم تھا مگر عیسائیوں نے اسے غلط سمجھا۔ عیسائی مسیحؑ کو سمجھ ہی نہیں پائے کیونکہ ذہن تشریح کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ انہوں نے کیا تشریح کی ہے؟ ان کے خیال میں مسیحؑ یہ کہہ رہے ہیں کہ "ایک گھوڑا چن لو، یہ دنیا یا وہ دنیا، ایک کا انتخاب کرلو، دوگھوڑوں پر سواری مت کرو کیونکہ آپ کو مشکل پیش آئے گی اور یہ ناممکن ہے، لہٰذا ایک گھوڑے کا انتخاب کرو" وہ یہی نتیجہ نکالتے ہیں اور یہی تشریح کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک رات ملا نصرالدین کی بیوی کو بھوک لگی۔ اس نے باورچی خانے میں جاکر کھانے کی کوئی شے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اسی دوران اسے کتوں کے کھانے کا بسکٹ ملا۔ اس نے آزمائشی طور پر اسے چکھا اور مزیدار لگنے پر پورا بسکٹ کھا گئی۔ اسے یہ بسکٹ اس

قدر اچھا لگا کہ اس نے اگلی صبح ملا نصر الدین کو ایسے بسکٹوں کے بہت سے ڈبے خرید لانے کو کہا۔ ملا بازار گیا اور کتوں کے کھانے کے بسکٹوں کی بھاری مقدار خرید لی۔ دکاندار نے اس سے پوچھا "یہ کیا کر رہے ہو؟ میرے علم کے مطابق تمہارا کتا چھوٹا ہے اور اسے اتنی بڑی مقدار میں بسکٹوں کی ضرورت نہیں ہو سکتی"

ملا نے جواب دیا "میں یہ بسکٹ کتے کے لیے نہیں بلکہ اپنی بیوی کیلئے خرید رہا ہوں"

دکاندار نے کہا "خبردار، یاد رکھو کہ یہ بسکٹ صرف کتوں کے لیے بنے ہیں۔ اگر تمہاری بیوی نے یہ بسکٹ کھا لیے تو مر جائے گی، یہ زہریلے بسکٹ ہیں" چھ ماہ کے بعد ملا کی بیوی مر گئی۔

ایک دن ملا نصر الدین دکاندار کے پاس گیا اور بولا "میری بیوی مر گئی ہے"

دکاندار نے جواب دیا "میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ بسکٹ تمہاری بیوی کو نقصان پہنچائیں گے"

نصر الدین نے کہا "وہ ان بسکٹوں کے باعث ہلاک نہیں ہوئی بلکہ کاروں کا پیچھا کرتے ہوئے مری ہے بسکٹ اس کی موت کا باعث نہیں بنے"

آپ کا ذہن اپنے ہی تخلیق کردہ نتائج سے چپک کر رہ جاتا ہے۔ جب نتیجہ گم ہو جاتا ہے تو اعتماد بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ جو بھی صورتحال ہو آپ اپنے نتائج سے چپکے رہتے ہیں۔ یہ آپ کو اپنی انا کیلئے بنیاد مہیا کرتے ہیں۔

ایک دن ملا نصر الدین بہت لمبی چھڑی کے سہارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ یہ چھڑی اس کیلئے بہت لمبی تھی۔ ایک دوست نے اسے کہا "نصر الدین! تم اس چھڑی کو نیچے سے چند انچ کاٹ کیوں نہیں لیتے؟ ملا نے جواب دیا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کا اوپر والا سرا بے حد لمبا ہے"

آپ کی عقلی توجیہ خودکشی کے مترادف ہو سکتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ معقولیت پر مبنی بات ہے، تاہم ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ خود کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ تاہم آپ اپنے قدم زمین پر جمے رہنے دینا چاہتے ہیں۔ آپ پر اعتماد رہنا چاہتے ہیں۔ ذہن کے ذریعے حاصل ہونے والا اعتماد غلط ہوتا ہے کیونکہ ذہن آپ کو اعتماد نہیں دے سکتا۔ یہ آپ کو صرف غلط چیزیں ہی دے سکتا ہے۔ یہ آپ کو صرف جھوٹی چیزیں ہی مہیا کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ حقائق نہیں بلکہ سائے وابستہ ہوتے ہیں۔ ذہن محض خیالات اور سایوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ٹھوس

شے نہیں پائی جاتی۔ تاہم یہ پر فریب توجیہات کرتا رہتا ہے اور آپ اچھا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ عیسائی اصل بات سمجھنے سے ہی محروم رہ گئے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ مسیحؑ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چناؤ کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ اگر آپ انتخاب کرتے ہیں تو ایسا ذہن تباہ ہونے کے بجائے مزید مضبوط ہوتا ہے۔ انتخاب کرنے والا ذہن اس عمل میں مضبوطی پا لیتا ہے۔ نہیں، یہ انتخاب کا سوال نہیں۔ انتخاب کے ذریعے آپ مکمل نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ کو کسی شے سے انکار بھی کرنا ہے۔

اگر آپ یقین کا انتخاب کرتے ہیں تو آپ کو شک سے انکار کرنا ہوگا۔ یہ شک کہاں جائے گا؟ یہ کوئی ظاہری شے نہیں ہے کہ آپ جب چاہیں اسے پھینک سکتے ہیں، یہ آپ کے اندر گہرائی میں موجود ہوتا ہے۔ یہ کہاں جائے گا؟ آپ بس اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہیں۔ بس یہی۔ آپ اسے اپنے شعور میں دبا سکتے ہیں۔ یہ وہیں ہوگا اور کسی نہ کسی دن دوبارہ سطح پر آ جائے گا۔ آپ کیا کر سکتے ہیں؟ آپ اسے کیسے ختم کر سکتے ہیں؟ اگر آپ شک کا انتخاب کرتے ہیں تو آپ کا یقین کہاں جائے گا؟ یہ آپ کی ذات کا حصہ ہے چنانچہ سمجھوتہ وقوع پذیر ہوگا۔ آپ بہت سی چیزوں کا مجموعہ بن جائیں گے۔ یہ مرکب نہیں بلکہ سمجھوتہ ہوگا۔

مسیحؑ نے اس سے بالکل برعکس بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "انتخاب مت کیجئے، آدمی کیلئے بیک وقت دو گھوڑوں پر سواری کرنا اور دو کمانیں تاننا ممکن نہیں ہے، نوکر کیلئے بیک وقت دو آقاؤں کی خدمت کرنا بھی ممکن نہیں، وگرنہ وہ ایک کی عزت کرے گا اور دوسرا اس سے ناراض ہو جائے گا"

آخری فقرے کو دیکھیں۔

"وگرنہ وہ ایک کی عزت کرے گا اور دوسرا اس سے ناراض ہو جائے گا"

ایسے میں ناراض اور خفا ہونے والا انتقام لے گا اور باغی میں تبدیل ہو جائے گا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ سائنس کا انحصار شبہات پر ہوتا ہے۔ اس میں صرف مفروضے اور شبہات ہوتے ہیں جبکہ اعتماد کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ تو کیا آپ نے سائنسدانوں کا مشاہدہ کیا ہے؟ وہ اپنی تجربہ گاہ سے باہر بے حد پر یقین ہوتے ہیں۔ آپ کو اعتماد کیلئے سائنس دانوں سے زیادہ بہتر لوگ نہیں ملیں گے۔ انہیں کسی بھی شخص کی نسبت کہیں زیادہ آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا شکوک والا حصہ تجربہ گاہ میں کام کرتا ہے جبکہ یقین والا حصہ تجربہ گاہ سے باہر روبہ عمل ہوتا

ہے۔ جہاں تک بیرونی دنیا کا تعلق ہے تو اس میں وہ سادہ دل واقع ہوتے ہیں جبکہ تجربہ گاہ میں وہ بے حد مکار اور چالاک نظر آتے ہیں۔ آپ سائنس دان کو باآسانی دھوکہ دے سکتے ہیں جبکہ نام نہاد مذہبی آدمی کو دھوکہ دینا اس قدر آسان نہیں ہوتا۔ عبادت گاہ میں یہ لوگ بے حد یقین کی کیفیت میں ہوتے ہیں جبکہ عبادت گاہ سے باہر ان پر مکارانہ روپ غالب آجاتا ہے۔ نام نہاد مذہبی لوگوں کو دیکھئے۔ آپ انہیں معبد سے باہر دھوکہ نہیں دے سکتے جبکہ معبد کے اندر جہاں دھوکہ دہی یا استحصال کی گنجائش نہیں ہوتی وہاں یہ لوگ بے حد سادہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنا یقین والا حصہ عبادت گاہ میں جبکہ شبے والا حصہ بیرونی دنیا میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اچھے تاجر کہلائے جانے کے قابل ہیں۔ وہ دولت جمع کرتے ہیں اور پوری دنیا کا استحصال کرتے ہیں۔

سائنسدان کبھی اچھا تاجر نہیں بن سکتا۔ وہ اچھا سیاستدان بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ شک والا حصہ تجربہ گاہ میں ختم ہوگیا ہے۔ بیرونی دنیا میں ان کا یقین اور اعتماد والا حصہ ہی کام کرتا ہے۔ گھر میں دکھائی دینے والا سائنسدان اس سائنسدان سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو تجربہ گاہ میں نظر آتا ہے۔ آپ نے ان کی غیر حاضر دماغی کے حوالے سے بہت سی کہانیاں سن رکھی ہوں گی۔ یہ حقیقی داستانیں ہیں، انہیں کہانیاں کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس دان اپنی توجہ تجربہ گاہ میں صرف کر دیتا ہے اس لیے تجربہ گاہ سے باہر وہ غیر متوجہ شخص بن جاتا ہے۔ وہ اپنا ایک حصہ ختم کر چکا ہے۔ چنانچہ وہ دہری زندگی بسر کر رہا ہے۔ تجربہ گاہ میں وہ بے حد حاضر دماغ ہوتا ہے جبکہ تجربہ گاہ سے باہر اس کا دماغ غیر حاضر ہوجاتا ہے۔

البرٹ آئن سٹائن ایک دوست سے ملنے اس کے گھر گیا۔ دونوں نے شام کا کھانا کھایا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ دونوں کے مابین زیادہ گفتگو نہ ہوئی کہ آئن سٹائن باتونی آدمی نہیں تھا۔ لہٰذا اس کا میزبان بوریت محسوس کرنے لگا۔ اسی دوران رات کے گیارہ بج گئے۔ دوست نے سوچا کہ اب آئن سٹائن کو اپنے گھر واپس چلے جانا چاہئے۔ تاہم آئن سٹائن سے جانے کو کہنا غیر مہذب حرکت ہوتی، چنانچہ میزبان انتظار کرتا رہا۔ اس دوران اس نے بعض اشارے بھی دیے کہ ''رات بے حد تاریک ہے'' اور ''اب ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں'' مگر آئن سٹائن بیٹھا رہا۔ اتنے میں بارہ بج گئے اور دوست کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ چنانچہ اس نے آئن سٹائن سے کہا ''میرا خیال ہے کہ آپ کو نیند آرہی ہے کیونکہ آپ جمائیاں لینے لگے ہیں'' یہ آخری اشارہ تھا۔

آئن سٹائن بولا ''ہاں، مجھے بیحد نیند آرہی ہے، مگر میں آپ کے رخصت ہونے کا منتظر ہوں تاکہ سوسکوں''

دوست نے حیران ہوکر کہا ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ میرے گھر میں ہیں''

آئن سٹائن اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ''معاف کیجئے گا، میں یہی سوچنے میں مصروف تھا کہ تم کب اپنے گھر واپس جاتے ہو تاکہ میں سوسکوں''

جہاں تک توجہ کا تعلق ہے تو تجربہ گاہ میں یہ شخص بیحد مکمل ہے، مگر اس کی توجہ والا حصہ خرچ ہو چکا ہے اور تجربہ گاہ سے باہر یہ بالکل متضاد رویے کا مالک ہوگا۔

نام نہاد مذہبی لوگوں کی زندگی میں تضاد دکھائی دے گا۔ یہ فطری امر ہے۔ عبادت گاہوں میں انہیں عبادت کرتا دیکھیں اور ان کے چہروں پر غور کریں۔ وہ بے حد معصوم نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھیں گہرے جذبات سے معمور دکھائی دیتی ہیں۔ ان سے آنسو بہتے ہیں۔ آپ عبادت گاہوں سے باہر ایسے شخص کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عبادت گاہوں سے باہر وہ کیسا دکھائی دے گا؟ وہ اپنی دکان میں کیسا ہوگا؟ جب آپ اس کی دکان پر جائیں گے تو وہ آپ سے کس طرح پیش آئے گا؟ اس کا جذباتی اور یقین والا حصہ مندر، مسجد اور گرجا گھر میں ختم ہوگیا ہے۔ جب وہ عبادت گاہ سے باہر آتا ہے تو اس حصے سے آزاد ہوچکا ہوتا ہے۔ تب وہ تجربہ گاہ میں بیٹھے سائنسدان کی طرح شبہات کا اظہار کرنا شروع کر دیتا ہے اور جس قدر ممکن ہو متشکک ہوجاتا ہے۔

یوں ہم دہری زندگی جیتے ہیں، یہ سمجھوتہ ہے۔ مسیح یہ نہیں کہہ رہے کہ ''ایک کے خلاف دوسرے کا انتخاب کرلو'' اگر آپ ایک کو چھوڑ کر دوسرا منتخب کرلیں گے تو چھوڑا جانے والا حصہ افسردہ ہوجائے گا اور آپ سے انتقام لے گا۔ یہ بے حد مشکلات پیدا کرتا ہے اور جینا ناممکن بنا دیتا ہے۔ آپ ایک حصے کے ساتھ جینے کی جس قدر کوشش کرتے ہیں دوسرا حصہ اسی قدر شدت سے آپ کی تمام تر منصوبہ بندی کو خراب کر دیتا ہے۔ ایسا بار بار ہوتا ہے، تو پھر کیا ہونا چاہئے؟

راستہ یا کرنے والا کام ''انتخاب'' ہرگز نہیں ہے۔ اصل بات اور کرنے والا کام اپنی ہستی کے تضادات کی پہچان ہے۔ انتخاب مت کیجئے بلکہ خود کو انتخاب سے محروم کر لیجئے۔ ایک کو دوسرے کے خلاف مت چھوڑیں کیونکہ آپ کسی شے کے ایک پہلو کو ترک نہیں کر سکتے۔ آپ کے پاس ایک روپیہ ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ آپ ایک پہلو کو چھوڑ نہیں سکتے۔ آپ اس کی ایک سمت کو ختم نہیں

کر سکتے۔ ہوسکتا ہے آپ کو سکے کا ایک رخ پسند نہ ہو مگر آپ کو دونوں رخ ساتھ رکھنا پڑتے ہیں۔ اگر آپ ایک رخ کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں تو دوسرے کو بھی ساتھ لینا ہوگا تبھی پورا سکہ آپ کے پاس ہوگا۔ آپ اس حوالے سے صرف یہی کر سکتے ہیں کہ سکے کا جو پہلو آپ کو پسند نہیں اسے چھپالیں اور اپنا پسندیدہ رخ سامنے کرلیں۔ اسی بنا پر شعور اور لاشعور تخلیق کیے گئے ہیں۔

شعور پہلا حصہ اور وہ گھوڑا ہے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ تحت الشعور یا لاشعور دوسرا حصہ اور وہ گھوڑا ہے جسے آپ پسند نہیں کرتے۔ شعور وہ ہے جس کو آپ نے منتخب کیا ہے جبکہ لاشعور وہ ہے جس کے خلاف آپ نے اسے منتخب کیا ہے۔ یہ دو گرجا گھر ہیں، ایک میں آپ جاتے ہیں اور دوسرے میں نہیں جاتے۔ بصورت دیگر بدھا جیسے انسان میں شعور اور لاشعور دونوں غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ اس نے انتخاب نہیں کیا۔ اس نے کسی کیخلاف کسی کو منتخب نہیں کیا۔ پورا سکہ ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ صرف پورا سکہ ہی چھوڑا جاسکتا ہے۔ آدھا سکہ کبھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔

شک اور یقین ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں جیسا کہ گرم اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں مگر وہ اکٹھے ہیں۔ مجموعی طور پر ان میں بعد المشرقین ہے جیسا کہ منفی اور مثبت کرنٹ ہوتے ہیں اور جیسا کہ مرد اور عورت میں بعد المشرقین ہے۔ اگرچہ دونوں متضاد دکھائی دیتے ہیں مگر ایک ہی مظہر کے دو قطب ہیں۔ آپ مثبت کرنٹ کو ختم کیے بغیر منفی کو ختم نہیں کر سکتے۔ آپ ایک کو برقرار رکھ کر دوسرے کو ختم نہیں کر سکتے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کا وجود ختم ہو جائے گا۔ چھوڑا جانے والا، دبایا ہوا اور مسترد شدہ حصہ لاشعور بن جائے گا جبکہ قبول کیا جانیوالا حصہ شعور میں تبدیل ہو جائے گا۔ ایسے میں شعور اور لاشعور کے مابین نہ ختم ہونے والی جدوجہد شروع ہو جائے گی۔

تاہم آپ ابھی تک دو گھوڑوں پر سوار ہیں۔ سب کچھ ترک کر دینا ہی واحد راستہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ترک کرنے سے بات نہیں بنے گی کیونکہ ترک کرنا بھی ایک طرح سے انتخاب بن جاتا ہے۔ یہ سب سے پیچیدہ اور لطیف بات ہے۔ آپ چھوڑ سکتے ہیں تاہم یہ نہ چھوڑنے کے مقابلے میں چھوڑنے کو منتخب کرنا کہلائے گا۔ ایسے میں آپ ایک مرتبہ پھر دو گھوڑوں پر سوار ہو جائیں گے۔ نہیں، اسے سمجھ بوجھ کے ذریعے ہونا چاہئے، ترک کرنا کچھ نہیں ہوتا، سمجھنا ہی سب کچھ ہے، ایسا کر کے ہی آپ کسی شے کو ترک کر سکتے ہیں۔

تمام تر پاگل پن کو سمجھنا چاہئے۔ آپ نے اپنے ساتھ کیا کیا ہے؟ آپ نے اپنے ساتھ کیا ہونے دیا ہے؟ آپ کس قسم کے تضادات پالتے رہے ہیں۔ بس تمام صورتحال کو دیکھنے کی کوشش کریں۔ کسی شے کی حمایت یا مخالفت مت کریں۔ مذمت کریں نہ رائے قائم کریں۔ تمام صورتحال کا باریک بینی سے جائزہ لیں۔ کچھ بھی چھپانے یا رائے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تجزیہ مت کریں کہ فلاں شے اچھی اور فلاں بری ہے۔ منصف کے بجائے مشاہدہ کار بنیں۔ صورتحال کو اپنی ذات سے الگ کر کے گواہ کے طور پر دیکھیں۔ یہ دیکھیں کہ آپ کیا ہیں، آپ جو کچھ بھی ہیں اور جس افراتفری کے عالم میں بھی ہیں اس کا مشاہدہ کریں۔

اچانک ایک ایسی سمجھ بوجھ اور آگہی ابھرتی ہے جو مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ دیوار میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہوں اور اچانک آپ کو احساس ہو کہ یہ تو دیوار ہے اور جہاں میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں وہاں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ کیا یہ احساس ہونے پر آپ اپنی کوشش ترک کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے؟ یقیناً آپ عمل کریں گے۔ یہ سادہ حرکت ہوگی، یہ کسی کے حق یا مخالفت میں نہیں ہوگی، آپ کے ذہن میں بس یہی بات آئے گی کہ دیوار میں داخلے کی کوشش بیکار اور ناممکن عمل ہے۔ مسیحؑ کے کہنے کا یہی مطلب ہے۔ آپ دیکھتے ہیں، آپ کو یہ کام ناممکن لگتا ہے اور آپ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس میں ذہن کو کسی قسم کا انتخاب نہیں کرنا پڑتا اور آپ کسی قسم کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔

جہاں معاملہ سمجھ میں آجائے وہاں کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جب بھی کوئی عمل کوشش کے بغیر انجام پاتا ہے تو وہ خوبصورت ہوتا ہے کیونکہ یہ مکمل ہوتا ہے۔ جہاں کوشش ہوتی ہے وہاں بدصورتی دیکھنے کو ملتی ہے کیونکہ یہ کل کے بجائے محض ایک جزو ہوتا ہے۔ کوشش کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کسی کیخلاف لڑ رہے ہیں۔ مگر آپ لڑتے کیوں ہیں؟ اس لیے کہ آپ جس شے کے لیے لڑ رہے ہیں وہ آپ کے لیے بدستور اہمیت کی حامل ہے۔ دوست کی طرح دشمن کی بھی اہمیت ہے۔ اگرچہ یہ منفی اہمیت ہے تاہم اہمیت تو ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ جب دشمن مرتا ہے تو فوری طور پر آپ کے اندر بھی کوئی چیز مرجاتی ہے۔ آپ کو محض اپنے دوستوں کی موت سے ہی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ آپ اپنے دشمنوں کی موت کے باعث بھی گھاٹے میں رہتے ہیں۔ آپ یکساں نہیں ہوسکتے۔

ہندوستان میں ایسا ہی ہوا۔ محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی ایک دوسرے کے مستقل حریف تھے۔ گاندھی کو قتل کر دیا گیا، کہتے ہیں کہ اس موقع پر جناح کا کہنا تھا کہ ''مجھے بے حد افسوس ہوا، میرے اندر کوئی شے مرگئی ہے'' اب جناح کس کے خلاف جدوجہد کرے گا؟ اب وہ کس کے خلاف جنگجو کے طور پر سامنے آئے گا؟ اب وہ کس کا چیلنج قبول کرے گا؟ اگر دشمن نہ ہو تو انا ختم ہو جاتی ہے۔ آپ اپنے دوستوں اور دشمنوں سے بنے ہیں۔ آپ سراپاء تضاد ہیں۔

مکمل وہ ہے جس کا کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ جس نے انتخاب ہی نہیں کیا اور جس کا کسی جانب میلان ہی نہیں۔ مکمل وہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ اور انتخاب سے ماورا آگہی کے ساتھ عمل کرتا ہے اور زندگی جو کچھ عطا کرتی ہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ وہ پانی کی سطح پر خود بخود تیرتا ہے اور تیراکوں کی طرح دانستہ ہاتھ پاؤں نہیں چلاتا۔ وہ جنگجو نہیں ہے۔ اگر آپ یہ بات سمجھ سکتے ہیں تو پھر مسیح کے قول کا مفہوم بھی پا سکتے ہیں۔

''آدمی کیلئے بیک وقت دو گھوڑوں کی سواری اور بیک وقت دو کمانیں تاننا ممکن نہیں اور ایک نوکر بیک وقت دو آقاؤں کو راضی نہیں رکھ سکتا، اگر وہ ایسا کرے گا تو ایک کو خوش اور دوسرے کو ناراض کر دے گا''

اس قول کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ ''ایک آقا منتخب کریں اور دو آقاؤں کی خدمت مت کریں'' انتخاب کے ذریعے آپ کبھی مکمل نہیں ہو پائیں گے چنانچہ یہ ایک کے مقابلے میں دوسرا آقا منتخب کرنے کا معاملہ نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں آپ بدستور غلام ہی رہیں گے، آپ آزاد نہیں ہو سکتے۔ ماورائے انتخاب ہی آپ کو آزادی دلا سکتا ہے۔ ایسے میں آپ کوئی شے منتخب کرنے کے بجائے تمام تر کوشش ترک کر دیتے ہیں۔ جب آپ سمجھ جاتے ہیں تو یہ خود بخود ترک ہو جاتی ہے۔ ایسے میں آپ خود آقا بن جاتے ہیں۔

ہندوستان میں سنیاسیوں کو ''سوامی'' کہا جاتا ہے۔ سوامی کا مطلب اپنی ذات کا مالک ہونا ہے۔ سوامی وہ شخص ہوتا ہے جو انتخاب ترک کر دیتا ہے۔ اب اس کا مطلب آقا قبول نہ کرنا ہے۔ یہ انا پرمبنی بات نہیں بلکہ گہری سمجھ بوجھ کا معاملہ ہے کہ اگر آپ تضادات کے درمیان انتخاب کریں گے تو پھر بدستور تضادات کے درمیان تقسیم رہیں گے۔ سنیاسی دنیا کے حق میں ہوتا ہے نہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ دوستوں اور دشمنوں کے بغیر رہتا ہے۔

ایک سنیاسی علی الصبح پہاڑی پر تنہا کھڑا تھا۔ پہاڑی کی طرح وہ بھی اکیلا تھا اور ساکت کھڑا تھا۔ اس دوران تین افراد وہاں سے گزرے۔ وہ صبح کی سیر کیلئے پہاڑی پر آئے تھے۔ انہوں نے سنیاسی کو پہاڑی پر ساکت وجامد کھڑے دیکھا تو اپنے اپنے ذہن کے مطابق رائے کا اظہار کیا۔ ایک شخص کہنے لگا ''میں اس راہب کو جانتا ہوں، بعض اوقات اس کی گائے گم ہو جاتی ہے اور یہ پہاڑی پر کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تاکہ اپنی گائے کو ڈھونڈ سکے''

دوسرا شخص بولا ''مگر وہ جس طرح کھڑا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی شے کو نہیں دیکھ رہا۔ وہ حرکت بھی نہیں کر رہا اور اس کی آنکھیں بھی ساکت ہیں۔ کسی شے کو ڈھونڈنے کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ہماری طرح یہ بھی کسی دوست کے ساتھ صبح کی سیر کو آیا ہے اور اس کا دوست پیچھے رہ گیا ہے۔ اب یہ یہاں کھڑا اپنے دوست کا منتظر ہے''

تیسرے آدمی نے کہا ''مجھے تو یہ وجہ بھی معقول نہیں لگتی۔ جب کسی کو کسی کا انتظار کرنا ہو تو وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا ہے کہ آیا دوست پہنچ گیا ہے یا نہیں۔ وہ انتظار نہیں کر رہا، منتظر شخص کا یہ انداز نہیں ہوتا، میرا خیال ہے کہ وہ مراقبے میں مصروف ہے''

یہ تینوں اشخاص سنیاسی کے بارے میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف آراء رکھتے تھے اور اس کے یوں کھڑا ہونے کی وجہ جاننے کے متمنی تھے، چنانچہ انہوں نے سوچا کہ سنیاسی کے پاس جا کر پوچھنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اگرچہ پہاڑی پر چڑھنا آسان نہیں تھا مگر وہ وہاں پہنچ ہی گئے جہاں سنیاسی ساکت کھڑا تھا۔ پہلے آدمی نے اس سے پوچھا ''کیا تم اپنی گائے کو ڈھونڈ رہے ہو؟ میں جانتا ہوں کہ بعض اوقات یہ گم ہو جاتی ہے اور تمہیں اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے'' سنیاسی نے آنکھیں کھولیں اور جواب دیا ''میرے پاس کوئی شے نہیں ہے لہٰذا کھونے یا گم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔

دوسرا شخص بولا ''تو پھر میرا اندازہ ہی درست ہے۔ تم اپنے دوست کا انتظار کر رہے ہو جو پیچھے آ رہا ہے''

سنیاسی نے آنکھیں کھولیں اور بولا ''میرا کوئی دشمن ہے نہ دوست۔ ایسے میں مجھے کس کا انتظار ہو سکتا ہے؟ میں اکیلا ہوں اور میں نے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا۔ میں بالکل اکیلا ہوں''

اب تیسرا آدمی کہنے لگا ''تو پھر میری بات ہی ٹھیک ہوگی کیونکہ اور کوئی امکان ہی نہیں، مجھے

امید ہے کہ تم استغراق کی حالت میں یہاں کھڑے ہو"

سنیاسی ہنسا اور جواب دیا "تم سب سے بڑے احمق ہو کیونکہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کے سامنے دعا کی جائے اور میرا کوئی مقصد بھی نہیں کہ جس کے حصول کیلئے دعا مانگی جائے لہٰذا میں کیسے مراقبہ کر سکتا ہوں؟"

اب تینوں دوست بیک زبان بولے "تو پھر تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

سنیاسی نے جواب دیا "میں یہاں محض کھڑا ہوں اور کچھ نہیں کر رہا"

تاہم مراقبہ اور سنیاس اسی حالت کا نام ہے۔ آپ آزاد ہیں۔ آپ دوستوں، دشمنوں، ملکیت اور عوام سے آزاد ہیں۔ آپ اس اور اُس دنیا سے آزاد ہیں۔ مادے اور ذہن نیز ہر قسم کے انتخاب و تقسیم سے بھی آزاد ہیں۔ ایسے میں ناممکن ختم ہو جاتا ہے اور آپ فطری بن جاتے ہیں۔ آپ تاؤ بن جاتے ہیں اور تیرنے لگتے ہیں۔

جب ناممکن کے حصول کی کوشش ترک کر دی جاتی ہے تو اندیشے غائب ہو جاتے ہیں اور آپ کی اذیت ختم ہو جاتی ہے۔ جب اذیت نہیں رہتی تو سعادت پیدا ہونے لگتی ہے۔ برکت اور خوشی ایسی چیزیں نہیں کہ ان کے لیے باقاعدہ کوشش کی جائے۔ آپ کو صرف ان کے حصول کی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔ جب آپ اذیت سے آزاد ہو جاتے ہیں تو خوشی ملتی ہے۔ اب آپ صلاحیت پیدا کر چکے ہیں۔ آپ نے دروازہ کھول دیا ہے، سورج کی کرنیں اندر آتی ہیں اور آپ کو معمور کر دیتی ہیں۔ جب آپ اذیت کا شکار، منقسم، دو گھوڑوں پر سوار، عصبی بدنظمی کا شکار اور بیک وقت دو کمانیں تانیں ہوئے ہوتے ہیں تو گویا بیماری اور کپکپاہٹ کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو آپ کا ذہن بے ترتیب ہو جاتا ہے۔

ایک عام انسان کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہوتا ہے اور اسے اعصابی بدنظمی کا سامنا نہیں ہوتا۔ ایک باترتیب آدمی اگرچہ ٹھیک ہوتا ہے مگر اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ باترتیب اور اچھے شہری نیز معیاری و مثالی انسان ہیں تو بھی آپ کو کسی قسم کی خوشی اور وجد کی کیفیت نہیں ملے گی اور آپ بدستور اداس رہیں گے۔ آپ اس دنیا میں جو کچھ بھی پا لیں آپ کو الٹا مزید اداسی ملے گی۔ کامیاب لوگوں کو دیکھیں جو آپ سے آگے ہیں، جو بلند مقام پر پہنچتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ ناکام لوگوں کی نسبت زیادہ اداس رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی امید باقی نہیں رہتی۔

ایک صبح ملا نصر الدین اداسی کے عالم میں بازار کو جا رہا تھا۔ راہ میں ایک دوست مل گیا جس نے ملا سے پوچھا "ارے بھائی تم اداس کیوں ہو؟ کیا ہوا ہے؟"

نصر الدین نے جواب دیا "کچھ مت پوچھو، میں بے حد غمگین ہوں اور اس قدر دلبرداشتہ ہوں کہ کسی بھی وقت رو پڑوں گا"

دوست نے اصرار کرتے ہوئے کہا "مگر معاملہ کیا ہے؟ ہم نے اس سے قبل تمہیں کبھی یوں اداس نہیں دیکھا۔ تمہیں بہت سے مسائل اور مالی مشکلات درپیش رہی ہیں مگر تم کبھی اس قدر دلبرداشتہ دکھائی نہیں دیے۔ معاملہ کیا ہے؟"

ملا نے جواب دیا "دو ہفتے قبل میرا ایک چچا وفات پا گیا، اس نے میرے لیے وراثت میں ایک لاکھ روپے چھوڑے تھے"

دوست بولا "نصر الدین! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ اگر تمہارے چچا نے تمہارے لیے لاکھ روپے چھوڑے ہیں تو تمہیں اداس ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہئے"

ملا نصر الدین نے کہا "ہاں ایسا ہی ہونا چاہئے مگر گزشتہ ہفتے میرا دوسرا چچا بھی وفات پا گیا اور اس نے میرے لیے دو لاکھ روپے چھوڑے ہیں"

دوست کہنے لگا "یوں لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تمہیں تو خوشی سے ناچنا گانا چاہئے، ناخوش ہونے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں۔ تم تو قصبے کے سب سے زیادہ خوش قسمت شخص بن گئے ہو"

نصر الدین نے جواب دیا "میں جانتا ہوں، مگر میں اس بات پر اداس ہوں کہ اب میرا اور کوئی چچا نہیں بچا"

جب کسی شخص کو کامیابی ملتی ہے تو اس کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ جب آپکے چچا باقی نہ رہیں تو تمام امیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔ ناکام آدمی کے پاس کچھ نہ کچھ امید ضرور باقی ہوتی ہے۔ اس کے بعض چچا زندہ ہوتے ہیں، اس کے لیے امکانات کے کچھ در ضرور وا ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ کامیابی زیادہ اندیشے لاتی ہے۔ کامیابی اعصاب چٹخا دیتی ہے اور فکر و عمل میں تضاد کو نمایاں کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا میں فکر و عمل کے تضاد کی بیماری میں مبتلا لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ وہاں کسی بھی ملک سے زیادہ تعداد میں پاگل پائے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا نے مختلف حوالوں سے دنیا کے دیگر ممالک کی نسبت کہیں زیادہ کامیابی حاصل کر رکھی ہے۔

غریب ملکوں میں ایسا پاگل پن دیکھنے کو نہیں ملتا۔ وہاں لوگوں کے دل میں امید کی شمع بدستور روشن ہوتی ہے۔ جب آپ امید قائم رکھتے ہیں تو بھاگے چلے جاتے ہیں۔ جب مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر آپ ٹھہر جاتے ہیں اور اپنے آپ کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ہستی کو کس قدر بے ترتیب کر ڈالا ہے۔ ایسے میں آپ کا دماغ چل جاتا ہے۔ آپ کا دماغ ہمیشہ سے خراب رہا ہوتا ہے۔ مگر آپ کو اس وقت ہی آگہی حاصل ہوتی ہے جب آپ کامیابی کی دہلیز پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خواب باقی نہیں رہتے تو آپ کو اپنی ہی ذات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کی جو حالت ہے اس کے ہوتے ہوئے خوشی اور سعادت کا حصول ناممکن ہے۔ آپ کو خوشی نہیں مل سکتی۔ آپ صرف خوشی کی امید کر سکتے ہیں اور یہ تکلیف برداشت کر سکتے ہیں جو آپ اپنے لیے کما چکے ہیں۔

تاہم خوشی کا حصول ممکن ہے۔ یہ بدھا اور مسیحؑ کو حاصل ہو چکی ہے، یہ آپ کو بھی مل سکتی ہے تاہم اس کیلئے آپ کو ناممکن کو ایک جانب رکھ دینا ہوگا۔ فطری، ممکن اور آسان کے بارے میں سوچیں۔ ناممکن، مشکل اور ہمت طلب کے بارے میں مت سوچیں۔ انا ہمیشہ ناممکن کو انجام دینا پسند کرتی ہے۔ یہ ناکامی ہے۔ اسے ناکامی ہی بننا ہے۔ مگر انا ناممکن کا چیلنج قبول کرنا پسند کرتی ہے کیونکہ اس طرح آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑی شے ہیں۔ ناممکن مقصد کے مقابل آپ عظیم جنگجو بن جاتے ہیں۔

مذہب سادہ، آسان اور فطری ہے۔ یہ گھوڑے کی سواری نہیں ہے۔ یہ صبح کی سیر ہے اور اس کا مقصد ہمیں کسی خاص مقام کی طرف لے جانا ہرگز نہیں۔ محض چہل قدمی ہی اختتام ہے۔ یہ بطور خاص کچھ کرنا نہیں بلکہ صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہونے، سورج کی تمازت محسوس کرنے اور پرندوں کو چہچہاتا دیکھنے کا نام ہے۔ یہ اپنے آپ میں مزے کرنے کا نام ہے۔

☆☆☆

مسیحؑ نے کہا

''اونچے پہاڑ پر بنا شہر مستحکم ہوتا ہے جو گر سکتا ہے نہ کبھی چھپ سکتا ہے''

مسیحؑ نے کہا

''تم نے مجھ سے جو کچھ سنا اسے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر دوسروں تک پہنچا دو، کوئی شخص چراغ جلا کر اسے برتن تلے دھرتا ہے نہ چھپا کر رکھتا ہے بلکہ وہ اسے نمایاں جگہ پر رکھتا ہے تاکہ ہر آنے جانے والا اس کی روشنی سے مستفید ہو سکے''

مسیحؑ نے کہا

''اگر اندھا اندھے کی رہنمائی کرے تو دونوں گڑھے میں گر جاتے ہیں''

چوتھا باب

آپ ہی اپنا ہدف ہیں

تمام تر انسانی مسئلہ عارضی اور ابدی کے مابین انتخاب پر مبنی ہے۔ اگر آپ عارضی شے کو منتخب کرتے ہیں تو گویا ریت پر گھر تعمیر کرتے ہیں جس نے ڈھے جانا ہے۔ اس کے بجائے اگر آپ ابدی چیز منتخب کرتے ہیں تو پائیدار اور ہمیشہ باقی رہنے والی شے کے مالک بن جاتے ہیں۔

صرف ابدی شے ہی آپ کو مطمئن کر سکتی ہے، ابدی سے کم کوئی چیز باعث اطمینان نہیں ہوتی۔ عارضی اور ناپائیدار بات آپ کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس یہ آپ کو مزید بھوکا اور پیاسا بنا دے گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مکھن کو آگ میں پھینکے تاکہ بعد میں اسے گرم حالت میں باہر نکال کر کھا سکے۔ آگ مکھن کو اپنی خوراک بنا لے گی اور مزید تیزی سے بھڑکنے لگے گی۔ عارضی کی مثال آپ کے ذہن کی آگ میں جلتے مکھن کی سی ہے۔ یہ اسے مزید بھڑکانے میں مدد دیتا ہے اور اس کی خوراک بن جاتا ہے۔ صرف ابدی ہی پیاس بجھا سکتی ہے اور اس کے سوا کوئی طریقہ موجود نہیں ہے۔

مگر جب میں یہ کہتا ہوں کہ ''اگر آپ ابدی کا انتخاب کرتے ہیں تو اسی صورت میں پہاڑی کی چوٹی پر گھر تعمیر کر سکتے ہیں جو کہ پائیدار ہوگا اور آپ کی محنت ضائع نہیں جائے گی'' تو میرے اس قول کا کیا مطلب ہوتا ہے کہ ''اگر آپ ابدی کا انتخاب کرتے ہیں''؟ حالانکہ ابدی کو منتخب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ منتخب کریں گے تو صرف عارضی کو منتخب کریں گے۔ انتخاب ہمیشہ عارضی شے کے لیے ہوتا ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ''ابدی کو منتخب کریں'' تو میرا کیا مطلب ہوتا ہے؟ میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''اگر آپ یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ عارضی بیکار ہے تو عارضی ختم ہو جاتا ہے

اور بیکار حیثیت اختیار کر جاتا ہے جبکہ آپ اس کی بے معنویت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ عارضی ختم ہو جاتا ہے اور ابدی خود بخود منتخب ہو جاتا ہے۔ آپ خود اسے منتخب نہیں کرتے۔

جب عارضی ختم ہوتا ہے تو ابدی آپ کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر عارضی بہر صورت بے معنی اور مطلق بے ثمر ہوتا ہے۔ عارضی کی موجودگی میں آپ کی ناکامی مجموعی ہوتی ہے۔ ''وہ بابرکت ہیں جو اس دنیا میں ناکام رہتے ہیں'' مسیحؑ کی دیگر بشارتوں کے ساتھ اس بشارت کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔

اس دنیا میں ناکام رہو۔ آپ محض متضاد کے حصول کیلئے کوشاں ہیں، آپ اس میں کامیابی چاہتے ہیں۔ اگر آپ کامیاب ہو گئے تو یہ حقیقی ناکامی ہو گی کیونکہ ایسی صورتحال میں آپ ہمیشہ عارضی میں ہی رہیں گے تاہم کوئی بھی کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ کوئی بھی کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ ناکامی کو ملتوی کر دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ آپ اسے ایک اور زندگی تک ملتوی کر سکتے ہیں۔ آپ اسے لاکھوں زندگیوں تک ملتوی کر سکتے ہیں مگر اس دنیا میں کوئی کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ آپ عارضی کے ساتھ کیونکر کامیابی پا سکتے ہیں جو کہ گزر راں ہے؟ آپ اس پر گھر کیسے تعمیر کر سکتے ہیں۔ جو شے لمحہ بہ لمحہ ختم ہو رہی ہو اور جس کا وجود مٹ رہا ہو اس میں رہائش کیونکر رکھی جا سکتی ہے؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مکان تیار ہو جائے گا مگر لمحہ گزر چکا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہر لمحے مایوس کا شکار رہتے ہیں مگر دوبارہ وہی کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

یوں لگتا ہے کہ آپ آگاہ نہیں ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ آپ مستعد نہیں ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس کے بارے میں واضح سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے زندگی سے کچھ نہیں سیکھا۔ آپ زندگی کے حوالے سے غافل ہیں، آپ نے کوئی تجربہ نہیں پایا۔ ہوسکتا ہے آپ کے پاس بے پناہ علم ہو، ممکن ہے کہ آپ مکان کی تعمیر کے حوالے سے ہر بات جانتے ہوں، آپ انجینئر اور ماہر تعمیرات بھی ہو سکتے ہیں مگر آپ نے تجربے سے کچھ نہیں سیکھا اور یہ بات نہیں جانتے کہ عارضی پر گھر تعمیر نہیں ہو سکتا۔ مسیحؑ نے یہی بات سب سے پہلے کہی ہے۔

مسیحؑ نے کہا ''اونچے پہاڑ پر بنا گھر مستحکم ہوتا ہے، وہ گر سکتا ہے نہ چھپ سکتا ہے'' بہت سی چیزیں۔ سب سے پہلے ''ایک شہر...... اونچے پہاڑ پر تعمیر شدہ''

آپ ہمیشہ وادی میں ہی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ علامتیں ہیں، وادی کا مطلب تاریک رات ہوتا ہے جبکہ اونچائی سے مراد آگاہی ہے۔ آپ جس قدر زیادہ آگاہ ہوں گے اسی قدر اونچائی پر جائیں گے۔ جب آپ مکمل طور سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو ایورسٹ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ شیوا سب سے اونچے پہاڑ ''گوری شنکر'' پر رہتا ہے۔ شیوا اعلیٰ ترین شعور کا نام ہے۔ شیوا کسی ہستی کا نام نہیں بلکہ مکمل شعور کا نام ہے۔ مکمل شعور ''گوری شنکر''، یعنی اونچے ترین پہاڑ پر ہوتا ہے۔

جب آپ آگاہ نہیں ہوتے تو تاریک وادی میں جا گرتے ہیں۔ آپ کی رات ''وادی'' ہے، آپ کی نیند بھی وادی ہے۔ جب آپ آگاہ ہوتے ہیں تو اونچائی کی طرف جانا شروع کر دیتے ہیں، اس کے بجائے مکمل طور سے بے خبر ہونا زندگی کا پست ترین مقام ہے۔ پہاڑی کے نچلے حصے میں چٹانیں ہوتی ہیں۔ چٹانیں مکمل طور سے بے خبر ہوتی ہیں۔ وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہوتی ہیں، وہ بڑھتی ہیں، جوان ہوتی ہیں، بوڑھی ہو جاتی ہیں اور پھر مر جاتی ہیں۔ وہ ان تمام ادوار سے گزرتی ہیں جن سے آپ بھی گزرتے ہیں، مگر وہ آگاہ نہیں ہوتیں۔ ڈھلان کا سب سے نچلا حصہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار آپ چٹان جیسے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ سوتے ہیں تو ایسے میں آپ اور پتھر کے مابین کیا فرق ہوتا ہے؟ جب آپ میں شعور کی کوئی رمق نہ ہو تو آپ میں اور مردہ زمین میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ آپ گویا پیچھے گر جاتے ہیں۔

نیند کی حالت میں آپ وادی کی جانب جاتے ہیں۔ گناہگار وہ ہے جو مسلسل نیند کی حالت میں رہتا ہے۔ پارساوہ ہوتا ہے جو حالت نیند میں بھی نہیں سوتا۔ کرشنا نے ارجن سے کہا تھا کہ ''جب ہر شخص سو رہا ہوتا ہے تو یوگی جاگ رہا ہوتا ہے، جب ہر شخص محو خواب ہوتا ہے تو یوگی بدستور مستعد ہوتا ہے'' یوگی کی مجموعیت کبھی نہیں سوتی۔ اس کے شعور کا ایک نکتہ بدستور بیدار ہوتا ہے۔ وہ اپنی نیند کا بھی مشاہدہ کرتا ہے۔ نیند کی حالت میں آپ گر جاتے ہیں جبکہ آگاہی میں اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ جب آپ کے اندر سب کچھ بیدار ہوتا ہے، جب آپ کا تمام تر شعور روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے، جب آپ کا کوئی بھی حصہ بے خبر نہیں ہوتا اور جب آپ کا تمام تر وجود روشنی سے منور ہوتا ہے تو اس حالت کو ''بدھا'' یا ''مسیحؑ'' کہتے ہیں۔ ایسے میں بے خبری کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ اعلیٰ اور اونچا ترین مقام ہوتا ہے۔ اسی حالت کو اونچے پہاڑ پر تعمیر کردہ گھر قرار دیا گیا ہے۔

آپ اپنے گھر مکانات اور وادیوں میں تعمیر کر رہے ہیں۔ آپ تو عام نیند بھی نہیں چاہتے بلکہ آپ کو مزید نیند کیلئے خواب آور ادویات درکار ہیں۔ آپ تنویم کے طریقے تلاش کرتے ہیں تا کہ مزید سو سکیں اور مزید بے خبر ہو سکیں کیونکہ شعور تکلیف کا نام ہے۔ یہ اذیت جیسا ہوتا ہے۔ یہ اذیت کیوں ہے؟ جبکہ بدھا اور مسیحؑ اسے ممکنہ ترین عظیم سعادت کہتے ہیں۔ تو پھر شعور تکلیف کیوں ہوا؟ آپ سب کچھ بھلا کیوں دینا چاہتے ہیں؟ شعور تکلیف دہ کیوں ہوتا ہے؟

اگر آپ ایک فیصد بیدار اور ننانوے فیصد خفتہ ہوں تو یہ تکلیف دہ کہلائے گا۔ ایسے میں آپ کے شعور کا ایک فیصد بیدار حصہ اپنے اردگرد افراتفری دیکھ کر پریشان ہوتا ہے اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ننانوے فیصد کو پاگل پن کی حالت میں دیکھ کر بقیہ ایک فیصد شعور خود تنویمی کی کیفیت پیدا کرنے کیلئے شراب، نشہ آور ادویات، چرس، فحاشی، موسیقی یا مذہبی منتروں کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح یہ ایک فیصد شعور بھی ہتھیار ڈال دیتا ہے اور کُل میں جذب ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آپ کو تشویش نہیں ہوتی کیونکہ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہو پاتا۔ ایسے میں کوئی مستعد اور باخبر نہیں ہوتا اور کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا۔

اسے شتر مرغ کی منطق کہا جاتا ہے۔ شتر مرغ کو خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے۔ اس لمحے وہ خود کو درپیش خطرے کو نہیں دیکھ پاتا۔ اس کی منطق یہ ہوتی ہے کہ ''جب مجھے کوئی خطرہ دکھائی نہیں دے رہا تو اس کا وجود کیونکر ممکن ہے؟'' شتر مرغ مکمل لادین معلوم ہوتا ہے۔ شتر مرغ کی طرح لادین لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ ''اگر ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے تو پھر اس کا وجود کیونکر ممکن ہے؟ جب ہم دیکھتے ہیں تو تبھی کسی شے کا وجود ممکن ہو سکتا ہے'' یہ ایسا ہی ہے جیسے سب کچھ آپ کے دیکھنے پر منحصر ہو۔ اگر آپ نہیں دیکھیں گے تو چیزیں غائب ہو جائیں گی۔

شتر مرغ اپنا سر ریت میں دبا لیتا ہے۔ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور بے خوف ہو جاتا ہے کہ اب دشمن اسے نہیں دیکھ پائے گا۔ مگر دشمن آپ کی منطق پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس آپ اپنی آنکھیں بند کر کے اس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ آپ دشمن کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں اور خود اس کا شکار بن رہے ہیں۔ آپ بچ سکتے تھے مگر اب بچنا ممکن نہیں رہا کہ آپ کی نظر میں دشمن سامنے نہیں ہے۔ آپ کو عارضی خوشی محسوس ہو سکتی ہے کیونکہ دشمن وہاں نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ دشمن موجود نہیں ہے، حقیقت میں وہ موجود ہے مگر اس لمحے آپ کو اس کی موجودگی محسوس

نہیں ہو رہی۔ اسی طرح جب آپ نشہ آور ادویات کے ذریعے اپنے شعور کو سلا دیتے ہیں تو وقتی خوشی حاصل کرتے ہیں اور بظاہر کسی خطرے کا وجود باقی نہیں رہتا۔ تمام دشمن غائب ہو جاتے ہیں، کوئی اندیشہ باقی نہیں ہوتا۔ اندیشے کیلئے آپ کو باخبر اور مستعد رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب آپ کے وجود کا سو فیصد حصہ چوکنا اور آگاہ ہو جاتا ہے تو خوشی اور برکت حاصل ہوتی ہے کیونکہ تب آویزش کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ہے۔ بدھا درست ہے۔ آپ بھی درست ہیں کہ آپ کا تجربہ کہتا ہے کہ آپ جس قدر مستعد رہیں گے اسی قدر خطرات کو محسوس کر سکیں گے۔ چنانچہ بہتر ہوگا کہ طویل نیند میں رہا جائے بلکہ عمر بھر خواب میں رہنا بہتر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے گھر پہاڑوں کی چوٹیوں کے بجائے وادیوں میں تعمیر کرتے ہیں۔

اس کی دوسری وجہ بھی ہے۔

''اونچے پہاڑ پر بنا شہر مستحکم ہوتا ہے جو گر سکتا ہے نہ چھپ سکتا ہے''

ہم اپنے شہر اس انداز میں تعمیر کرتے ہیں اور اس قدر گزران و عارضی بنیادوں پر بناتے ہیں کہ وہ گرنے کیلئے ہمہ وقت تیار ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کھنڈرات بن جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ ہم صرف عارضی شے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری سوچ مکمل نہیں ہے۔ ہمیں صرف قریب کی شے دکھائی دیتی ہے۔ ہم صرف اپنے سے قریب ترین شے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ صرف لمحہ موجود ہی ہمارے قریب ترین ہوتا ہے۔ آپ ایک لمحے کو دیکھتے ہیں، یہ گزر جاتا ہے، پھر دوسرا لمحہ آتا اور گزر جاتا ہے۔ آپ صرف ان گزرتے لمحات کو ہی دیکھتے ہیں اور مکمل سوچ کے حصول سے محروم رہتے ہیں۔

مجموعی سوچ کیلئے مکمل شعور درکار ہوتا ہے۔ صرف مجموعی سوچ میں ہی آپ پوری زندگی کو دیکھ سکتے ہیں۔ پوری زندگی ہی نہیں بلکہ آپ پوری دنیا کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے جین کہتے ہیں کہ ''جب مہاویرا کو روشنی عطا ہوئی تو وہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے دیکھنے کے قابل ہو گیا'' اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر ہستی کی مجموعیت عیاں ہو جاتی ہے۔ جب مجموعیت واضح ہو جاتی ہے تو تبھی آپ پائیدار شہر تعمیر کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر آپ ایسا شہر کیسے بنائیں گے؟ آپ کو اگلے لمحے میں پیش آنے والے واقعات کا کوئی علم نہیں۔ آپ جو بھی کریں اگلا لمحہ اس پر پانی پھیر سکتا ہے۔ اسی طرح آپ عارضی بنیادوں پر جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کا اطلاق

مجموعے پر نہیں ہوتا۔ کُل آپ کے کیے کو مسترد کر سکتا ہے، آپ کا کیا کُل میں آ کر مطلق بے معنی بھی ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک چینی استاد کے پاس امریکی شاگرد ہوا کرتا تھا۔ جب وہ اپنی تعلیم و تربیت مکمل کرنے کے بعد امریکا واپس جانے لگا تو استاد نے اسے ایک تحفہ دیا۔ یہ لکڑی سے بنا چھوٹا سا ڈبہ تھا جس پر نقش و نگار کنندہ تھے۔ چینی استاد نے شاگرد کو تحفہ پیش کرتے ہوئے کہا ''تحفے کے حوالے سے ایک شرط ہر صورت میں پوری ہونی چاہئے، اگر تم اس شرط کو پورا کر سکتے تو وعدہ کرو، اگر تم کبھی اسے اپنے شاگرد کو منتقل کرو گے تو اسے بھی یہ شرط پوری کرنا ہوگی۔ میں بھی یہ وعدہ پورا کرتا چلا آیا ہوں، یہ نئی بات نہیں۔ یہ بے حد قدیم شے ہے اور بے شمار نسلیں اس شرط کو پورا کرتی چلی آئی ہیں''

شاگرد نے جواب دیا ''میں شرط پوری کروں گا'' یہ بے حد خوبصورت، قابل قدر اور قدیم شے تھی۔ شاگرد نے کہا ''جو بھی شرط ہو میں پوری کروں گا''

استاد بولا ''شرط بالکل سادہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اس ڈبے کو گھر میں ہمیشہ مشرقی رخ پر رکھو گے، ایسا ہی ہونا چاہئے اور اس روایت کا احترام کیا جانا ضروری ہے''

شاگرد نے جواب دیا ''یہ تو بیحد آسان شرط ہے اور میں اِسے پورا کروں گا''

تاہم جب اس نے ڈبے کو مشرقی رخ پر رکھا تو اسے سمجھ آئی کہ ایسا کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ اس سے اس کے ڈرائنگ روم کی تمام ترتیب مضحکہ خیز لگنے لگی تھی۔ مشرقی رخ پر یہ ڈبہ کسی طور بھلا نہ لگتا تھا۔ چنانچہ اسے اپنے ڈرائنگ روم کی تمام ترتیب بدلنا پڑی اور اسے ڈبے کی مناسبت سے نیا رخ دینا پڑا۔ تاہم ایسا کرنے سے ڈرائنگ روم گھر کے دیگر حصوں سے ہم آہنگ نہ رہا۔ چنانچہ اسے پورے گھر کی ترتیب تبدیل کرنا پڑ گئی۔ گھر کو تبدیل کیا گیا تو باغیچہ بقیہ ماحول سے ہم آہنگ نہ رہا۔ بار بار ترتیب بدلنے سے شاگرد تھک گیا اور اپنے استاد کو خط لکھا کہ ''ڈبہ بیحد خطرناک ہے، مجھے پوری دنیا کو تبدیل کرنا پڑے گا کیونکہ اگر میں اپنے باغیچے کو تبدیل کرتا ہوں تو میرا گھر ساتھ والے گھر کے مقابلے میں عجیب دکھائی دینے لگے گا........''

چونکہ وہ حساس آدمی تھا اسی لیے ایسا محسوس کرتا تھا۔

اگر آپ اپنی زندگی عارضی بنیادوں پر استوار کرتے ہیں تو مشکل میں پڑ جائیں گے کیونکہ ایسے میں آپ کی زندگی کُل سے مطابقت پیدا نہیں کر پائے گی۔ یہ کبھی ہم آہنگ نہیں ہو سکے گی اور

کچھ نہ کچھ غلط ہی رہے گا۔ شہر بنانے سے پہلے کل کو مدنظر رکھا جانا چاہئے۔ اپنی رہائش گاہ تعمیر کرنے سے پہلے اردگرد کا ماحول اور مستقبل بھی نظروں کے سامنے ہونا چاہئے۔ آپ کو اپنی زندگی اور اس کا نمونہ مجموعی سوچ کے مطابق ترتیب دینا چاہئے۔ آپ کو مجموعی سوچ کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اس صورت میں ہی آپ کی زندگی ہم آہنگ اور سریلی ہوگی۔ بصورت دیگر آپ ہمیشہ اجنبی اور منحرف المرکز رہیں گے۔

ہر شخص منحرف المرکز ہوتا ہے۔ یہ خوبصورت لفظ ہے۔ منحرف المرکز کا مطلب مرکز سے ہٹا ہونا ہے۔ ایسا شخص اس مقام پر نہیں ہوتا جہاں اسے ہونا چاہئے۔ ہر شخص منحرف المرکز کیوں ہے؟ ہر شخص مرکز سے ہٹا ہوا اور زندگی سے غیر ہم آہنگ کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے کہ ہر شخص زندگی کو لمحہ موجود کے مطابق بنانے کی کوشش کر رہا ہے جبکہ لمحہ ''کل'' نہیں ہوتا۔ لمحہ ایک حصہ ہے اور یہ ابدیت کا چھوٹا اور معمولی سا حصہ ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی کو لمحے کے مطابق استوار کریں گے تو پھر ابدیت سے کیسے ہم آہنگ ہو پائیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ مسیحؑ نے کہا ''اپنی زندگی عارضی کے بجائے مستقل بنیادوں پر استوار کریں''

''اونچے پہاڑ پر بنا شہر مستحکم ہوتا ہے جو گر سکتا ہے نہ چھپ سکتا ہے''

آپ کا شہر ہمیشہ گرتا رہے گا اور کھنڈرات میں تبدیل ہو جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے۔ آپ کو مسیحؑ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، آپ صرف اپنی زندگی کو ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بے کار زندگی ہے۔ یہ تعمیر سے پہلے ہی کھنڈر بن چکی ہے۔ آپ ایک برباد شہر میں رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ایسا عارضی پن کی بدولت ہوتا ہے۔ ابدی سوچ حاصل کریں اور وقت کی قید سے آزاد ہو جائیں۔

یہ سوچ کیسے پیدا ہوگی؟ آپ کا شعور جس قدر بلند ہوگا آپ کی سوچ بھی اسی قدر بڑی ہوگی۔ آپ کا شعور جس قدر پست ہوگا، سوچ بھی اسی قدر چھوٹی ہوگی۔ آپ گلی میں جاتے ہیں اور درخت تلے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ آپ کی ایک سوچ اور نظر ہے۔ آپ اس گلی کا قریب ترین کونہ دیکھ سکتے ہیں۔ کونے پر موڑ ہے اور اس سے آگے آپ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کی بصارت کام نہیں کرتی۔ اب اس درخت کے اوپر چڑھ جائیں اور ادھر ادھر دیکھیں۔ اب آپ دور دور تک دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ جہاز میں سوار ہو جائیں تو پرندے کی طرح سارے شہر کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اوپر جائیں گے تو آپ کی بصارت بھی بڑھ جائے گی۔ نیچے رہیں گے تو آپ کی بصارت

محض قریب ترین اشیا کو ہی دیکھ پائے گی۔ سیڑھی پر پاؤں رکھنے کیلئے بہت سے قدمچے بنے ہوتے ہیں۔ شعور کی سیڑھی کے بھی متعدد قدمچے ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے شعور کی معراج پر ہیں تو وہاں سے دیکھنے پر آپ پر ابدیت عیاں ہو جائے گی۔

کیا آپ نے کبھی بہت سی چھوٹی چیز کا مشاہدہ کیا ہے؟ آپ درخت تلے کھڑے ہیں اور مشرق کی سمت میں دیکھتے ہیں۔ آپ کو کوئی شے دکھائی نہیں دیتی۔ ایک شخص درخت پر چڑھا ہوا ہے، وہ آپ سے کہتا ہے کہ ''میں بیل گاڑی آتی دیکھ سکتا ہوں''

آپ جواب دیتے ہیں ''کوئی بیل گاڑی نہیں آ رہی، مجھے تو ایسی کوئی شے دکھائی نہیں دیتی اور اگر یہ مجھے نظر نہیں آ رہی تو اس کا وجود کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟'' یہ بیل گاڑی آپ کو مستقبل میں نظر آئے گی جبکہ درخت پر چڑھا شخص اسے اپنے حال میں دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ یہ مت سوچیں کہ سب کا ''حال'' ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ آپ کا حال آپ سے مخصوص ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میرے لیے حال نہ ہو۔ میرا حال مجھ تک محدود ہے، ہو سکتا ہے یہ آپ کا ماضی یا مستقبل ہو۔ یہ سب کچھ شعور کی سیڑھی پر منحصر ہوتا ہے۔

بدھا کیلئے ہر شے ''حال'' ہے کیونکہ اس کیلئے کوئی مستقبل نہیں۔ اس کی بصارت مکمل ہے۔ مسیحؑ کیلئے ہر شے ''حال'' ہے۔ اس کا کوئی ماضی نہیں کہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اس کیلئے کوئی مستقبل بھی نہیں کہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ شعور کی بلندیوں سے ''تمام'' دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ کوئی شے ماضی ہوتی ہے نہ مستقبل۔ ہر شے ''اب'' اور ''یہاں'' ہے۔ مستقبل آپ کی محدود بصارت کی وجہ سے وجود رکھتا ہے۔ یہ اس لیے موجود نہیں ہے کہ دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔ یہ صرف آپ کی محدود سوچ کا اظہار ہے۔ جو شے آپ کی بصارت سے پرے چلی جائے وہ ماضی بن جاتی ہے۔ جو شے آپ کی بصارت کے دائرے میں نہ آئے وہ مستقبل ہوتی ہے۔ مگر تمام اشیاء بذات خود ابدیت میں ہوتی ہیں۔

وقت آپ کی ایجاد ہے کیونکہ آپ وادی میں رہتے ہیں۔ دنیا کی تمام روایات اس بات پر زور دیتی ہیں کہ جب آپ استغراق یا نشے کی حالت میں ہوتے ہیں تو وقت غائب ہو جاتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کی تقسیم یعنی ماضی، حال اور مستقبل نہیں رہتے۔ وقت کا وجود تو ہوتا ہے مگر تقسیم نہیں رہتی۔ اپنا شہر بے وقتی پر تعمیر کریں، اسے عارضی لمحات پر

تعمیر مت کریں۔ بصورت دیگر یہ ہمیشہ بر باد رہے گا کیونکہ حال گزراں ہے اور ماضی بن جائے گا۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ آپ کے تعمیر کرنے سے پہلے ہی کھنڈر بن جائے گا تو میرا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جوں جوں اسے تعمیر کرتے جاتے ہیں یہ ماضی بنتا چلا جاتا ہے۔ یہ پہلے ہی جا چکا ہے، یہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، آپ کے قدموں تلے زمین مسلسل کھسک رہی ہے۔ ''بلند پہاڑ پر بنا شہر مستحکم ہوتا ہے''

مسیحؑ نے لفظ ''مستحکم'' کیوں استعمال کیا؟ چونکہ آپ وادی میں ہیں اس لیے آپ ہر دم خوف، عدم تحفظ اور خطرے میں مبتلا رہتے ہیں۔ وادی میں بھوتوں، سایوں، ہر قسم کے دشمنوں اور نفرت کا بسیرا ہے۔

ایک مکھی بازار سے گزر رہی تھی۔ ایک دکان پر کیڑے مار دوائیں رکھی تھیں۔ مکھی نے اس دکان پر لگا بینر پڑھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا کہ ''نئے سپرے سے مکھیوں کا شرطیہ خاتمہ'' اس نے بینر پڑھا اور یہ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئی کہ ''دنیا میں بے حد نفرت پائی جاتی ہے''

آپ وادی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ وادی میں ہر شے کی ہلاکت کی ضمانت موجود ہے۔ آپ موت کی وادی میں رہتے ہیں جہاں موت کے سوا کچھ بھی یقینی نہیں۔ صرف موت کی ضمانت مل سکتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ زندگی میں موت کے سوا ہر شے غیر یقینی ہوتی ہے؟ اس سے الٹ بھی ہوسکتا ہے مگر آپ کے پاس واحد تیقن مرنے کی ضمانت ہے۔ اس کے سوا ہر شے غیر یقینی اور حادثاتی ہے۔ کچھ ہو بھی سکتا ہے اور نہ ہونا بھی ممکن ہے۔ یہ کیسی زندگی ہے جہاں صرف موت کی ضمانت دی جاسکتی ہے؟ تاہم ایسا ہی ہے کیونکہ تاریکی میں صرف موت کا وجود ہی ممکن ہے۔ بے خبری میں صرف موت ہی ہوسکتی ہے۔ بے خبری موت کی جانب جانے والا راستہ ہوتا ہے۔

جب بھی آپ بے خبری اور عدم آگاہی کی کیفیت میں ہونا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ مرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے اندر مرنے کی گہری خواہش پائی جاتی ہے۔ بصورت دیگر آپ بلندی کی طرف جانا شروع کر دیتے۔ ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کو اپنی زندگی کے آخری دور میں اتفاقاً ایک گہری حقیقت کا اندازہ ہوا۔ وہ اسے Thanatos یعنی ''موت کی خواہش'' کا نام دیتا ہے۔ وہ اپنی تمام زندگی Libido یعنی ''جینے کی تمنا'' کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا تھا۔ اس

نظریے کے مطابق انسان جینے کی خواہش کے زیر اثر زندگی کرتا ہے۔ تاہم جو جینے کی خواہش کے اندر جس قدر گہرائی میں اترتا ہے اسی قدر غیر یقینی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جینے کی تمنا کو جس قدر سمجھنا شروع کرتا ہے اسی قدر خود کو مرنے کی خواہش میں گھرا پاتا ہے۔

فرائیڈ کے لیے یہ بے حد مشکل تھا کیونکہ وہ یک رخی مفکر تھا اور منطق پر یقین رکھتا تھا۔ جینے کی تمنا کے پیچھے موت کی خواہش بے حد متضاد بات تھی۔ وہ بے حد پریشان ہوا تاہم یہی بات بدھا اور مسیحؑ بھی کہتے چلے آئے ہیں کہ ''جیسی آپ کی زندگی ہے اس طرح آپ بے حد بیکار ہیں آپ کی تمام تر زندگی بے حد فضول ہے، یہ مایوسی سے بھرپور ہے، آپ مرنا چاہیں گے''

جب آپ بے خبر ہونے کیلئے کسی شے کا سہارا لیتے ہیں تو آپ کے اندر موت کی خواہش بھی کارفرما ہوتی ہے کیونکہ بے خبری اور بیہوشی عارضی موت ہے۔ آپ نیند کے بغیر محض چند روز زندہ رہ سکتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ نیند عارضی موت ہوتی ہے۔ آپ کو اس کی ضرورت ہے، آپ کو اس کی گہری ضرورت ہے۔ اگر آپ ہر روز آٹھ گھنٹوں کیلئے نہ مریں تو اگلے دن زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں ہوں گے۔ ایسا اس لیے ہے کہ آپ کی تمام تر زندگی افراتفری کا شکار ہے۔ ایسے میں ہونے کے بجائے نہ ہونا زیادہ اچھی بات معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں آپ خود کو کھو سکتے ہیں وہیں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ خود کو سیاسی تحریک میں گم کر سکتے ہیں، اگر آپ نازی بن سکتے ہیں اور خود کو ہجوم میں گم کر سکتے ہیں تو اچھا محسوس کرتے ہیں کہ یہ موت ہے۔ اب آپ کا وجود باقی نہیں رہا، آپ صرف ہجوم کا ایک حصہ ہیں۔

آمر اسی وجہ سے کامیاب رہتے ہیں۔ انہیں آپ کی موت کی خواہش سے کامیابی ملتی ہے۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی میں بھی آمر کامیاب رہتے ہیں کیونکہ وہ آپ کو با آسانی مرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگیں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہیں اور ہو رہی ہیں کیونکہ آپ کسی طور تبدیل نہیں ہو رہے۔ انسان خود کو تبدیل نہیں کر رہا۔ جنگیں جاری رہیں گی کہ مرنے کی گہری خواہش کا اظہار ہیں۔ آپ ہلاک کرنا اور ہلاک ہونا چاہتے ہیں۔ زندگی اس قدر بوجھ بن گئی ہے کہ خودکشی ہی واحد حل نظر آتا ہے۔ آپ نے تا حال خودکشی نہیں کی تو اس کا یہ مطلب نہ لیجئے گا کہ آپ کو زندگی سے محبت ہے۔ نہیں، آپ محض خوفزدہ ہیں۔ آپ زندگی سے پیار نہیں کرتے کیونکہ زندگی سے پیار کرنے والا ہمیشہ بلندیوں کی طرف جاتا ہے کہ اونچائی پر مزید زندگی ملتی ہے۔ مسیحؑ

وعدہ کر سکتے ہیں کہ "میری جانب آؤ، میں تمہیں فراواں زندگی دوں گا"۔ مسیحؑ کہتے ہیں کہ "میں زندگی ہوں، عظیم زندگی، میری جانب آؤ"۔ مگر مسیحؑ کی طرف جانا بے حد مشکل ہے کیونکہ آپ نے دادی میں بے حد سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ آپ زندگی کی تاریک راہوں کے عادی ہیں اور زندہ رہنے سے خوف کھاتے ہیں۔ آپ زندہ نہ رہنے کیلئے متعدد اقدامات کرتے ہیں اور کم از کم زندگی کے ساتھ رہتے ہیں۔ آپ کٹھ پتلی کی طرح زندگی کرتے ہیں۔

جنگیں جاری رہیں گی، تشدد جاری رہے گا اور انسان ایک دوسرے کو ہلاک کرتے رہیں گے۔ انسانوں کی تمام تر کاوش ایسا ذریعہ تخلیق کرنے پر مرکوز رہی ہے جو عالمگیر خودکشی میں معاون ثابت ہو سکے۔ اب ہم اسے تخلیق کر چکے ہیں اور یہ "ہائیڈروجن بم" ہے۔ سائنسدان تباہ کن اشیا بنانے کیلئے اپنی زندگیاں کیوں وقف کر رہے ہیں؟ اس لیے کہ یہی انسان کی گہری ترین خواہش ہے۔ مرنا اس کی خواہش ہے، کسی طرح موت آ جائے۔ یہ خواہش شعوری نہیں کیونکہ جب یہ شعوری بن گئی تو آپ خود کو تبدیل کرنا شروع کر دیں گے۔ آپ متعدد مرتبہ وثوق سے کہتے ہیں کہ "اگر میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا تو بہتر تھا"

فلو نامی یونانی فلسفی کا قول ہے کہ "سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ پیدا ہی نہ ہوا جائے اور دوسری اچھی بات یہ ہے کہ جتنا جلد ہو سکے مر جایا جائے" اس کا کہنا ہے کہ انہی دو باتوں کو 'رحمت' کہا جانا چاہئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ پیدا ہی نہ ہوا جائے، تاہم کوئی خوش قسمت نہیں کہلا سکتا کہ ہر شخص پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ صرف دوسری بات ہی ممکن ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو مر جایا جائے۔ فلو خود ستانوے برس زندہ رہا۔ کسی نے اس سے پوچھا "تم نے خودکشی کیوں نہیں کی؟" اس نے جواب دیا "میں دوسروں کو یہ پیغام دینے کیلئے زندگی کو برداشت کرتا رہا ہوں کہ موت ہی واحد حل ہے"

خودکشی ایک ایسی جبلت ہے جس کی جڑیں بے حد گہری ہوتی ہیں۔ اچانک آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ آپ خودکشی کرنا اور اپنے آپ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ مذہبی آدمی وہ ہے جو اس حوالے سے چوکنا رہے کہ انسان کے اندر موت کی گہری خواہش چھپی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ آپ کو اپنے اندر مزید روشنی پیدا کرنی ہے تاکہ آپ اس کونے سے باخبر رہ سکیں جہاں موت چھپی ہے اور آپ کو مسلسل کھا رہی ہے۔ آپ اچانک نہیں مرتے بلکہ آہستہ آہستہ ستر سال میں

مرتے ہیں۔ موت ایسا مظہر نہیں جو آخر میں ہو بلکہ یہ پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر سانس اور ہر لمحہ موت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ عمل آہستگی سے انجام پاتا ہے اس لیے تقریباً ستر سال میں مکمل ہوتا ہے۔

تاہم آپ ابتداء ہی سے مرتے چلے آئے ہیں اور آپ کے اندر مرنے اور ختم ہو جانے کی گہری خواہش پائی جاتی ہے۔ ایسا جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہو گا۔ آپ نے خودکشی نہیں کی کہ آپ بے حد خوفزدہ ہیں۔ کیا ہو گا؟ چنانچہ آپ زندگی کو برداشت کرتے ہیں۔ آپ اس سے خدا کے تحفے کے طور پر لطف اندوز نہیں ہو رہے۔ آپ محض زندگی کو برداشت کر رہے ہیں۔ آپ بس کسی نہ کسی طرح اس بوجھ کو اٹھائے پھرتے ہیں اور ٹرین سے باہر نکلنے کے منتظر ہیں۔

معروف سائنس دان تھامس ایڈیسن کھانے پر مدعو تھا۔ چند دوست جمع ہو چکے تھے۔ ایڈیسن کم آمیز آدمی تھا اور ہجوم سے گھبراتا تھا۔ وہ اپنی تجربہ گاہ میں اکیلا کام کیا کرتا تھا۔ وہ محقق اور مستغرق آدمی تھا۔ اس کیلئے دوسروں کی موجودگی ہمیشہ پریشانی کا باعث ہوا کرتی تھی۔ لوگ کھانے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں اور بحث مباحثوں میں مشغول تھے۔ ایسے میں ایڈیسن نے سوچا "مجھے فوری طور پر یہاں سے کھسک لینا چاہئے" چنانچہ اس نے دروازے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ میزبان نے اس کی یہ حرکت بھانپ لی اور کہنے لگا "مسٹر ایڈیسن، اس وقت آپ کس چیز پر کام کر رہے ہیں" ایڈیسن نے جواب دیا "بھاگنے پر"

ہر شخص بھاگ نکلنے پر کام کر رہا ہے۔ اس حوالے سے خبردار رہیں۔

آپ زندگی سے لطف کیوں نہیں اٹھا سکتے جو کہ تحفہ ہے۔ آپ نے اسے نہیں کمایا، اسی وجہ سے میں اسے "خدا کا کرم" کہتا ہوں۔ آپ اسے خدا بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ سادہ اور خالص تحفہ ہے۔ آپ نے اسے حاصل کرنے کیلئے کچھ نہیں کیا۔ آپ خوش اور شکر گزار کیوں نہیں ہوتے اور اس سے لطف کیوں نہیں اٹھاتے؟ اس سے رقص کناں ہو کر لطف اٹھانا چاہئے، مگر مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ خوشی سے لطف اٹھانے کیلئے بڑی آگہی درکار ہوتی ہے۔ اذیت جھیلنے کیلئے آگاہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اذیت جھیلنے کیلئے زیادہ تاریکی اور کم شعور درکار ہوتا ہے۔ اس کیلئے دن کے بجائے رات کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوشی سے لطف اندوز ہونے کیلئے مزید مستعد رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر آپ کسی ایسے ولی کو دیکھیں جو اداس ہو تو جان لیں کہ وہ ولی نہیں ہے۔ آگاہی خوشی اور برکت عطا کرتی ہے۔ یہ پورے وجود کو گہری ہنسی بخشتی ہے اور کچھ ایسی شے مہیا کرتی ہے جس سے وہ بچے جیسا بن جاتا ہے۔ وہ تتلی کے پیچھے بھاگ سکتا ہے، سادہ خوراک سے لطف اٹھا سکتا ہے اور زندگی کی تمام چیزوں سے اس قدر خوشی حاصل کر سکتا ہے کہ ہر شے تحفہ بن جاتی ہے۔ ہر شے خدا کا کرم بن جاتی ہے اور وہ ہر لمحہ خدا کا احسان مند رہتا ہے۔ وہ اپنے سانس سے بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ بے حد بابرکت ہے۔ اگر آپ کسی اداس ولی کو دیکھیں تو سمجھ لیں کہ کہیں کوئی خرابی موجود ہے۔ وہ بدستور وادی میں رہتا ہے اور اس نے چوٹی کی جانب سفر شروع نہیں کیا۔ بصورت دیگر اس کے چہرے پر شگفتگی، روشنی، بچوں کی سی خوشی اور عدم تشویش ہویدا ہوتی۔

شعور آپ کو مستحکم کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ آپ جس قدر آگاہ ہوجاتے ہیں اسی قدر جان لیتے ہیں کہ آپ مر نہیں سکتے کہ موت کا وجود ہی نہیں ہے۔ موت صرف تاریک وادی میں رہتی ہے اور اگر آپ موت کے خلاف قلعہ بند ہیں تو سمجھ لیجئے کہ مستحکم ہیں۔ آپ جس قدر آگاہ ہیں اسی قدر جانتے ہیں کہ آپ ابدی ہیں۔ اس وقت آپ کو اپنے بارے میں کسی بات کا علم نہیں ہے۔ یہ جہالت کی وادی ہے جہاں صرف موت کا وجود ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں آپ خوف کے مارے کانپتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنے اندر دیکھیں تو وہاں آپ کو خوف کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے گا کیونکہ آپ کے اردگرد موت کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ یہ فطری ہے، اردگرد موت ہو تو اندر خوف کی موجودگی فطری امر ہے۔

اگر آپ بلندیوں کی طرف جائیں تو آپ کے اندر پیار اور اردگرد ابدیت ہوگی۔ وہاں کوئی خوف نہیں ہوگا، خوف ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ناقابل تسخیر ہیں۔ آپ کی موت کا کوئی امکان نہیں۔ آپ موت سے ماورا ہیں۔ یہی وہ استحکام ہے جس کے بارے میں مسیح کہتے ہیں کہ ''بلند پہاڑ پر تعمیر کردہ شہر مستحکم ہوتا ہے..... '' تاہم یاد رہے کہ اونچائی ہی استحکام ہے
''..... جو گر سکتا ہے نہ چھپ سکتا ہے''

یہ بے حد متناقض ہے، وادی میں آپ مسلسل گرتے ہیں جبکہ بلندی پر کبھی نہیں گرتے۔ یہ متناقض ہے کہ عموماً لوگ بلندی سے ہی گرا کرتے ہیں جبکہ وادی میں کوئی کیونکر گرے گا؟ ہموار سطح پر چلنے والا کیسے گر سکتا ہے؟ لوگ بلندیوں سے ہی گرتے ہیں۔ یہ خرافات ہے۔ اندرونی دنیا میں کوئی

بلندیوں سے نہیں گرتا۔ ایک مرتبہ اندرونی بلندی حاصل کر لی جائے تو پھر کوئی وہاں سے نیچے نہیں گر سکتا۔ اگر آپ اپنے اندر اسے حاصل کر لیں تو پھر کوئی آپ سے اسے چھین نہیں سکتا۔

لوگ اس وقت گرتے ہیں جب وہ بلندیوں پر ہوتے ہیں۔ تاہم وہ بلندیاں وادی کی ملکیت ہیں۔ حقیقی بلندیاں نہیں ہوتیں۔ اگر آپ معروف ہیں تو جلد یا بدیر اپنی ناموری ختم ہونے کے حوالے سے پر یقین ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ تخت و تاج کے مالک ہیں تو جلد یا بدیر اس سے محروم ہو سکتے ہیں۔ آپ اس دنیا میں جو کچھ بھی پائیں گے وہ واپس لے لیا جائے گا۔ تاہم اندرونی دنیا میں آپ جو شے حاصل کرتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے ہوتی ہے۔ اسے واپس نہیں لیا جا سکتا۔ آگہی کبھی واپس نہیں جا سکتی۔ اگر ایک مرتبہ یہ حاصل ہو جائے تو پھر آپ کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ کوئی ایسی شے نہیں جس کے حصول کیلئے شدید جدوجہد کی جائے۔ یہ آپ کا حصہ بن جاتی ہے اور آپ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔

ایک مرتبہ جب آپ کو علم ہو جائے کہ آپ کو موت نہیں آ سکتی تو پھر آپ اس سے ناواقف کیونکر ہو سکتے ہیں؟ اس آگاہی کو عدم آگاہی میں بدلنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ آپ جان چکے ہیں۔ حقیقی علم وہی ہے جسے دوبارہ جہالت میں بدلا نہ جا سکے۔ بھلائی جانے والی شے صرف یادداشت ہوتی ہے، علم نہیں۔ آپ کا علم کہیں نہیں جاتا۔ صرف یادداشت جاتی رہتی ہے۔

علم وہ ہے جسے آپ بھلا نہ سکیں، اسے بھلانے کا کوئی طریقہ نہیں۔ یہ آپ کے وجود کا حصہ بن چکا ہے۔ آپ کو اسے یاد رکھنے کی ضرورت نہیں، آپ کو صرف وہی چیزیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے جو آپ کا حصہ نہیں ہیں۔

''اونچے پہاڑ پر بنا شہر گر سکتا ہے نہ چھپ سکتا ہے'' آپ اسے چھپا بھی نہیں سکتے۔ بلندی پر بنا شہر ہر ایک کو دکھائی دے گا۔ اسے کسی طور چھپایا نہیں جا سکتا۔ آپ بدھا کو کیسے چھپا سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے۔ یہ اس قدر بڑا مظہر اور اس قدر پُراثر وجود ہے کہ اس کا اثر ابدی ہوگا۔

آپ مسیح کو سولی پر تو لٹکا سکتے ہیں مگر اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انہیں سولی پر لٹکانے والے تاحال اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ایک آدمی، بڑھئی کا ایک عام سا بیٹا ہلاک ہوا، کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ یہودیوں نے اسی انداز میں سوچا۔ کسی کو پریشانی نہ ہوئی۔ اگر آپ بڑھئی کے بیٹے کو قتل کریں اور اسے قانون کے مطابق قتل کیا جائے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ مگر اس دارکشی کے باعث

یہودی دو ہزار سال سے نسل درنسل مصائب جھیل رہے ہیں۔ وہ اس واحد آدمی کے بدلے میں تا حال مصلوب ہیں۔ یہ بے حد غیر منطقی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ''ہم نے کچھ نہیں کیا'' ایک طرح سے وہ ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ جنہوں نے مسیحؑ کو مصلوب کیا وہ طویل عرصہ قبل ہی مر چکے ہیں۔

تاہم مسیحؑ جیسا شخص وقت سے آزاد ہوتا ہے۔ جہاں تک مسیحؑ کا تعلق ہے تو دار کشی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جاری رہے گی۔ یہ قصہء ماضی نہیں بنا کیونکہ مسیحؑ جیسا شخص کبھی قصہء ماضی نہیں بنتا۔ یہ موجودہ حقیقت ہے۔ اسے دار پر لٹکا دیا گیا۔ یہودی سوچ سکتے ہیں کہ ''ہم نے ماضی میں ایسا کیا تھا اور یہ کام کرنے والے اب زندہ نہیں ہیں، ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا، ہوسکتا ہے ہم ایسا کرنیوالوں سے تعلق رکھتے ہوں مگر ہم بذات خود وہ نہیں ہیں'' تاہم مسیحؑ کی دار کشی اب ابدی حقیقت بن چکی ہے۔ اب اسے ماضی میں ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اب زندہ زخم بن گئی ہے۔ یہ زخم دل میں رہنا ہے۔ یہودیوں نے خمیازہ بھگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے بہت زیادہ بھگتا ہے کیونکہ ایک انسان کے بدلے میں بیس صدیوں کے دوران لاکھوں یہودی قتل ہو چکے ہیں۔ ایک شخص کے بدلے میں لاکھوں یہودی؟ یہ ناانصافی معلوم ہوتی ہے۔

مگر آپ اس شخص سے واقف نہیں ہیں اسی لیے آپ کو یہ انصافی دکھائی دیتی ہے۔ اس شخص کی اہمیت لاکھوں انسانوں سے زیادہ ہے۔ جس روز انہوں نے بڑھئی کے اس بیٹے کو دار پر لٹکایا اس روز وہ مہیب آگ سے کھیلے تھے۔ انہوں نے اسے چھپانے کی کوشش کی مگر یہ نہ چھپ سکی۔ انہوں نے اسے چھپانا چاہا۔ یہودیوں کا کوئی ایسا ریکارڈ نہیں ملتا جس میں مسیحؑ کو مصلوب کرنے کی بابت بیان کیا گیا ہو۔ عیسائیوں کے ریکارڈ موجود ہیں مگر یہودیوں کے پاس ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ تاہم آپ اسے چھپا نہیں سکتے۔ چنانچہ یہودی غائب ہونا شروع ہو گئے۔ انہیں مصائب جھیلنا پڑے کیونکہ انہوں نے سورج کے سامنے اپنی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سارے معاملے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ انہوں نے مسیحؑ کو ہمیشہ کیلئے زندہ کر دیا۔

مسیحؑ یہودی تھے اور آخری دم تک یہودی ہی رہے۔ وہ عیسائی نہیں تھے۔ یہودی کئی ہزار سال سے ان کے منتظر تھے۔ ماضی میں ان کے پیغمبروں نے انہیں بتایا تھا کہ ''ایک شخص آئے گا جو تمہیں عطا کرے گا۔ بہت جلد ایک شخص ظاہر ہوگا جو تمہیں نجات دلائے گا'' پیغمبر حضرات ہزاروں

سال سے یہودیوں کو یہی بتاتے چلے آئے تھے اور یہودی اس آنیوالے کے شدت سے منتظر تھے۔ انہوں نے آنے والے کیلئے دعائیں مانگیں اور اس کا انتظار کیا، یہی ستم ظریفی ہے۔ جب وہ شخص آ گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ جب وہ شخص آیا اور اس نے دروازے پر دستک دی تو انہوں نے کہا ''نہیں، تم وہ نہیں ہو جس کا وعدہ کیا گیا تھا'' کیوں؟

انسانی ذہن کیلئے انتظار کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ ذہن امید، خواہش اور خواب کا عادی ہے۔ تاہم یاد رکھیں کہ جب خدا آپ کے دروازے پر دستک دے گا تو اس وقت بھی آپ انکار کر دیں گے۔ ہوسکتا ہے آپ عبادت کر رہے ہوں، مگر جب خدا دروازہ کھٹکھٹائے تو کیا مسئلہ ہے؟ آپ انکار کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ گھر میں صرف ایک ہستی رہ سکتی ہے۔ جب خدا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو آپ کو غائب ہونا ہے۔ یہی مسئلہ ہے۔

انتظار کی صورت میں آپ اور آپ کی انا قائم رہتے ہیں۔ یہودی اس حوالے سے بے حد خودغرض تھے کہ جس شخص کی آمد کی بشارت دی گئی ہے وہ انہی کی نسل سے ہوگا۔ ان کے خیال میں وہ چنیدہ لوگ تھے۔ خدا انہیں چن چکا تھا اور اس کا بیٹا یہودی خاندان میں پیدا ہونا تھا۔ انا کو یہ بات بیحد اچھی لگی۔ مگر جب یہ چنیدہ شخص آیا اور اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا کہ ''میں وعدے کی تکمیل کرنے آیا ہوں'' تو انہوں نے کہا ''نہیں، تم وہ چنیدہ آدمی نہیں ہو۔ اگر تم نے یہ کہنے کی کوشش کی کہ ''میں وہی ہوں'' تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے'' مسئلہ کیا تھا؟

مسئلہ انسانی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر مسیحؑ موجود ہے تو پھر آپ کو غائب ہونا ہے۔ آپ کو اس میں حل ہو جانا ہے۔ آپ کو ہتھیار ڈالنا ہیں۔ انا کیلئے یہ سوچنا بیحد اچھا تھا کہ جس شخص کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ہماری جانب آئے گا جو کہ دنیا کی چنیدہ نسل ہیں، مگر جب وہ شخص آیا تو اسے قبول کرنا بے حد مشکل تھا۔

انہوں نے مسیحؑ کو ہلاک کر دیا مگر اس کا ریکارڈ بھی نہ رکھا۔ وہ اس تمام معاملے کو بھول جانا چاہتے تھے تاکہ دوبارہ امید قائم کر سکیں اور وہ تا حال پر امید ہیں۔ وہ تا حال اس شخص کے منتظر ہیں جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔ اگر وہ دوبارہ آیا تو وہ اسے دوبارہ سولی پر لٹکا دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نہیں آئے گا کہ اس نے تجربے سے سیکھ لیا ہے۔ یہودیوں نے بے پناہ مصائب جھیلے کیونکہ انہوں نے پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کردہ گھر کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

انہوں نے بلندی پر قائم شہر کو چھپانے کی سعی کی۔ انہوں نے سورج کو چھپانے کی کوشش کی۔ انہوں نے سچائی کو چھپانا چاہا۔ انہوں نے سچائی کو مصلوب کر دیا۔ مگر سچائی مصلوب نہیں کی جا سکتی۔ آپ اسے ختم نہیں کر سکتے۔ یہ ابدی ہے۔ یہ موت سے ماورا ہے۔ وہ تا حال اس امر سے ناواقف ہیں کہ انہیں اس قدر مصائب کیوں جھیلنا پڑے۔ وہ اندر سے بے حد شرمندہ ہیں اور اپنی غلطی محسوس کرتے ہیں۔ یہودی ندامت کے بغیر نہیں ہوتا۔ ندامت سائے کی طرح ان کا پیچھا کرتی ہے۔ ندامت یہ ہے کہ جس کا وعدہ تھا جب وہ آیا تو آپ نے انکار کر دیا۔ یہودی اندر سے بخوبی جانتے ہیں کہ انہوں نے ممکن ترین عظیم گناہ کیا ہے۔ انہوں نے خدا کو اس وقت مسترد کر دیا جب وہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

وہ آپ کی توقعات پوری نہیں کرے گا۔ وہ جب بھی آیا اجنبی کی طرح آئے گا۔ اگر اس نے آپ کی توقعات پوری کیں تو وہ خدا نہیں ہوگا۔ خدا ہمیشہ اجنبی ہوتا ہے۔ وہ نامعلوم ہوتا ہے اور نامعلوم کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ وہ جانی پہچانی شکل میں سامنے نہیں آتا۔ ایسا ممکن ہی نہیں، وہ ہمیشہ نامعلوم اور پراسرار رہتا ہے۔ وہ کسی ترکیب کا پابند نہیں ہے۔ وہ مردہ نہیں ہے، صرف مادہ ہی ترکیب کا پابند ہوتا ہے، زندگی اسرار کی طرح ہوتی ہے۔

''اونچے پہاڑ پر بنا شہر مستحکم ہوتا ہے جو گر سکتا ہے نہ چھپ سکتا ہے''

مسیحؑ نے کہا ''تم نے جو کچھ سنا اسے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر دوسروں کو سنا دو، کوئی شخص چراغ جلا کر اسے برتن تلے یا خفیہ جگہ پر نہیں رکھتا بلکہ وہ اسے نمایاں مقام پر رکھتا ہے تاکہ ہر آنے جانے والا اس کی روشنی سے مستفید ہو سکے''

مسیحؑ نے اپنے حواریوں سے کہا کہ ''تم نے مجھ سے جو کچھ بھی سنا ہے اسے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر با آواز بلند دوسروں کو سنا دو تاکہ وہ بھی آگاہ ہو سکیں کیونکہ'' ..... کوئی چراغ جلا کر برتن تلے یا خفیہ جگہ پر نہیں رکھتا''

مسیحؑ نے کہا ''جاؤ، اور اچھی خبر سنا دو، جاؤ اور جا کر کہہ دو کہ نامعلوم معلوم میں داخل ہو گیا ہے۔ جاؤ اور جا کر بتا دو کہ پراسرار تمہاری معمول کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ جاؤ اور گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بتا دو تاکہ وہ سن سکیں اور آ کر مستفید ہو سکیں۔ اس حوالے سے جھجک کا مظاہرہ مت کرو''

اس سلسلے میں ایک گہرا مسئلہ ہے۔ یہ بے حد مشکل ہے۔ مسیحؑ کے حواریوں کیلئے دوسروں کو یہ بتانا بیحد مشکل ہے کہ خدا کا بیٹا آ گیا ہے۔ یہ اس لیے مشکل ہے کہ لوگ ہنسیں گے۔ لوگ کہیں گے کہ تم پاگل ہو چکے ہو۔ وہ اس امر پر یقین نہیں کریں گے کہ مسیحؑ ہی خدا کے پیغمبر ہیں۔ وہ کہیں گے کہ تم پاگل ہو۔ اگر حواری یہ کہتے ہیں کہ ''مسیحؑ خدا ہے'' تو لوگ سمجھیں گے کہ یہ بالکل ہی پاگل ہو چکے ہیں۔ وہ کہیں گے ''تمہیں نفسیاتی تجزیے کی ضرورت ہے، ڈاکٹر سے رجوع کرو، تمہیں دوا کی ضرورت ہے، آرام کرو اور خود کو شانت رکھو'' وہ اس لیے ایسا کہیں گے کہ ان کے خیال میں مسیحؑ کے حواری میں کوئی گڑبڑ ہے۔

لوگوں کو یہ بتانا بیحد مشکل ہے کہ کسی کو کچھ مل گیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب کوئی شخص کچھ پا لیتا ہے تو یہ آپ کیلئے گہرا زخم بن جاتا ہے۔ یہ بیحد تکلیف دیتا ہے۔ آپ خود بھی ایسے ہو سکتے تھے مگر آپ نے موقع گنوا دیا۔ ایک موازنہ جنم لیتا ہے اور آپ کی انا زخمی ہو جاتی ہے۔ ''مسیحؑ خدا کا بیٹا ہے اور میں کیوں نہیں ہوں؟'' صورتحال اس سے متضاد بھی ہو سکتی تھی۔ مسیحؑ خدا کا بیٹا کیسے بن سکتا ہے؟ اپنے آپ کو تبدیل کرنے اور خدا کا بیٹا بننے کی نسبت اسے بھلا دینا زیادہ آسان ہے۔ یہ آسان ہے، دنیا میں ''نہیں'' سے زیادہ آسان شے کوئی اور نہیں ہوتی۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ آپ نے ''نہیں'' کہنا ہے اور بات ختم۔ اگر آپ ''ہاں'' کہتے ہیں تو پھر سب کچھ شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ بھی ختم نہیں ہوا۔ نہیں ہمیشہ اختتام ہوتا ہے۔ ہاں ہمیشہ شروعات ہوتی ہے۔

اگر آپ کہتے ہیں کہ ''ہاں مسیحؑ خدا کے فرزند ہیں'' تو پھر آپ کو اپنا آپ تبدیل کرنا ہے۔ تب آپ محض ''ہاں'' کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے۔ آپ کو حرکت کرنا ہوگی۔ آپ کو کچھ کرنا پڑے گا۔ اگر آپ ''نہیں'' کہتے ہیں تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آپ جو بھی اور جہاں بھی ہوں، خواہ وادی میں ہوں، تاریکی میں یا موت میں ہوں، آپ پرسکون ہوتے ہیں۔ مسیحؑ آپ میں بے حد بے سکونی تخلیق کرتے ہیں اور ہم انتقام لیتے ہیں۔ کیونکہ اگر کوئی انسان اس قدر بلندی پر پہنچ سکتا ہے تو آپ ایسا کیوں نہ کر پائے؟ ایسے میں یہ کہنا بہتر ہوتا کہ کسی بلندی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں اور کوئی شخص کبھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔ ایسا سوچ کر آپ اپنی تاریکی میں ہی مطمئن رہتے ہیں۔ مسیحؑ اور بدھا کی باتیں تناؤ پیدا کرتی ہیں کیونکہ یہ لوگ آپ کو وادی سے اوپر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ آپ کو جھنجھوڑ کر نیند سے جگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''عمل

کرو، یہ قیام کی جگہ نہیں ہے،" مسیحؑ کا قول ہے کہ "یہ دنیا محض پل ہے، آگے بڑھیں، یہ گھر بنانے کی جگہ نہیں، پل پار کریں مگر اس پر قیام مت کریں، کوئی شخص پل پر گھر نہیں بناتا" یہ دنیا محض پل ہے جبکہ آپ اس پر گھر بنا چکے ہیں۔ آپ اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہونا چاہیں گے کہ یہ پل ہے کیونکہ ایسا ہونے کی صورت میں گھر بنانے پر صرف ہونے والی آپ کی تمام تر مساعی اور سرمایہ کاری کا کیا بنے گا؟ ایسے میں کوئی آوارہ کہیں سے آنکلتا ہے اور کہتا ہے "تم کیا کر رہے ہو؟ یہ پل ہے، لہٰذا اپنے نیچے دریا میں نہ دیکھنا ہی بہتر ہے"

یہ پل کیوں ہے؟ اس لیے کہ مسیحؑ یا ان جیسے دوسرے لوگ کبھی کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتے جو گہرے مفہوم کا حامل نہ ہو۔ یہ پل ہے کیونکہ یہ دریا پر بنا ہے۔ یہ دریا ناپائیداری کا دریا ہے۔ وقت محض عارضی دریا ہے۔ یہ بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہرکولیس نے کہا تھا کہ "آپ ایک دریا میں دوسری مرتبہ قدم نہیں دھرتے" کیونکہ اگر آپ دریا میں دوسری مرتبہ اتریں گے تو یہ وہ دریا نہیں ہوگا جس میں آپ اس سے پہلے اترے تھے۔ وہ دریا بہہ کر کہیں آگے نکل گیا ہے۔ بظاہر آپ کو یہ پہلے والا دریا نظر آتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ دریا کا مطلب "تبدیلی" ہے۔ یہ آگے ہی آگے بہتا رہتا ہے۔

مسیحؑ اس دنیا کو پل کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ آپ نے اسے عارضی شے پر تعمیر کیا ہے۔ یہ عارضی شے وقت ہے، یہ وقت کا دریا ہے، ہر شے حرکت پذیر ہے۔ اس پل سے گزر کر آگے بڑھ جائیں۔ یہ گھر بنانے کی جگہ نہیں ہے۔

تاہم اگر کوئی آئے اور آپ سے کہے کہ "...... آپ پچاس سال سے یہ گھر بنا رہے ہیں اور اب یہ تقریباً تیار ہے۔ یاد رہے کہ یہ ہمیشہ سے "تقریباً تیار" ہے۔ یہ گھر "تیار" کبھی نہیں رہا۔ یہ کبھی تیار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اس کی فطرت ہی نہیں۔ جب یہ "تقریباً تیار" ہو جاتا ہے اور آپ اس کی تعمیر میں صرف ہونے والی توانائی بحال کرنے اور تناؤ سے چھٹکارا پانے کیلئے اس میں جانا چاہتے ہیں تو یہ شخص نمودار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ دریا پر بنا ہے" ایسے میں آپ نیچے دریا کو دیکھنے اور اس شخص پر یقین کرنے کے بجائے اسے کہیں گے "دور ہو جاؤ احمق" اگر وہ شخص مسیحؑ کی طرح اصرار کرے تو آپ غصے میں آ جائیں گے۔ چنانچہ مسیحؑ کو مصلوب کر دیا گیا۔ وہ بہت بڑا مسئلہ بن چکے تھے۔

سقراط کو زہر دے دیا گیا کیونکہ اس کی وجہ سے پورا ایتھنز "بے اطمینانی" کا شکار تھا۔ وہ لوگوں کو کہیں بھی پکڑ لیتا تھا۔ وہ لوگوں کو بازاروں اور تفریح گاہوں میں جا لیتا تھا اور اس کے سوالات لوگوں کے مطمئن جھوٹ کو تباہ کر کے رکھ دیتے تھے۔ وہ تکلیف دہ شے بن گیا۔ وادی میں بدھا ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس نے بے پناہ اذیت اور اندیشوں کو جنم دیا۔ لوگوں کیلئے سونا محال ہو گیا۔ ان کیلئے کام کرنا بھی بحال ہو گیا کہ اس نے شکوک و شبہات پیدا کر دیے تھے۔ اس نے کہا "آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ دریا اور یہ پل ہے اور یہ بازار ہے۔ آپ اپنا گھر یہاں تعمیر کر رہے ہیں؟ ابدی پر نظر رکھیں اور اسے ڈھونڈیں۔ سچائی تلاش کریں۔ وہ اس قدر تکلیف دہ بن گیا کہ لوگوں کو اسے زہر دینا پڑا۔

وادی میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اگر کوئی بینا اندھوں کے شہر میں آ جائے تو وہ اسے ہلاک کر دیں گے۔ اگر وہ قدرے مہربان ہوئے تو ہلاک کرنے کے بجائے اس کی آنکھیں نکالنے پر اکتفا کریں گے۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے کیونکہ شہر میں آنے والا یہ شخص انہیں "اندھا" کر دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی "اندھے" نہیں رہے۔ انہیں اس کا کبھی علم نہیں ہو سکا کہ حقیقی اندھا کون ہے۔ یہ شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ "تم اندھے ہو، تم پاگل ہو" وہ انہیں ان باتوں سے آگاہ کر دیتا ہے جن سے وہ آگاہ نہیں ہونا چاہتے۔ یہ چیزیں اندیشے پیدا کرتی ہیں۔

مسیحؑ اپنے حواریوں سے کہتے ہیں کہ "جاؤ اور گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر منادی کر دو" گھروں کی چھتوں پر کیوں؟ اس لیے کہ لوگ تقریباً بہرے ہوتے ہیں۔ وہ سنتے ہیں نہ سننا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ سنتے ہیں تب بھی کچھ نہیں سن رہے ہوتے، وہ کہیں اور پہنچے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ سر ہلاتے ہیں تو یہ بھی ان کی بوریت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ سچ کو برداشت کر سکتے ہیں مگر اس سے لطف اندوز نہیں ہوتے کہ سچائی آپ کو ہمیشہ پریشان کر دیتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ آپ جھوٹ کی وادی میں رہتے ہیں۔

آپ کی تمام تر زندگی جھوٹ سے عبارت ہے۔ آپ دوسروں سے جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ آپ اپنے آپ سے جھوٹ بولتے رہے ہیں اور اپنے اردگرد ہر شے کو جھوٹا بنا چکے ہیں۔ اب کوئی شخص آتا ہے اور سچائی بیان کرتا ہے۔ ایک شخص کو ہر قسم کی بیماریاں لاحق تھیں اور وہ خود کو صحت مند سمجھتا تھا۔ ایسے میں کوئی شخص آیا اور کہنے لگا "تم کیسی بیہودہ بات کرتے ہو، تم تو بیحد بیمار ہو" بیمار

آدمی سوچتا ہے کہ یہ شخص براشگون ہے۔ یہ مجھے بیمار بنا رہا ہے جبکہ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ مسیحؑ کہتے ہیں ''جاؤ اور مجھ سے جو کچھ بھی سنا ہے اسے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر لوگوں کو سنا دو'' کوئی چراغ جلا کر برتن تلے نہیں رکھتا'' جھجکیں مت، خوفزدہ نہ ہوں۔ روشنی موجود ہے، اسے مت چھپائیں۔ چراغ جلانے والا اسے چھپا کر نہیں رکھتا بلکہ وہ اسے نمایاں جگہ پر رکھتا ہے تا کہ ہر آنے والا اس کی روشنی سے مستفید ہو سکے۔

یہ مسئلہ ہمیشہ سے موجود ہے۔ بدھا، مہاویرا، لاؤزو، مسیحؑ اور زرتشت نے اپنے حواریوں پر مسلسل زور دیا کہ جائیں اور دوسروں کو آگاہ کر دیں۔ اس لیے کہ موقع ہمیشہ موجود رہے گا۔ مسیحؑ اپنے ظاہری جسم کے ساتھ ہمیشہ موجود نہیں رہیں گے۔ اگر آپ نے انہیں ان کی زندگی میں نہ پہچان سکے تو ان کی غیر موجودگی میں کیسے پہچان پائیں گے؟ اگر آپ انہیں ظاہری جسم کے ساتھ نہیں دیکھ سکتے تو جب وہ کائنات میں غائب ہو جائیں گے تب آپ انہیں کیسے جان پائیں گے؟

بہت کم لوگ فلاح پاتے ہیں اور بہت کم لوگوں کی تاریکی دور ہوتی ہے۔ یہ غیر معمولی مظہر ہے اور ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتا۔ مسیحؑ ہمیشہ جلدی میں ہوتا ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے۔ مسیحؑ کے پاس زمین پر بہت کم وقت تھا۔ وہ تینتیس سال کی عمر میں دنیا سے چلے گئے۔ انہوں نے تیس سال کی عمر میں تبلیغ شروع کی اور صرف تین سال کے بعد دنیا سے گزر گئے۔ وہ بے حد جلدی میں تھے۔ انہیں علم تھا کہ ایسا ہونا ہے، ان کی دار کشی طے ہو چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کہا'' جاؤ اور جس قدر ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستعد اور آگاہ کر دو، دروازہ کھلا ہے اور وہ خدا سے آشنا ہو سکتے ہیں''

مگر حواری ہمیشہ کانپتے رہے۔ جب مسیحؑ مصلوب ہوئے تبھی انہوں نے تبلیغ کا آغاز کیا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب مسیحؑ غائب ہو گئے تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ جب مسیحؑ موجود ہوتے ہیں تو آپ لوگ ان کی موجودگی کے باعث پھیلی روشنی سے مانوس ہوتے ہیں، جب مسیحؑ نہیں رہتے تو ہر طرف تاریکی پھیل جاتی ہے اور آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کون سی روشنی کھو بیٹھے ہیں۔ تب آپ گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر تبلیغ شروع کر دیتے ہیں۔ تاہم جب مسیحؑ موجود تھے تو کچھ نہ کچھ کرنا ممکن تھا، اب کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ آپ صدیوں سے تبلیغ کر رہے ہیں۔ کلیسا یہی کچھ کر رہا ہے۔ دنیا بھر میں تبلیغ جاری ہے۔ اسی بات کی تبلیغ جاری ہے کہ مسیحؑ روشنی ہیں۔ مگر اب اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اب مسیحؑ

غائب ہو گئے ہیں۔ وہ مدد کر سکتے ہیں مگر جب وہ موجود ہوتے ہیں تب بھی آپ انہیں نہیں دیکھ پاتے تو غائب ہونے کی صورت میں انہیں کیونکر پہچانیں گے؟ جب دروازہ آپ کے سامنے کھلا تھا تو آپ اس میں داخل نہ ہو سکے۔ اب غائب دروازے میں داخل ہونا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ بے حد مشکل ہے۔

تاہم جب روشنی غائب ہوتی ہے تو حواری خود بخود مستعد ہو جاتے ہیں۔ تب وہ رونا اور چلانا شروع کر دیتے ہیں اور جان جاتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ آپ موازنے کے ذریعے ہی جانچ پاتے ہیں۔ آپ کو اپنے زندگی کا احساس مرتے دم ہی ہوتا ہے۔ جب آپ مرنے لگتے ہیں تو تبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ زندہ تھے اور زندگی سے بھرپور فائدہ نہ اٹھا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو اسی وقت زندگی کا احساس ہوتا ہے جب وہ موت کے منہ میں ہوتے ہیں۔ وگرنہ وہ زندگی کی قدر و قیمت سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔

مسیحؑ نے کہا'' اگر اندھا اندھے کی رہنمائی کرے تو دونوں گڑھے میں جا گرتے ہیں''

چنانچہ جھجکنا چھوڑ دیں۔ ایسا شخص بھی موجود ہے جو آنکھیں رکھتا ہے، لوگوں کو قیادت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کو بدھا یا مسیحؑ نہیں ملتے تو آپ کسی اور کی پیروی کریں گے کیونکہ پیروی کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ ضرورت اس لیے ہے کہ آپ کو علم ہی نہیں کہ کہاں جانا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی کہتا ہے کہ'' میں جانتا ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے'' تو پھر کیا ہونا چاہئے؟

مسیحؑ ہر روز دستیاب نہیں ہوتے۔ بدھا بھی ہمہ وقت دستیاب نہیں ہوتے۔ یہ لوگ ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔ مگر ان کی ضرورت ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اگر آپ کو درست خوراک میسر نہیں تو آپ غلط خوراک کھائیں گے کیونکہ بھوک ہر روز لگتی ہے۔ اندھے کو ڈھونڈنا بے حد آسان کام ہے کہ آپ خود اندھے ہیں۔ آپ اندھے کی زبان سمجھتے ہیں۔ اندھے کی پیروی کرنا بے حد آسان ہے کیونکہ آپ دونوں کا تاریک دنیا سے تعلق ہے۔ آپ دونوں وادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اندھے کی بات کا قائل ہونا بے حد آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ ماسٹر ہے، اس کے بجائے بینا کی بات پر یقین کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ کوئی اور زبان بولتا ہے اور کسی اور دنیا کی باتیں کرتا ہے۔ وہ بے حد اجنبی ہے۔ آپ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ غلط آقا کی پیروی کرنا ہمیشہ آسان ہوتا ہے کیونکہ آپ خود غلط ہوتے ہیں۔ آپ دونوں میں کوئی نہ کوئی قدر مشترک ہوتی ہے۔ تاہم اگر'' اندھا اندھے کی رہنمائی

کرے تو دونوں گڑھے میں گر جاتے ہیں'' ملا نصر الدین کی موت پر اس کے دو حواریوں نے خودکشی کر لی۔ ان کا خیال تھا کہ آقا کے بغیر زندگی کس کام کی؟ مرنے کے بعد تینوں نے دوسری دنیا کے دروازے پر دستک دی۔ ملا آگے اور دونوں حواری اس کے پیچھے تھے۔ دوسری دنیا کے خوبصورت دروازے کو دیکھتے ہوئے ملا نے اپنے حواریوں سے کہا ''دیکھو یہی وہ جگہ ہے جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا اور میں جو وعدہ کروں اسے پورا کرتا ہوں۔ ہم جنت میں پہنچ گئے ہیں۔ تینوں اندر داخل ہو گئے''

رہنما نے انہیں خوبصورت محلات میں پہنچا دیا اور بولا ''اب آپ ہمیشہ یہیں رہیں گے، آپ کو جس شے کی ضرورت ہو مجھے بتائیں، میں اسے فوراً حاضر کر دوں گا'' اس کی بات سن کر ملا نے اپنے حواریوں سے کہا ''دیکھا تم نے، میں نے اسی شے کا وعدہ کیا تھا اور میں اپنا وعدہ ہمیشہ پورا کیا کرتا ہوں''

ملا اور اس کے حواری ایک ہفتہ مزے میں رہے۔ انہوں نے جو چاہا وہ فوراً حاضر کر دیا گیا۔ ان کی تمام تر خواہشات سات روز میں ہی پوری ہو گئیں کیونکہ انہیں کسی شے کے حصول کیلئے کوشش کرنا پڑتی تھی نہ مطلوبہ چیز مہیا ہونے میں کوئی وقت لگتا تھا۔ ساتویں دن تینوں بے حد مایوس ہو گئے۔ جب آپ کو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر سب کچھ مل رہا ہو تو اس میں لطف باقی نہیں رہتا۔ جب خواہش اور تکمیل کے مابین فرق ختم ہو جائے تو آپ اکتا جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امراء عموماً اکتائے اکتائے رہتے ہیں۔ غریب آدمی کی زندگی میں بہر حال کچھ نہ کچھ چاشنی ہوتی ہے مگر امیر آدمی اس سے محروم ہوتا ہے۔ بادشاہوں کو دیکھیں، وہ مردہ اور ہر شے سے اکتائے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں ہر چیز دستیاب ہوتی ہے۔ دستیابی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ غربت اور کمیابی سے بھی بڑا مسئلہ ہے۔

ساتویں دن وہ بری طرح اکتا گئے کیونکہ انہوں نے انتہائی خوبصورت عورتوں، مہنگی ترین شراب، بہترین خوراک اور بیش قیمت لباس سمیت ہر شے سے استفادہ کر لیا تھا۔ اس دوران وہ بادشاہوں کی طرح رہتے رہے تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ آٹھویں دن ملا نے رہنما سے کہا ''ہم ایک نظر دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں'' رہنما نے پوچھا ''کیوں؟'' ملا نے جواب دیا ''اپنی دلچسپی اور خوشی کی بحالی کیلئے ہمارا دنیا کو ایک نظر دیکھنا ضروری ہے'' چنانچہ رہنما نے کھڑکی کھول دی۔ انہوں نے

زمین پر لوگوں اور ہمیں دیکھا۔ انہیں لوگ کڑی مشقت کرتے دکھائی دیے جس کا انہیں خاطر خواہ صلہ نہیں ملتا تھا۔ یوں اپنا دنیا والوں سے موازنہ کر کے وہ جنت میں اپنی دلچسپی دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اب انہوں نے مزید سات دن مزے میں گزارے، تاہم ساتویں دن وہ ایک مرتبہ پھر اکتا گئے۔ اب پہلے والا طریقہ یعنی دنیا کو دیکھنا کارگر نہ تھا۔ چنانچہ ملا نے رہنما سے کہا ''اب میں ایک اور بیہودہ مطالبہ کرنا چاہتا ہوں، ہم ایک نظر دوزخ کو دیکھنا چاہتے ہیں، ایسا کرنے سے ہماری بھوک اور خواہشات دوبارہ زندہ ہو جائیں گی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہم اس خوف میں بھی مبتلا ہیں کہ دوزخ کو دیکھنے کے بعد دوبارہ اکتانے کی صورت میں کیا کریں گے؟''

ملا کی بات سن کر رہنما نے ہنسنا شروع کر دیا اور بولا ''تمہارا کیا خیال ہے کہ تم کہاں ہو؟'' وہ جہنم میں ہی تھے۔

اگر آپ کی تمام خواہشات پوری ہو جائیں تو آپ جہنم میں ہوں گے کیونکہ آپ عدم خواہش کی خوشی سے آشنا نہیں ہیں۔ آپ صرف جدوجہد سے آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کہتے ہیں کہ ''لطف وصل میں نہیں بلکہ انتظار کی کیفیت میں ہوتا ہے'' لطف خواہش کرنے میں ہے، تکمیل میں نہیں۔ جب آپ کی ہر خواہش پوری ہو جائے گی تو ایسے میں آپ کیا کریں گے؟ تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ دوزخ میں ہیں۔

ایسا تبھی ہوتا ہے جب آپ اندھے کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر آپ جنت میں پہنچ جائیں تو وہ بھی جہنم ثابت ہوگی کیونکہ اندھاپن کبھی جنت کو نہیں جاتا۔ جنت ایسی جگہ نہیں کہ جہاں پہنچنا سب سے اہم بات ہو۔ یہ تو محض شعور کی ایک حالت ہے۔ جغرافیائی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ آپ میں ہی کہیں موجود ہے۔ آپ کے اندر جنت اور دوزخ دونوں پائی جاتی ہیں۔ اگر آپ اندھے پن کی پیروی کرتے ہیں تو وہ آپ کو بلندیوں تک کیسے لے جا سکتا ہے؟ وہ آپ کو وادی میں لے جائے گا تاہم آپ میں کسی کی پیروی کرنے کی خواہش موجود ہے۔ اس خواہش سے آگاہ رہئے۔

آپ رہنمائی چاہتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ کسی کی رہنمائی میں چلنے سے ذمہ داری رہنما پر ہی چھوڑ دی جاتی ہے۔ کسی کی پیروی نہ کرنے کی نسبت اندھے رہنما کی پیروی کرنا بہتر ہوتا

ہے۔ یہ آپ کی ذہنی حالت ہے۔ مسیحؑ نے کہا کہ ”جاؤ اور گھر کی چھت پر جا کر لوگوں کو بتا دو کہ آقا یہاں موجود ہے،“ مسیحؑ ظاہر ہو چکا ہے اور موقع بے حد کمیاب ہے۔ اس بات کا بھرپور امکان موجود ہے کہ آپ یہ موقع گنوا دیں گے۔ بھاگیں اور اس شخص کو جا لیں کیونکہ جنگ کا دروازہ کچھ دیر کیلئے ہی کھلتا ہے۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب انسان آگاہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ دروازہ بن جاتا ہے۔ آپ اس کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں اور سچائی سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

آقا وہ نہیں جو آپ کو تعلیم دے بلکہ آقا وہ ہے جو آپ کو بیدار کرے۔ آقا وہ نہیں جو آپ کو کسی قسم کی کوئی اطلاع فراہم کر دے بلکہ آقا وہ ہے جو آپ کو آپ کی ہستی کی ایک جھلک دکھائے۔ مگر یہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اگر مسیحؑ خاموش رہتے تو کوئی انہیں مصلوب نہ کرتا۔ انہیں جلدی تھی اس لیے انہوں نے ملک بھر میں گھومنا اور لوگوں کو بتانا شروع کر دیا۔ اس سے مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ کوئی شخص انہیں نہ سمجھ سکا۔ ہر شخص نے انہیں غلط سمجھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ دو مختلف جہتیں ہیں۔ بات سمجھنا اور سمجھانا ممکن نہیں ہے۔ اس نے خدا کی سلطنت کی بات کی جبکہ لوگ یہ سمجھے جیسے وہ کسی دنیاوی سلطنت کی بات کر رہے ہیں۔

انہوں نے کہا ”میں بادشاہ ہوں“ اور لوگوں نے سمجھا گویا وہ موجودہ بادشاہ کا تختہ الٹنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے سکھایا کہ ”جو لوگ مسکین ہیں وہی دنیا کے وارث ہوں گے“ وہ کسی اور شے کی بابت گفتگو کر رہے تھے مگر لوگوں نے سمجھا کہ وہ اپنے حواریوں کو دنیا کا وارث بنا رہے ہیں۔ سیاست دان خوفزدہ ہو گئے کیونکہ سلطنت، بادشاہ اور زمین کی وراثت جیسی اصطلاحات سیاسی تھیں۔ مذہبی پیشوا بھی خوفزدہ ہو گئے کہ ان کی باتیں خلاف قانون تھیں۔

پیار ہمیشہ قانون سے طاقتور ہوتا ہے۔ پیار کسی قانون کی پیروی نہیں کر سکتا کیونکہ یہی سب سے بڑا قانون ہوتا ہے۔ جب آپ پیار کرتے ہیں تو پھر سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے کیونکہ پیار کبھی کچھ غلط نہیں کر سکتا۔ اس کیلئے کوئی قوانین اور ضوابط نہیں ہوتے۔ قواعد و ضوابط اس لیے ہوتے ہیں کہ آپ پیار نہیں کر سکتے، آپ پیار کے اہل نہیں ہوئے۔ اسی وجہ سے قوانین کی بھرمار ہے تاکہ آپ دوسروں کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ قوانین اس لیے ہیں کہ آپ کو دوسروں کو نقصان پہنچانے سے باز رکھا جا سکے۔ تاہم جب آپ پیار کرتے ہیں تو دوسروں کو نقصان کیوں پہنچائیں گے؟ چنانچہ قوانین کی ضرورت ہی نہیں۔ مسیحؑ نے حتمی قانون کی بات کی۔ یہ قانون ”پیار کا قانون“ ہے۔ ایسا کرنے

سے مذہبی پیشوا خوفزدہ ہو گئے۔ ججز، مجسٹریٹ اور قانونی نظام خوف کا شکار ہو گیا کہ وہ افراتفری اور بے ترتیبی پھیلا دے گا اور ہر طرف لاقانونیت کا راج ہوگا۔ انہیں مصلوب کر دیا گیا کیونکہ وہ مشکلات کا باعث بن چکے تھے۔

ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ایسا ماضی میں ہوا تھا، اب ایسا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہزاروں سال کے تجربات کے بعد بدھا، مہاویرا، زرتشت اور مسیحؑ اس حوالے سے مزید چوکنا ہو گئے ہیں۔ مگر نہیں، اب بھی ایسا ہی ہے۔ انسان نے ماضی سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس کی حماقت حتمی ہے اور وہ اپنی حماقتوں کی پرفریب توجیہات کیے چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی حماقت کو مزید قوی کرتا ہے، اس کی جہالت کچھ ایسی ہے کہ وہ اس جہالت کے خاتمے کی کوشش کرنے والے کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے۔ دوست دشمن لگتے ہیں اور دشمن دوستوں جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ جو لوگ رہنمائی کر سکتے ہیں وہ گمراہی کی طرف جا رہے ہیں اور اندھے آپ کے رہنما بن بیٹھے ہیں۔

سب سے پہلے رہنمائی کی اپنی ضرورت کو سمجھیں۔ یہ خوبصورت شے ہے کیونکہ اس سے آپ کی جستجو کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ تاہم کسی کی پیروی میں جلد بازی مت کریں۔ آپ کیسے فیصلہ کریں گے؟ پیمانہ کیا ہے؟ متلاشیء حق کیلئے یہ بیحد الجھا دینے والی بات ہے۔ مسیحؑ اور اندھے میں تمیز کیسے کی جائے؟ قطعیت ناممکن دکھائی دیتی ہے مگر قطعیت کی جھلکیاں ممکن ہیں۔ آپ مطلق پر تیقن نہیں ہو سکتے کیونکہ اشیا کی بنیادی فطرت یہ ہے کہ ”اندھا کیسے فیصلہ کرے گا کہ دوسروں کی آنکھیں ہیں؟“ واحد فیصلہ اور واحد قطعیت تبھی ممکن ہے جب وہ دیکھنا شروع کر دے گا۔ تبھی وہ قابل ہو پائے گا۔ مگر تب تو اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ جب آپ بدھا بن جاتے ہیں تو پھر بدھا کی پہچان کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب آپ مسیحؑ ہو جاتے ہیں تو پھر مسیحؑ کو جاننے یا ان کی پیروی کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بظاہر مہمل مگر حقیقت میں صحیح بات ہے۔

آپ نابینا ہیں اور آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ آپ کیسے فیصلہ کریں گے؟ الفاظ کی مدد سے؟ تب تو آپ دھوکہ کھا جائیں گے کیونکہ عالم، پنڈت اور پیشوا الفاظ کے معاملے میں بے حد ہوشیار ہوتے ہیں۔ کوئی انہیں ہرا نہیں سکتا کیونکہ وہ طویل عرصہ سے یہی کام کرتے چلے آئے ہیں۔ مسیحؑ کے الفاظ اس قدر شاندار معلوم نہیں ہوتے۔ یہودیوں کا اعلیٰ ترین پیشوا الفاظ کے معاملے میں انہیں با آسانی مات دے سکتا ہے۔ یہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کبیر یا بدھا کو دلیل کے ذریعے با آسانی

رد کیا جاسکتا ہے۔ انہیں منطق کے ذریعے باآسانی شکست دی جاسکتی ہے۔ آپ الفاظ کے ذریعے رائے قائم نہیں کرسکتے۔ آپ دھوکہ کھا جائیں گے۔ یہ پیمانہ استعمال نہ کریں۔ مسیحؑ کو اس کے وجود سے ہی پہچانا جاسکتا ہے۔ اس کے قریب جائیں۔ اس کی باتیں سننے کی کوشش مت کریں بلکہ اسے سننے کی کوشش کریں۔ کلید یہ ہے کہ اس کے قریب ہو جائیں۔ ہندومت میں اسے ''ست سنگ'' کہا جاتا ہے جس کا مفہوم ''سچائی سے قریب ہونا'' ہے۔ بس اس سے قریب ہو جائیں، یہ مت سنیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے بلکہ یہ سننے کی کوشش کریں کہ وہ خود کیا ہے۔ اس سے علمی بحث و مباحثے کی توقع مت رکھیں۔

وجود مرتعش ہوتا ہے۔ یہ پھول کی طرح کھلتا ہے اور خوشبو پھیلاتا ہے۔ اگر آپ مسیحؑ کے قریب خاموش رہ سکتے ہیں تو اس کی خاموشی سن سکیں گے۔ یہ خاموشی آپ کو بے حد سعادت بخشے گی نیز آپ کو پیار اور رحمدلی کے جذبات سے معمور کر دے گی۔ یہی پیمانہ ہے۔ اگر آپ کسی پنڈت یا عالم کے ساتھ ایسا کریں گے تو آپ کو مصائب کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ آپ کی طرح اس کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔

اگر آپ ان الفاظ پر دھیان دیں گے تو وہ بے حد عظیم دکھائی دے گا۔ اس کے بجائے اگر آپ اس کے وجود، اس کے ارتعاش اور دھڑکن کو دیکھیں گے تو وہ آپ کی طرح یا شاید آپ سے بھی زیادہ خراب حالت میں نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ الفاظ کا آدمی بن گیا ہے۔ وہ اپنا غم چھپانے کیلئے ایسا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نظریات، فلسفے اور نظام کی بات کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بحث کرتا ہے کیونکہ اسے علم ہی نہیں ہے۔

جو شخص جانتا ہو وہ بحث و مباحثہ نہیں کرتا، وہ ہمیشہ سیدھی اور سادہ بات کہتا ہے۔ مسیحؑ کے ان اقوال کو دیکھیں۔ وہ بحث کر رہے ہیں نہ وجوہات بیان کر رہے ہیں۔ وہ سادگی سے اپنی بات بیان کرتے ہیں۔

''اونچے پہاڑ پر بنا شہر مستحکم ہوتا ہے جو گرتا ہے نہ چھپ سکتا ہے'' کوئی دلیل نہیں، محض حقیقت پر مبنی سادہ سا بیان ہے۔

''تم نے مجھ سے جو کچھ سنا اسے گھر کی چھت پر جا کر دوسروں کو بتا دو، کوئی شخص چراغ جلا کر اسے برتن تلے دھرتا ہے نہ چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ اسے نمایاں مقام پر رکھتا ہے تاکہ ہر آنے جانے

والا اس کی روشنی سے مستفید ہو سکے'' مسیحؑ نے کوئی دلیل نہیں دی اور کوئی بات ثابت کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ سادہ سا بیان ہے۔ مسیحؑ نے کہا ''اگر اندھا اندھے کی پیروی کرے تو دونوں گڑھے میں جا گرتے ہیں'' یہ حقیقت پر مبنی سادہ بات ہے۔ کوئی باعلم آدمی ان الفاظ کو مزید خوبصورت انداز میں استعمال کرسکتا ہے تاہم تب آپ دھوکہ کھا جائیں گے۔

جب آپ کو کسی آقا (استاد/رہنما) کی تلاش ہو تو اس کی ہنسی کو سننے کی کوشش کریں۔ اس کے وجود کو سننے کا فن سیکھیں۔ بس اس کے قریب ہو جائیں، اسے دل سے محسوس کریں۔ اچانک آپ کو احساس ہوگا کہ آپ میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے کیونکہ وہ شخص مقناطیسی قوت کا مالک ہے۔ اچانک آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ میں کوئی گہری تبدیلی رونما ہونے جا رہی ہے۔ اب آپ پہلے جیسے نہیں رہے، آپ کا کمرہ نامعلوم روشنی سے منور ہو گیا ہے۔ آپ کے کندھوں سے بوجھ اتر گیا ہے اور محسوس ہوتا ہے گویا آپ کو پر لگ گئے ہوں اور آپ اڑ سکتے ہوں۔ یہ ایک تجربہ ہے۔ صرف یہی تجربہ آپ کو درست انسان تک لے جائے گا۔ وہ بینا آدمی ہوگا اور آپ کی رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتا ہوگا۔ وہ آپ کو لے کر کہاں جا رہا ہے؟ وہ آپ کو آپ کی جانب لے جا رہا ہے۔ باعلم آدمی آپ کو ہمیشہ کہیں اور لے جاتا ہے۔ وہ آپ کو جنت یا آسمان میں موجود کسی جگہ لے جاتا ہے۔ وہ آپ کو مستقبل کے کسی مقصد کی جانب لے جاتا ہے۔ مگر وجود کا آدمی، مسیحؑ یا بدھا آپ کو کہیں اور نہیں بلکہ آپ ہی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ آپ ہی مقصد اور آپ ہی ہدف ہیں۔

دل سے سنیں۔ ''ست سنگ'' ہی پیمانہ ہے۔ وگرنہ آپ کئی جنم سے اندھوں کی پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں اور آپ اپنے اندھے رہنما سمیت بار بار گڑھے میں گر رہے ہیں۔

گڑھے کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ جب مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''وہ گڑھے میں جا گرتے ہیں'' تو گڑھے سے مراد ''رحم'' یا ''بچہ دانی'' ہے۔ جب اندھا رہنمائی کرتا ہے تو دونوں ایک مرتبہ پھر رحم میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی گڑھا ہے۔ یہاں سے وہ دوبارہ جنم لیتے ہیں اور ویسی ہی پرآلام زندگی گزارتے ہیں جو وہ پہلے گزار چکے ہیں۔ ایسے میں وہی اذیت نئی شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔ کوئی حقیقی تبدیلی جنم نہیں لیتی اور کہانی وہی رہتی ہے۔ سب کچھ یکساں رہتا ہے۔ صرف ظاہری اشکال تبدیل ہو جاتی ہیں۔ آپ دوبارہ دوزخ میں اور تکلیف کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ رحم گڑھے کا نام ہے۔

جب ''وجود'' کا آدمی آپ کی رہنمائی کرتا ہے تو آپ کبھی گڑھے میں نہیں گرتے۔ایسی صورت میں آپ کسی اور جہت میں پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ دنیا اس قابل نہیں رہتی کہ یہاں دوبارہ پیدا ہوا جائے۔آپ یہاں سے غائب ہو کر کہیں اور ظاہر ہو جاتے ہیں۔یہ ''کہیں اور'' خدا ہے اور ''نروان'' اسی کا نام ہے۔

☆☆☆

مسیحؑ نے اپنے حواریوں سے کہا

''میرا موازنہ نہ کریں اور مجھے بتائیں کہ میں کیسا دکھائی دیتا ہوں''

سائمن پیٹر نے انہیں کہا

''آپ نیک ترس فرشتے جیسے ہیں''

میتھیو نے انہیں کہا

''آپ سمجھ بوجھ کے حامل عقلمند جیسے ہیں''

تھامس نے انہیں کہا

''آقا، میں یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ آپ کس جیسے دکھائی دیتے ہیں''

مسیحؑ نے کہا

''میں آقا نہیں ہوں، کیونکہ تم نشے میں ہو، تم اس ندی کے پانی کے نشے میں ہو جسے میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں''

مسیحؑ نے اسے ساتھ لیا اور تین الفاظ کہے

جب تھامس اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا

''مسیحؑ نے تمہیں کیا کہا''

تھامس نے انہیں جواب دیا

''اگر میں تمہیں مسیحؑ کے بتائے الفاظ بیان کر دوں تو تم پتھر اٹھا لو گے اور مجھ پر برساؤ گے، ان پتھروں سے آگ نکلے گی جو تمہیں جلا کر رکھ دے گی''

پانچواں باب

سچائی

مسیحؑ یا بدھا جیسے اشخاص کی موجودگی میں آپ ہرممکن طور سے ان سے دور بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔آپ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کے لیے موت کے پیامبر ہوتے ہیں۔ یقیناً آپ اپنے اس فرار کی پرفریب توجیہات کریں گے اور اپنے فرار کے حق میں بظاہر معقول وجوہات تلاش کرلیں گے۔ایسے میں آپ اپنے ذہن میں یہ دلیل تراشتے ہیں کہ "یہ شخص مسیحؑ نہیں ہے،اسے تاحال آگاہی حاصل نہیں ہوئی" آپ کو اس شخص میں کوئی نہ کوئی خرابی دکھائی دے جائے گی چنانچہ آپ خود کو مطمئن اور پرسکون سمجھ سکتے ہیں۔آپ اس شخص سے اجتناب برتیں گے۔اس کا سامنا کرنا خطرناک ہے کیونکہ وہ آپ کے آرپار دیکھ سکتا ہے۔آپ اس کیلئے شفاف جسم بن جاتے ہیں۔آپ خود کو اس سے نہیں چھپا سکتے۔آپ اپنا جھوٹ پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔ آپ اس کیلئے کھلی کتاب کی مانند ہوتے ہیں۔

آپ زندگی بھر چھپتے چلے آئے ہیں۔آپ زندگی بھر جھوٹی اور غیر مستند زندگی گزارنے کی کوششوں میں مصروف رہے ہیں۔آپ جھوٹ میں زندہ رہے ہیں اور وہ آپ کے آرپار دیکھ سکتا ہے۔اس کے سامنے آپ کی حالت لرزتے پتے جیسی ہوگی۔اس کے سامنے آپ اپنے سچ تک محدود ہوکر رہ جائیں گے۔اس کے سامنے آپ اپنا جھوٹا چہرہ قائم نہیں رکھ سکتے۔وہ بلائے ناگہانی ثابت ہوگا۔چنانچہ صرف بلند حوصلہ لوگ ہی مسیحؑ کے قریب آسکتے ہیں۔مسیحؑ جیسے شخص سے قریب ہونے کیلئے بے حد ہمت درکار ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ تحت الثریٰ میں چھلانگ لگانے کیلئے تیار ہیں۔آپ خود کو کھونے کیلئے تیار ہیں۔

سمندر میں جہاں دور دور تک ساحل کا پتا نہ ہو "مسیحؑ" کے ساتھ سفر کرنا بے حد ہمت کا تقاضا کرتا ہے۔یہی اصل مسئلہ ہے۔بہت کم لوگ مسیحؑ کی پیروی کریں گے۔جو بھاگ نکلتے ہیں وہ اسے کھودیتے ہیں۔درحقیقت وہ اپنی زندگی کا مفہوم ہی کھودیں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ مسیحؑ سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں تو دراصل اپنی سچائی سے بھاگنے کی کوشش کررہے ہوتے ہیں۔مسیحؑ آپ کا مستقبل ہے۔آپ بیج ہیں جبکہ وہ درخت ہے۔وہ کھلنے آیا ہے اور آپ کا مستقبل اور آپ کا امکان بننے آیا ہے۔اس سے فرار دراصل اپنے حتمی امکان سے فرار اختیار کرنا ہے۔

مگر وہ جو قریب آتے ہیں ان کا قریب آنا مسیحؑ سے سامنا ہونے کی ضمانت نہیں۔جو بھاگ نکلے وہ ختم ہوگئے مگر جو قریب آتے ہیں اور مسیحؑ کی قربت میں زندگی گزارتے ہیں وہ بھی اس سے اجتناب برت سکتے ہیں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ غلط مقاصد کی خاطر اس سے قریب آئے ہوں۔چنانچہ ہزاروں میں سے چند ہی اسے منتخب کریں گے۔اسے منتخب کرنے والے چند لوگوں میں سے تمام درست اور اچھے مقاصد کی خاطر اس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔جو لوگ غلط مقاصد کی خاطر اس کے ساتھ ہوں گے وہ بھی اسے کھو بیٹھیں گے۔

آپ غلط وجوہات کی بنا پر بھی کسی آگاہ شخص کے ساتھ ہوسکتے ہیں۔اپنے مقاصد پر غور کریں۔آپ کو جستجو کیوں ہے؟ آپ استاد کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ آپ کے حقیقی مقاصد کیا ہیں؟ کیا آپ کو سچائی کی تلاش ہے؟ بہت کم لوگوں کو سچائی درکار ہوتی ہے۔ہوسکتا ہے آپ کو سچائی کے بجائے خوشی درکار ہو۔جب سچائی مل جاتی ہے تو خوشی خود بخود آجاتی ہے۔تاہم اگر آپ کو خوشی کی تلاش ہے تو پھر سچائی حاصل نہیں کرپائیں گے کیونکہ خوشی سچائی کی ضمنی پیداوار ہوتی ہے۔آپ اسے براہ راست حاصل نہیں کرسکتے۔ایسا کوئی طریقہ موجود نہیں ہے۔یہ سچائی کے راستے ہی آتی ہے۔اگر آپ حقیقت تک پہنچ جائیں تو خوشی مل جائے گی۔یہ عکس ہے اور سچائی کیساتھ آتا ہے۔ تاہم اگر آپ کو خوشی کی تلاش ہے تو اس کا حصول ممکن نہیں اور سچائی بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔

سو میں سے ننانوے متلاشی خوشی ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔انہوں نے تکالیف جھیلی ہیں۔زندگی مصیبت بن چکی ہے۔انہیں تریاق چاہئے۔خوشی کی خاطر بدھا یا مسیحؑ کے ساتھ رہنا اسے دوبارہ کھودینے کے مترادف ہے کیونکہ ایسے میں آپ کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔خوشی کبھی مقصد نہیں بن سکتی۔یہ خود بخود آتی ہے۔آپ کو اس کے حوالے سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔یہ ہمیشہ

ضمنی پیداوار رہی ہے۔ آپ کو محض درخت کی حفاظت کرنا ہے۔ اس پر پھول خود بخود لگ جائیں گے۔ آپ کو براہ راست پھولوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ جاتے ہیں تو انہیں کھو دیں گے۔ اگر آپ پھولوں کا پیچھا کریں گے تو انہیں کھو بیٹھیں گے۔ تاہم اگر آپ درخت پر توجہ دیں اور اس کی نگہداشت کریں تو پھول اپنے وقت پر خود بخود اگ آئیں گے۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو ان کے بارے میں سوچنے کی بھی ضرورت نہیں۔

جب آپ خوش ہوتے ہیں تو محض چند لمحات کیلئے اس کیفیت میں رہتے ہیں۔ ایسا شخص ملنا بہت مشکل ہے جو چند لمحوں کیلئے بھی خوش نہ رہا ہو کیونکہ اگر آپ چند لمحوں کیلئے بھی خوش نہیں رہے اور آپ نے کبھی خوشی کا ذائقہ نہیں چکھا تو پھر آپ اسے تلاش نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کو خوشی کا علم ہی نہیں تو پھر آپ اسے کیوں تلاش کر رہے ہیں؟ اسے جانے بغیر آپ اسے اپنا مقصد کیسے بنا سکتے ہیں؟ آپ اس کا ذائقہ چکھ چکے ہیں، یہ عارضی اور محض ایک جھلک تھی۔ اس کے بعد پھر تاریکی کا راج ہے۔ ایک جھلک کے بعد پھر اذیت، صبح ایک لمحے کیلئے آتی ہے اور اس کے بعد ایک بار پھر آدھی رات کا راج ہوتا ہے۔ آپ نے اسے چکھا ہے مگر اس میں داخل نہیں ہوئے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔

جب بھی آپ کو خوشی محسوس ہوئی اس وقت آپ اس کی تلاش میں مصروف نہیں تھے۔ یہی خوشی کی بابت پہلی بنیادی بات ہے۔ آپ کسی اور شے کی تلاش میں سرگرداں تھے مگر آپ کو خوشی مل گئی۔ مثال کے طور پر آپ نے ارشمیدس کی کہانی سن رکھی ہوگی۔ وہ ایک سائنسی سچائی کی تلاش میں تھا۔ اس نے مسئلے پر تجربات کیے، کام کیا، سوچ بچار کی اور دن رات ایک کر دیے۔ وہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ تب ایک دن غسل کرتے ہوئے اسے مذکورہ مسئلہ سمجھ میں آ گیا۔ اس نے سائنسی حقیقت پا لی۔ وہ برہنہ تھا مگر اپنی برہنگی بھی بھول گیا۔ جب آپ خوش ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ اگر آپ نہیں بھولتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ خوش نہیں ہیں۔ خوشی کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود غیر موجود ہو چکے ہیں۔ خوشی صرف اس وقت ملتی ہے جب آپ موجود نہیں ہوتے۔

مسئلہ حل ہو گیا تھا اور ارشمیدس کا ذہنی تناؤ ختم ہو گیا۔ وہ برہنہ حالت میں ''یوریکا، یوریکا'' (میں نے پا لیا، میں نے پا لیا) چلاتا ہوا گلیوں میں بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے سوچا شاید وہ پاگل

ہو گیا ہے۔ وہ اس کے بارے میں پہلے ہی شبہات کا شکار تھے۔ اب ان کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ ان کا ہمیشہ سے یہی خیال تھا کہ ''بہت زیادہ سوچ بچار کرنا غلط ہوتا ہے'' اور یہ آدمی بہت زیادہ سوچ و بچار کرتا رہا تھا۔ اب یہ پاگل ہو چکا ہے اور گلیوں میں ''یوریکا، یوریکا'' چلاتا پھرتا ہے۔

کیا ہوا تھا؟ اس لمحے ارشمیدس پر کس قدر وجد طاری تھا حالانکہ یہ حتمی سچائی نہ تھی بلکہ محض ایک عام سا مسئلہ تھا۔ اب یہ عام بات بن چکی ہے۔ ایک مرتبہ دریافت کے بعد سائنسی سچائیاں عام بات بن جاتی ہیں۔ تاہم ارشمیدس نے اسے دریافت کیا تھا۔ دریافت کے اس لمحے میں تناؤ کی تمام کیفیت جاتی رہی اور وہ اس قدر خوشی اور کیف کی حالت میں تھا کہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ یاد رکھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ جب بھی آپ خوش ہوتے ہیں تو دراصل خوشی کے بجائے کسی اور شے کی تلاش میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگر آپ براہ راست خوشی تلاش کریں تو اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کھو بیٹھیں گے۔ خوشی سچائی کی ضمنی پیداوار ہے۔ آپ کسی اور شے کی تلاش میں ہیں۔ دریافت آپ کو مکمل کر دیتی ہے کہ تمام تر تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آپ پرسکون ہو جاتے ہیں اور خود کو خوشی سے معمور سمجھنے لگتے ہیں۔ خوشی ایک ضمنی پیداوار ہے۔

یاد رکھنے کی دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ کو اس کی تلاش ہے تو اس پر خود کو کیسے کھو سکتے ہیں؟ جستجو کرنے والا کبھی خود کو نہیں کھوتا۔ انا قائم رہتی ہے اور آپ بدستور حوالے کا نکتہ بنے رہتے ہیں۔ جب بھی خوشی وقوع پذیر ہوتی ہے تو آپ وہاں نہیں ہوتے۔ خوشی کے لمحات کو یاد رکھیں۔ آپ وہاں نہیں تھے۔ ہوسکتا ہے ایسا گہرے پیار میں ہوا ہو، ممکن ہے دریافت کے مرحلے میں ہوا ہو یا محض تاش کھیلتے ہوا ہو۔ تاہم ایسا ضرور ہوا کہ آپ کھو گئے۔ اچانک اور اوپر کو اٹھتی ہوئی موج۔ کوئی بھی شے اسے شروع کر سکتی ہے مگر براہ راست تلاش خطرناک ہے۔ آپ اسے کھو بیٹھیں گے۔

اگر آپ خوشی کی تلاش میں استاد کے پاس جاتے ہیں تو آپ غلط مقصد کے باعث اس سے قریب ہیں۔ ایسے میں آپ ہمیشہ اپنے غلط مقصد میں چھپے رہیں گے۔ آپ جسمانی طور پر تو اس سے قریب رہتے ہیں تاہم استاد اور آپ کے مابین روحانی اعتبار سے بہت زیادہ فاصلہ ہوتا ہے۔ آپ نابینا ہیں۔ آپ اس شخص کو جاننے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ کیلئے اسے جاننا ممکن نہیں ہے کیونکہ آپ کی آنکھیں غلط مقاصد سے پر ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ سرے سے خوشی کے متلاشی ہی نہ ہوں اور آپ کے مقاصد اس سے بھی گھٹیا ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ مزید خود غرضانہ حالت کے حصول

کیلئے اس سے قریب ہوں۔ ایسے میں آپ اسے مکمل طور سے کھو بیٹھیں گے۔ یہ مزید کمتر مقصد ہے۔ مقصد جس قدر گھٹیا ہوگا اسے کھونے کا امکان بھی اتنا ہی بڑھ جائے گا کہ آپ مزید اندھے ہو جائیں گے۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ بے حد عام وجوہات کی بنا پر اس سے قریب ہوں۔ مثال کے طور پر آپ صحت کے متلاشی ہیں۔ آپ بیمار ہیں اور مسیحؑ آپ کو صحت دے گا، یا آپ غریب ہیں اور مسیحؑ آپ کو دولت دیں گے۔ ان کی رحمت آپ کیلئے دھن دولت بن جائے گی۔ آپ بے اولاد ہیں اور وہ آپ کو بچہ عطا کریں گے۔

مقصد جس قدر گھٹیا ہوگا آپ کیلئے اسے کھونے کا امکان اتنا ہی بڑھ جائے گا۔ مقصد جس قدر کمتر ہوگا آپ اسی قدر گہری وادی میں ہوں گے جبکہ مسیحؑ پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہے۔ ایسے میں آپ کا اس سے فاصلہ مسلسل بڑھتا چلا جائے گا۔ بہت سے لوگ بھاگ نکلے، مگر جو اس سے قریب ہوئے وہ تمام لوگ بھی اس سے قریب نہ تھے۔ صرف وہی قریب ہوئے جو درست مقاصد کیلئے اس کے پاس آئے۔ یہ درست مقصد سچائی ہے، مگر آپ نے کبھی اس کی خواہش کیوں نہیں کی؟

سچائی اس قدر برہنہ اور خشک دکھائی دیتی ہے کہ اس کے حصول کی خواہش نظر نہیں آتی۔ خوشی قابل قدر شے لگتی ہے اور اگر میں اصرار کروں کہ ''سچائی کی تلاش کریں، خوشی آپ کو اس کی ضمنی پیداوار کے طور پر خود بخود مل جائے گی'' تو آپ اس ضمنی پیداوار کے حصول کی خاطر سچائی کی تلاش پر راضی ہو سکتے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ آپ کا اصل مقصد خوشی ہوگا۔ اگر آپ کو علم ہو کہ یہ خوشی حاصل کرنے کیلئے سچ تلاش کرنا پڑتا ہے تو آپ سچائی کی تلاش شروع کر دیں گے۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے آپ سچائی کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوں گے بلکہ آپ کا ذہن خوشی پر ہی مرکوز رہے گا۔ ایسا ارتکاز غلط ہوتا ہے۔

آپ سچائی کی تلاش کے طور پر مسیحؑ، بدھا اور زرتشتا وغیرہ کے قریب آ سکتے ہیں۔ بصورت دیگر آپ کبھی قریب نہیں آتے۔ آپ کسی دوسری وجہ کیلئے جسمانی اعتبار سے تو قریب ہوتے ہیں مگر روحانی طور پر بے حد دور ہوتے ہیں۔ دونوں میں وسیع فاصلہ ہوتا ہے۔

اب مسیحؑ کے ان اقوال پر نظر ڈالیے۔

مسیحؑ نے اپنے حواریوں سے کہا ''میرا موازنہ نہ کیجئے اور بتائیے کہ میں کس جیسا دکھائی دیتا ہوں'' مسیحؑ نے یہ سوال کیوں کیا؟ کیا وہ اپنے آپ سے آگاہ نہیں ہیں؟ کیا انہیں اپنے حواریوں

سے اس کا پتا چلنا ہے؟ وہ اپنے حواریوں کے ذریعے اپنے آپ کو کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حواری جو کچھ بھی کہیں گے اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ وہ مسیحؑ کے قریب کیوں ہیں۔ آپ اپنی خواہش کے مطابق اپنے استاد کی شبیہ تخلیق کرتے ہیں۔ اگر آپ بیماری کے باعث مسیحؑ کے قریب گئے ہیں تو وہ آپ کو مسیحا معلوم ہوں گے۔ آپ اپنی خواہشات کے ذریعے دیکھتے ہیں اور اپنی خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر آپ طاقت کے حصول کی خاطر مسیحؑ کے پاس جاتے ہیں تو وہ آپ کو قادر مطلق اور انتہائی طاقتور دکھائی دیں گے کہ طاقتور ہونے کی صورت میں ہی وہ آپ کو کچھ دے سکتے ہیں۔ اگر آپ حیات جاوداں کے خواہاں ہیں اور مرنے سے ڈرتے ہیں تو مسیحؑ کی شبیہہ آپ کی جستجو کی عکاس ہوگی۔

مسیحؑ نے اپنے حواریوں سے یہ کیوں کہا کہ ''بتاؤ میں کون ہوں؟'' انہوں نے یہ جاننے کیلئے پوچھا کہ ان کے حواری کیا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اپنی کسی خواہش کے بل بوتے پر مسیحؑ سے قریب جائیں گے تو اسے کھو بیٹھیں گے کیونکہ بدھا اور مسیحؑ کو جاننے کیلئے آنکھوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کو ان تک رسائی کیلئے تظلیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو محض سادہ حقیقت ہی مدنظر رکھنا چاہئے۔ مسیحؑ ایک حقیقت ہیں۔ وہ اس دنیا میں ممکن ترین پراثر حقیقت ہیں۔ ان پر براہ راست نگاہ ڈالیں اور اسے فوری دیکھیں۔ اپنی خواہشات کو درمیان میں مت لائیں۔ مسیحؑ کی شبہیہ مت بنائیں، بصورت دیگر آپ دیکھیں گے مگر اس میں آپ کی اپنی خواہش جھلکے گی۔

مسیحؑ نے اپنے حواریوں سے کہا ''میرا موازنہ نہ کریں اور مجھے بتائیں کہ میں کس جیسا دکھائی دیتا ہوں'' سائمن پیٹر نے انہیں کہا ''آپ نیک ترس فرشتے جیسے لگتے ہیں''

یہ شخص یقیناً اخلاقی واعظ رہا ہوگا۔ اسے یقیناً اپنی بداخلاقی پر شرمندگی ہوگی کیونکہ آپ دوسروں کے بارے میں جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ دراصل آپ کی اپنی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ جو رائے قائم کرتے ہیں وہ دوسروں کے بارے میں رائے نہیں ہوتی بلکہ آپ کی اپنی ذات کے بارے میں آپ کی رائے ہوتی ہے۔ مسیحؑ نے بار بار کہا کہ ''رائے قائم مت کریں، کیونکہ آپ کی تمام آراء غلط ثابت ہوں گی'' چور آپ کے نزدیک گناہ گار ہے، کیوں؟ اس لیے کہ آپ اپنی نجی ملکیت کے حوالے سے بے حد حساس ہیں۔ چور کے گناہ گار ہونے کے حوالے سے یہ رائے دراصل چور سے متعلق نہیں بلکہ یہ آپ کے احساس ملکیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک انگریز مر گیا۔ مرنے کے بعد اسے دوزخ میں ڈال دیا گیا۔ وہاں شیطان نے اس سے پوچھا ''تم کون سی دوزخ کو ترجیح دو گے؟ کیونکہ ہمارے پاس برطانوی، جرمن، چینی، روسی اور ہندوستانی سمیت ہر قسم کی جہنم موجود ہے''

انگریز نے جواب دیا ''میں ہندوستانی جہنم میں جانا پسند کروں گا''

شیطان حیران ہوا اور کہنے لگا ''تم تو انگریز معلوم ہوتے ہو، ایسے میں ہندوستانی جہنم منتخب کرنے کا کیا مقصد؟''

انگریز نے جواب دیا ''اگرچہ میں برطانوی ہوں مگر ہندوستان میں رہتا رہا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ ہندوستانی دوزخ میں آگ نہیں جلے گی''

آپ کا ذہن تجربات کو جمع کر لیتا ہے۔ آپ جنگ، دوزخ اور دوسرے لوگوں کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ دراصل آپ کے تجربے کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ آپ کے الفاظ سے جھلکتا ہے۔

سائمن پیٹر نے کہا ''آپ خداترس فرشتے جیسے ہیں''

اس فقرے میں وہ دو باتیں کہہ رہا ہے۔ ان میں سے ایک بات ''خداترس یا منصف المزاج'' ہونا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ہمیشہ غلط باتوں اور گناہوں سے خوفزدہ رہا ہوگا۔ وہ بداخلاق ہونے سے ڈرتا رہا ہوگا۔ اس کا یہی خوف اور اچھائی کی خواہش مسیحؑ کی شبیہ میں جھلکتی ہے۔ وہ اسی خواہش کے سبب مسیحؑ کے ساتھ ہے۔

ایک بات یاد رکھیں۔ متضاد اشیا ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ اگر آپ مرد ہیں تو عورت کی کشش آپ کو اپنی جانب کھینچے گی۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔ وہ آپ سے متضاد ہے اس لیے پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ تاہم عورت کے ساتھ رہنا مشکل ہوگا کیونکہ وہ متضاد ہے۔ شادیوں کا یہی المیہ ہے۔ ابتداء میں متضاد کیلئے کشش محسوس ہوتی ہے مگر جب آپ متضاد کے ساتھ رہتے ہیں تو مشکلات جنم لیتی ہیں کیونکہ وہ ہر انداز سے متضاد ہے۔ اس کی منطق آپ سے بیحد مختلف ہے۔ مرد کبھی عورت کو نہیں سمجھ سکتا۔ سمجھنا ممکن بھی نہیں کیونکہ مرد مرد کی طرح سوچتا ہے اور عورت عورت کی طرح سوچتی ہے۔ دونوں کی مختلف جہات ہیں۔ عورت زیادہ وجدانی ہوتی ہے، وہ منطقی نہیں ہوتی، وہ جلد نتائج پر پہنچ جاتی ہے اور تقریباً ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ یہ اور بھی بڑا مسئلہ ہے۔ وہ

آپ کو قائل نہیں کر سکتی، وہ جو کچھ بھی کہے آپ کو قائل نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے پاس منطق نہیں ہوتی۔ مگر اس کے پاس بصیرت ہوتی ہے، وہ فوراً دیکھ لیتی ہے۔

ایک مرتبہ ملا نصرالدین کو کسی جرم میں دھر لیا گیا۔ اسے عدالت میں پیش کیا گیا جہاں بارہ خواتین جج موجود تھیں۔ ملا نے انہیں دیکھتے ہی اعتراف جرم کر لیا اور کہنے لگا ''میں گھر میں ایک عورت (بیوی) کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتا تو ان بارہ عورتوں کو کیسے قائل کر سکتا ہوں۔ انہیں دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں۔ میں نے جرم کیا اور مجھے اس کی سزا دی جائے''

ہر شوہر جانتا ہے کہ عورت کو دھوکہ دینا کس قدر مشکل کام ہے۔ آپ ہر طرح کی منصوبہ بندی کرتے ہیں مگر گھر پہنچتے ہی سب کچھ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ بیوی آپ کو آرام سے پکڑ لیتی ہے اور جہاں زخم لگا ہوتا ہے وہیں چوٹ لگاتی ہے۔ اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر لیتی ہے۔ اس کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔

عورت مرد کو کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ بس یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اسرار ہمیشہ پرکشش ہوتے ہیں۔ تاہم کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنا ہمیشہ مشکلات کا باعث ہوتا ہے جسے آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ایسے میں لڑائی ناگزیر ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں محبت پائی جاتی ہے وہاں لڑائی ضرور ہوتی ہے، ہر عورت جھگڑا ہے۔

متضاد چیزیں ہمیشہ باعث کشش ہوتی ہیں۔ اگر آپ لالچی ہیں تو کسی ایسے آدمی سے متاثر ہوں گے جو دنیا تیاگ چکا ہو۔ آپ کسی ولی کے پاس جائیں گے جو دنیا کو ترک کر چکا ہو۔ یہ بیحد مشکل ہے کیونکہ اس سے بہت سی مشکلات جنم لیتی ہیں۔ ہندوستان میں جین مت کے پیروکاروں کو دیکھیں۔ وہ بے حد امیر ہوتے ہیں اور دولت لالچ کے بغیر ہاتھ نہیں آیا کرتی۔ یہ لوگ اپنے ولیوں کو کپڑے بھی نہیں پہننے دیں گے۔ نہیں، اس کی اجازت نہیں۔ مستند جین ولی بالکل برہنہ ہوتا ہے۔ اس کی ملکیت میں کوئی شے نہیں ہوتی حتیٰ کہ یہ کپڑوں سے بھی بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کے پاس صرف اس کا جسم ہوتا ہے اور بس۔ اسے ہاتھوں سے کھانا پڑتا ہے، اسے دو مرتبہ خوراک لینے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ ہاتھ میں جتنا کھانا آ جائے اسی پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ وہ زمین پر سوتا ہے اور اس کے سر پر آسمان کے سوا کسی شے کا سایہ نہیں ہوتا۔ آسمان ہی اس کی واحد چھت ہوتی ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ یہ کیوں ہوتا ہے؟

متضاد ہمیشہ پرکشش ہوتا ہے۔ امن کے داعی مذاہب کے پیروکار تشدد کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں۔ اگر وہ متشدد ہیں تو امن کا مذہب کیوں اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ متضاد پرکشش ہوتا ہے۔ متضاد ہمیشہ پرکشش ہوتا ہے کیونکہ یہ جنس کا بنیادی نمونہ ہے۔ جنس کی یہ تقسیم ہر سمت میں آپ کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

سائمن پیٹر نے مسیحؑ سے کہا ''آپ نیک ترس فرشتے جیسے دکھائی دیتے ہیں'' یقیناً اس آدمی کو اپنی بداخلاقی پر شرمندگی ہوگی۔ چاہے وہ درست تھا یا غلط، تاہم وہ نادم ضرور تھا۔ وہ اس لیے مسیحؑ کی جانب متوجہ ہوا کہ وہ فرشتے جیسے دکھائی دیتے تھے۔ وہ خالص اور معصوم تھے۔ انہوں نے کبھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی انہیں کنواری ماں کے بطن سے پیدا ہونے والا بیٹا کہتے ہیں جو کہ لغو بات ہے۔ وہ اس بات پر اصرار کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ جنسی عمل غیر اخلاقی معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ ''بداخلاقی'' کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں تو مطلق اخلاقیات کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ کا منبع ہی زہر آلود ہو تو آپ خود حیات بخش کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ کوشش تو کر سکتے ہیں مگر کبھی مکمل نہیں ہو سکتے۔ بداخلاقی کو ابتدا ہی میں ختم کر دیا جائے۔ یہی ان کے اصرار کی بنیادی وجہ ہے اور اسی لیے وہ مسیحؑ کو کنواری ماں کا بیٹا کہتے ہیں۔ کبھی کوئی کنواری ماں کے بطن سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر وہ لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا اسی پر اصرار ہے۔ اگر حتمی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ مسیحؑ کا باپ بھی تھا تو عیسائی انہیں چھوڑ جائیں گے اور فوری طور پر غائب ہو جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ شخص بالکل ہمارے جیسا ہے۔ ہم بداخلاق ہیں، ہم گناہ کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں اور وہ بھی اسی انداز میں دنیا میں آیا ہے۔ ایسے میں ہمارے اور اس کے مابین کیا فرق ہوا؟

''آپ خداترس فرشتے ہیں''

فرشتے خلوص اور معصومیت کی علامت ہوتے ہیں۔ اس سے سائمن پیٹر کے بارے میں جاننے میں مدد ملتی ہے۔ سائمن پیٹر تمام عیسائی کلیسا کی بنیاد بن گیا ہے۔ اس کے بعد سے کلیسا مسلسل اخلاقیات اور غیر اخلاقیات کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ سارا کلیسا مذہب کے بجائے اخلاقیات میں تبدیل ہو گیا ہے۔ سائمن پیٹر اس کی بنیادی وجہ ہے۔ اس نے ندامت تخلیق کی کیونکہ جب آپ غلط اور صحیح کے حوالے سے بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں تو نادم ہو جاتے ہیں۔

زندگی مطلق لااخلاق ہے۔ یہ اخلاقی ہے نہ غیر اخلاقی ہے، یہ لااخلاقی ہے۔ اسے کچھ بھی علم نہیں کہ درست کیا ہے اور غلط کیا ہوتا ہے۔ یہ دونوں سمتوں میں عمل کرتی ہے۔ اگر دریا میں سیلاب آیا ہو تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ اخلاقی یا غیر اخلاقی؟ ہزاروں دیہاتی ڈوب جاتے ہیں اور سینکڑوں لوگ ہلاک جبکہ ہزاروں بے گھر ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ اس سیلابی دریا کو 'برا'' کہیں گے؟ نہیں، آپ یہ لفظ استعمال نہیں کریں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ دریا کو اچھے یا برے کا علم نہیں ہوتا اور خدا دریا میں بھی اسی قدر موجود ہوتا ہے جتنا کہ آپ کی ذات میں ہوتا ہے۔ درخت گرتا ہے اور اس کے نیچے مراقبے میں بیٹھا ولی مارا جاتا ہے۔ آپ اس درخت کو کیا کہیں گے؟ گناہ گار؟ قاتل؟ کیا اس درخت کو عدالت میں پیش ہونا پڑے گا؟ نہیں، آپ بس اتنا ہی کہیں گے کہ ''یہ درخت ہے، ہمارا اخلاق یا بداخلاقی، گناہ یا ثواب اس درخت پر منطبق نہیں ہوتا''

اخلاقیات انسان کی تخلیق کردہ شے ہے۔ خدا لااخلاقی دکھائی دیتا ہے۔ تمام تر وجود لااخلاقی ہے۔ لااخلاقی کا مطلب اخلاقی یا غیر اخلاقی کی عدم موجودگی ہے۔ تاہم اگر آپ اخلاقی رویے کے ساتھ مسیحؑ کے پاس جاتے ہیں تو اسے کھو دیں گے۔ سائمن پیٹر نے مسیحؑ کو مکمل طور سے کھو دیا۔ وہ اخلاقی آدمی کی تلاش میں ہے۔ وہ ولی کی تلاش میں ہے، اسے دانا اور عارف درکار نہیں ہے۔

ولی اور عارف کے مابین یہی فرق ہے۔ عارف یا دانا زندگی کی طرح لااخلاقی ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ متضاد کی اصطلاح میں نہیں سوچتا۔ اس کے بجائے ولی درست کو منتخب اور غلط کو مسترد کر چکا ہے۔ وہ آدھا زندہ ہے، اس نے پوری زندگی نہیں پائی۔ ولی دراصل مذہبی نہیں ہوتا کیونکہ مذہبی آدمی زندگی کو اس کی حقیقی شکل میں قبول کرتا ہے۔ وہ انکار نہیں کرتا کیونکہ انکار کرنا خدا کا انکار کرنا ہے۔ اگر آپ برے کو مسترد کر دیں گے تو گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ آپ خدا سے بہتر ہیں۔ دیکھیں، خدا نے جنس تخلیق کی، وگرنہ اسے کون تخلیق کرتا؟ آپ ہیں کہ انکار کرتے ہیں، آپ ولی بن سکتے ہیں مگر آپ کا ولی ہونا محض اخلاقی ہو گا۔ یہ مذہبی ہیں ہو سکتا۔

ہندوؤں نے اس بات کو عمدگی سے سمجھا ہے۔ اگر آپ ویدوں کے دور میں واپس جائیں تو دیکھیں گے کہ رشی نہایت عام زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی بیویاں تھیں، بچے تھے، گھر داری تھی اور

وہ دنیا کو ترک نہیں کرتے تھے۔ ترک دنیا کا نظریہ جین اور بدھ مت کے ساتھ آیا، وگرنہ ہندو رشی بالکل ویسی ہی زندگی گزارتے تھے جیسی عام لوگ گزارتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ زندگی کو مجموعی طور پر قبول کرنا چاہئے۔ کسی شے کو مسترد نہیں کرنا چاہئے اور ہر چیز کو قبول کرنا چاہئے۔ دینیت کا حقیقی مفہوم بھی یہی ہے۔ ''استیکا'' کا مطلب پوری زندگی کو ''ہاں'' کہنا ہے۔ یہ سینٹ پیٹر اچھا پیشوا تو بن سکتا ہے، وہ ولی بھی بن سکتا ہے مگر دانا نہیں ہوسکتا۔ اس کے اپنے تصورات ہیں اسی لیے وہ مسیحؑ کے پاس آیا۔

جب آپ بہت زیادہ اخلاقی تصورات کو خود پر طاری کر لیتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ ایسے میں آپ اپنی ہی مذمت کرنے لگتے ہیں۔ محض غلط کہنے سے کچھ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ بدستور باقی رہتا ہے۔ یہ شخص عورت کیلئے باعث کشش ہوگا، دونوں خوبصورت ہیں اور خواہش بھی موجود ہے۔ یہ خدا کا تحفہ ہے۔ یہ آپ کے ہر مسام میں موجود ہے اور آپ کے ہر خلیے میں پائی جاتی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ انسانی جسم میں سات کروڑ خلیے ہوتے ہیں اور ہر خلیہ جنس کا حامل ہوتا ہے۔ آپ کا پورا جسم جنسی مظہر ہے۔ آپ کچھ بھی کرلیں، چاہے اپنی آنکھیں بند کرلیں یا بھاگ کر ہمالیہ پر چلے جائیں، خوبصورتی آپ کو وہاں بھی متوجہ کرے گی۔

پھول بیحد خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کا مشاہدہ کیا؟ یہ بھی جنسی کشش کا حامل ہے۔ ولی کے جھونپڑے کے قریب گاتا پرندہ بے حد بھلا معلوم ہوتا ہے۔ آیا آپ نے کبھی مشاہدہ کیا کہ پرندے کا گانا جنسی ترغیب ہے؟ وہ اپنے ساتھی کو دعوت دے رہا ہوتا ہے۔ اسے ساتھی کی تلاش ہے۔ پھول کیا ہے؟ پھول جنسی مظہر ہے۔ پھول محض فریب ہے۔ درخت حرکت نہیں کرسکتا۔ اس کے جنسی خلیے مکھیوں اور تتلیوں کے ذریعے دوسرے درختوں تک پہنچتے ہیں۔ یاد رہے کہ درختوں میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ یہ حرکت نہیں کرسکتے۔ ان کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ پھول مکھیوں، تتلیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کو متوجہ کرنے کا بہانہ ہے۔ یہ چیزیں پھول کی طرف آتی ہیں اور ان کے ذریعے جنسی بیج دوسرے درختوں کو پہنچ جاتے ہیں۔

جہاں حسن ہوگا وہاں جنسیت بھی ہوگی۔ پوری زندگی جنسی مظہر ہوتی ہے۔ آپ کیا کرسکتے ہیں؟ آپ اسے مسترد کرسکتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاتھ میں ہے تاہم جب آپ اسے مسترد کرتے ہیں تو آپ کو ندامت محسوس ہوتی ہے کیونکہ دبایا ہوا جذبہ نیچے گہرائی میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتا

ہے۔ آپ مسلسل ندامت محسوس کرتے رہتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ غلط ہوا ہے۔ ندامت اور احساس گناہ کی موجودگی میں آپ خوش نہیں رہ سکتے۔ یاد رہے کہ احساس گناہ کی موجودگی میں آپ رقص نہیں کرسکتے۔ ندامت آپ کو اپاہج کردے گی۔ آپ جہاں بھی جائیں ہنسی سے محروم رہیں گے۔ آپ وجد کی کیفیت میں عمل نہیں کرپائیں گے کیونکہ آپ کو اپنے اندر دبائی گئی شے سے ہر لحظہ خوف محسوس ہوتا رہے گا۔

اگر آپ رقص کریں گے، گائیں گے اور خوشی محسوس کریں گے تو کچلے ہوئے جذبے کے ساتھ کیا ہوگا؟ یہ دوبارہ بھی ابھر سکتا ہے۔ چنانچہ آپ کو مسلسل پہرہ دینا پڑتا ہے۔ ایسے میں آپ اپنی زندگی کے مالک اور لطف اٹھانے والے کے بجائے نگران بن کر رہ جاتے ہیں۔ آویزش اور مسلسل آویزش کے باعث سب کچھ بدصورت اور کریہہ بن جاتا ہے۔ آپ کی توانائی اندرونی جدوجہد میں خرچ ہوجاتی ہے۔ ایسا شخص جو اپنے وجود کو کچل چکا ہے وہ دوسروں کو ہمیشہ مذمتی نگاہوں سے ہی دیکھے گا۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگا۔

اخلاقی واعظ.... اس کے ساتھ رہنا بے حد مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کی نگاہیں آپ کی مسلسل مذمت کررہی ہوتی ہیں۔ آپ نے چونکہ چائے پی لی ہے اس لیے آپ غلط ہیں۔ کیا آپ چائے پی رہے ہیں؟ آپ کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ آپ چائے نہیں پی سکتے۔ واقعتاً جو شے آپ کو لطف دے سکتی ہو وہ غلط ہے۔ گاندھی کے آشرم میں آپ کو کھانا چکھنے کی اجازت نہ تھی۔ آپ کھا سکتے ہیں مگر چکھنا اور مزہ لینا حرام ہے۔ کیوں؟ مزے کی مخالفت کیوں؟ اس لیے کہ مزہ لطف کا دوسرا نام ہے اور ولی لطف کے خلاف ہوتے ہیں۔ آپ کو کبھی کوئی مسکراتا ولی دکھائی نہیں دے گا۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ وہ اداس نظر آتا ہے اور ہر وقت اپنی اور دوسروں کی مذمت کرتا رہتا ہے۔ اس کی تمام تر زندگی بیماروں جیسی ہوتی ہے۔ وہ خوش نہیں رہ سکتا۔

سائمن پیٹر ایک علامت ہے۔ اس نے کہا'' آپ خدا ترس فرشتے معلوم ہوتے ہیں'' دراصل وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ خالص ہیں، کنواری ماں سے پیدا ہوئے ہیں، آپ نے کبھی شادی نہیں کی، زندگی سے لطف نہیں اٹھایا۔ آپ خالص ہیں، اسی لیے میں آپ کو فرشتہ سمجھتا ہوں۔

میتھیو نے مسیحؑ سے کہا'' آپ زبردست سمجھ بوجھ کے حامل عقلمند ہیں''

میتھیو اخلاقیات کا متلاشی نہیں ہے۔ وہ علم کا متلاشی اور بیحد سائنسی آدمی ہے۔ اسے مسیحؑ سمجھ بوجھ کے حامل دکھائی دیتے ہیں، اس کا خیال ہے کہ وہ ان سے زندگی کے اسرار بارے علم حاصل کرسکتا ہے۔ ''اس شخص کے پاس کچھ چابیاں ہیں، وہ جانتا ہے کہ میں اس سے معلومات اکٹھی کرسکتا ہوں''، میتھیو علم کی تلاش میں ہے۔

تاہم جب آپ مسیحؑ یا ان جیسے کسی اور شخص کے پاس آتے ہیں تو علم کی تلاش میں مت آئیں۔ مسیحؑ عقلمند آدمی دکھائی دیتے ہیں کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ براہ راست اثر انداز ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ معلوم ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ بے حد پرمعانی ہے مگر آپ اس کے وجود کے بجائے اس کے الفاظ پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کررہے ہیں۔ میتھیو پنڈت اور عالم ہے۔ وہ نظریات، اصولوں، نظام اور فلسفے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اگر آپ ایسے ذہن کے ساتھ مسیحؑ کے پاس آئیں گے تو اسے کھو بیٹھیں گے کیونکہ مسیحؑ علم کا آدمی نہیں ہے۔ وہ وجود کا آدمی ہے۔ دونوں میں کیا فرق ہے؟

علم سطحی، عاریتاً حاصل کردہ اور مردہ شے ہے۔ یہ شخص زندہ اور مکمل طور سے زندہ ہے۔ اس نے کسی سے کوئی شے عاریتاً نہیں لی۔ وہ اپنے آپ کو پہچان چکا ہے۔ وہ اپنا وجود آپ کے ساتھ شریک کرسکتا ہے۔ ایسے میں اگر آپ صرف اس کے الفاظ پر دھیان دیتے ہیں تو آپ بے حد احمق کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔

یہ الفاظ کتابوں سے بھی لیے جاسکتے ہیں۔ ان کیلئے مسیحؑ کے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بجائے ایک لائبریری زیادہ بہتر ہوگی۔ لائبریری میں زیادہ علم ہوتا ہے جسے صدیوں کی محنت کے بعد جمع کیا جاتا ہے۔

آپ اس شخص کے پاس آئے ہیں جس سے آپ کا وجود اپنی تمام تر پیاس بجھا سکتا تھا مگر آپ محض الفاظ لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔ آپ شہنشاہ کے پاس آتے ہیں جو کہتا ہے ''کہو، تم جو کہو گے ملے گا''، تمام سلطنت آپ کے قدموں میں ہے، آپ کے کہنے کی دیر ہے اور ہر چیز حاضر کردی جائے گی مگر آپ صرف ایک روٹی مانگتے ہیں اور خوشی خوشی واپس چلے جاتے ہیں۔ ساری سلطنت آپ کے قدموں میں تھی مگر آپ نے صرف الفاظ پائے۔ آپ تصورات اور نظریات سیکھتے ہیں اور عالم دین بن جاتے ہیں۔ میتھیو عیسائیوں کا بنیادی عالم دین ہے۔

چنانچہ تمام کلسیا دو چیزوں میں پھنس گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دو چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ پیٹر کلیسا کی اخلاقیات اور انسداد جنسیت کی بنیاد بن گیا اور تا حال بنا ہوا ہے جبکہ میتھیو دینیات کی بنیاد بنا۔ عیسائیت دو چیزوں میں مشغول ہوگئی جبکہ اس کا مسیحؑ سے کوئی تعلق نہ رہا۔ ان میں سے ایک شے اخلاقیات تھی، یعنی کیا غلط اور کیا درست ہے جبکہ دوسری چیز دینیات تھی جس میں خدا سے متعلق تصورات شامل ہیں۔ دینیات کا مطلب خدا سے تعلق تصورات ہیں جبکہ خدا کے بارے میں کوئی تصور اور نظریہ ہو ہی نہیں سکتا۔

خدا کسی اصول یا نظریے کا نام نہیں ہے۔ یہ کوئی مفروضہ بھی نہیں کہ جسے ثابت یا غلط ثابت کیا جاسکتا ہو۔ آپ اس حوالے سے بحث نہیں کرسکتے۔ جب مسیحؑ موجود ہوتا ہے تو آپ خدا کا سامنا کرسکتے ہیں۔ خدا موجود تھا، وہ اس شخص میں سرایت کر گیا تھا مگر ایسے میں علم کی تلاش راہ کی رکاوٹ بن گئی۔ آپ کو مسیحؑ سے علم کیلئے نہیں کہنا چاہئے بلکہ آپ کو اس سے وجود کی بابت سوال کرنا چاہئے۔ تاہم علم جمع کرنا آسان ہے کہ اس میں آپ کو اپنا آپ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ محض الفاظ سنتے ہیں اور جمع کرلیتے ہیں۔ آپ کو کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ تاہم اگر آپ ''وجود'' کی بابت کہیں تو آپ کو خاموش ہونا پڑتا ہے اور آپ گہرے استغراق میں چلے جاتے ہیں۔ تب آپ کو خاموشی اور موجودگی بننا پڑتا ہے۔ اسی صورت میں ہی مسیحؑ اپنا وجود آپ میں انڈیل سکتا ہے۔

میتھیو نے انہیں کہا ''آپ بہترین سمجھ بوجھ کے حامل عقلمند معلوم ہوتے ہیں''

مسیحؑ عقلمند آدمی نہیں ہیں۔ وہ بذات خود دانائی ہیں مگر انہیں عقلمند کہنا غلط ہے کیونکہ آپ ''آگاہ'' ہوئے بغیر بھی عقل مند ہوسکتے ہیں۔ دنیا میں بے حد عقلمند لوگ آئے ہیں۔ کنفیوشس عقلمند آدمی ہے مگر واقف اور آگاہ نہیں ہے۔ مانو بھی عقل مند آدمی ہے مگر اسے آگاہ نہیں کہا جاسکتا۔ بدھا اور لاؤزو آگاہ ہیں۔ ان کی دانائی کا منبع بالکل مختلف ہے۔ وہ زندگی کے بنیادی مرکز تک پہنچ چکے ہیں اور آگاہ ہیں۔ ان کا علم ذہانت کی پیداوار نہیں ہے۔ ان کا علم وجود سے چھوٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مسیحؑ کو وجود کا آدمی کہتا ہوں اور علم کا آدمی نہیں کہتا۔ آپ تجربے کی بدولت باآسانی دانائی حاصل کرسکتے ہیں۔ کوئی بھی معمر شخص عقل مند ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ احمق آدمی بھی عقلمند ہوسکتا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ اپنی حماقت پر قائم رہیں تو عقلمند بن جائیں گے۔ صرف وقت ہی

آپ کو دانائی عطا کرتا ہے۔ زندگی کرنے، غلطیاں کرنے، بھٹکنے، واپس آنے اور بہت سے تجربات جمع کرنے کے نتیجے میں آپ عقلمند بن جاتے ہیں۔ مسیحؑ اس انداز میں عقلمند نہیں تھے۔ وہ معمر بھی نہیں تھے۔ ان کی عمر محض تینتیس برس تھی۔ وہ نوجوان تھے۔ انہیں زندگی کا زیادہ تجربہ بھی نہ تھا۔ انہیں اس انداز میں عقل مند نہیں کہا جا سکتا۔ مگر وہ کچھ جانتے تھے اور ایسی بات جانتے تھے جو زندگی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے درخت کی شاخوں کو نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ اس کی جڑوں تک پہنچ گئے تھے۔ یہ بالکل مختلف شے ہے اور میتھیو اسے پانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس نے تحریریں جمع کیں۔ مسیحؑ نے جو کچھ کہا اس نے جمع کر لیا۔ وہ اس سے انجیل تخلیق کرے گا اور نظریات وتصورات بنے گا۔ ان دونوں نے مسیحؑ کو مکمل طور پر کھو دیا۔

تیسرا حواری یعنی تھامس مسیحؑ کے قریب ترین حواریوں میں سے ایک تھا۔ اسی نے یہ تمام اقوال بیان کیے ہیں۔ تاہم اس کے بیانات انجیل میں شامل نہیں ہیں کیونکہ مسیحؑ اور ان کے قریب ترین حواری کو باہر رہنا تھا، وہ خطرناک تھے۔

تھامس نے مسیحؑ سے کہا ''آقا، میں یہ کہنے کے قابل نہیں کہ آپ کیسے دکھائی دیتے ہیں'' یہ کہنا ناممکن ہے۔ آپ بہت کچھ ہیں، آپ بے حد کثرت میں ہیں، آپ بے حد کثیر الجہت ہیں۔ یہ منہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں۔ الفاظ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہیں۔ آپ کا کسی سے موازنہ نہیں ہوسکتا۔ آپ ناقابل موازنہ ہیں۔ میرا کچھ بھی کہنا غلط ہوگا کیونکہ یہ کافی نہیں ہوگا۔ الفاظ بے حد محدود ہیں جبکہ آپ بے حد وسیع ہیں۔

چنانچہ تھامس کہتا ہے ''آقا میں یہ کہنے کے قابل نہیں کہ آپ کیسے دکھائی دیتے ہیں'' نہیں، ناممکن، میں کچھ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ یہ بات کہنا ممکن ہی نہیں۔ آپ کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ناقابل اظہار ہیں''

تھامس قریب ترین آجاتا ہے مگر قریب ترین بھی بہت دور ہے، فاصلہ بدستور موجود ہے۔

بودھی دھرما سے ایک ایسی ہی کہانی منسوب ہے۔ وہ نو برس تک چین میں رہا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو پڑھایا سکھایا۔ بہت سے لوگوں نے گیان دھیان کیا، متعدد اس سے قریب تر آ گئے۔ جب وہ واپس جانے لگا تو اس نے اپنے چار حواریوں سے ''دھرما'' کے بارے میں کچھ کہنے کو کہا۔ دھرما سے مراد ''سچائی'' تھی۔ تین حواری مسیحؑ کے تین حواریوں یعنی پیٹر (معلم اخلاق اور سطحی ترین

شخص) میتھیو (علم کا متلاشی اور سائمن پیٹر کی نسبت قدرے گہرا شخص) اور تھامس (جس نے کہا کہ ''میں کچھ نہیں کہہ سکتا'') جیسے تھے۔ مگر بودھی دھرما مسیحؑ سے زیادہ خوش قسمت تھا کہ اس کا چوتھا حواری خاموش رہا۔ اس نے تو یہ بھی نہ کہا کہ ''میں کچھ نہیں کہہ سکتا'' کیونکہ جب آپ یہ الفاظ کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''یہ تو جانی پہچانی بات ہے'' چوتھا مطلق خاموش رہا۔ اس نے بودھی دھرما کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے پاؤں پر جھک گیا۔ بودھی دھرما بولا ''ایک میری ہڈیاں ہے، دوسرا گوشت اور تیسرا خون ہے جبکہ تم میرا گودا ہو'' یہ چوتھا حواری تھامس جتنی بات بھی نہیں کہے گا۔ وہ قریب تر آ گیا اور گودا بن گیا۔

مسیحؑ اس قدر خوش قسمت نہیں تھے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ ماحول اچھا نہیں تھا۔ حالات بیحد مختلف تھے۔ چین لاؤزو سے آشنا ہو چکا تھا۔ یہودیوں نے کبھی لاؤزو جیسا شخص نہیں دیکھا تھا۔ لاؤزو نے زمین اس انداز میں ہموار کر دی تھی جس میں بدھا کا بیج خوبصورتی سے پھوٹ سکتا تھا۔ جب بودھی دھرما چین گیا تو زمین تیار تھی۔ اسے لاؤزو اور چنگ زو نے کاشت کیا تھا۔ یہ غیر معمولی مظہر ہے۔ اس کے بعد بودھی دھرما نے بدھا کا بیج ڈالا۔ اس نے خوبصورت پھول پیدا کیے اور یہ خوبصورتی سے کھلے۔ مسیحؑ اس قدر خوش قسمت نہیں تھے۔ زمین تیار نہ تھی۔ یہودی معاشرے میں پیغمبر تو آئے تھے مگر لاؤزو اور چنگ زو جیسے دانا پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہاں ولی موجود تھے لہٰذا سائمن پیٹر دستیاب تھا۔ وہاں معلمین اخلاق موجود تھے کیونکہ یہودی تمدن کی ابتداء ہی میں موسیٰؑ نے اخلاقیات کا بیج بو دیا تھا۔ دس خدائی احکامات ہی اخلاقیات کی بنیاد ہیں۔

وہاں سائمن پیٹر جیسے لوگ موجود تھے کیونکہ وجہ کے بغیر کوئی شے وجود نہیں رکھتی اور طویل روایت کے بغیر کسی شخص کا وجود نہیں ہوتا۔ سائمن پیٹر محض حادثہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے طویل تاریخ ہوتی ہے۔ موسیٰؑ اس کی بنیادی ترین وجہ ہیں۔ اس جڑ سے سائمن پیٹر کا ظہور ہوا۔ دس خدائی احکامات دراصل دنیا اور زندگی کے بارے میں اخلاقی رویوں کا بیان ہیں۔ تاہم وہاں لاؤزو جیسا کوئی شخص موجود نہ تھا جو یہ کہتا کہ ''تمام امتیازات جھوٹے ہیں'' جس لمحے آپ یہ کہتے ہیں کہ ''یہ درست ہے اور وہ غلط ہے'' تو اسی لمحے آپ زندگی کو تقسیم کر کے اسے مار ڈالتے ہیں۔ لاؤزو تقسیم کے بجائے اتحاد کیلئے تھا۔ بودھی دھرما خوش قسمت تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس تین کے بجائے چار حواری تھے۔

یہودی سماج میں زیادہ سے زیادہ تھامس ہی ممکن تھا۔ تھامس کو دیکھئے، وہ کیا کہہ رہا ہے، یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ''خدا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا'' مگر آپ تو کچھ کہہ بھی چکے۔ اگر آپ یہی کہتے ہیں کہ ''خدا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا'' تو آپ نے خدا کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہہ دیا ہے۔ اگر آپ درست ہیں تو آپ نے غلط کیا ہے۔ اگر آپ درست ہیں تو اتنا بھی نہیں کہنا چاہئے۔ اگر اتنا کچھ کہہ دیا گیا ہے تو پھر قدرے مزید کچھ کیوں نہیں کہا جا سکتا؟ مسئلہ کیا ہے؟ اگر یہ کہا جا سکتا ہے تو اس سے زیادہ کیوں نہیں؟ اگر پر وثوق دعویٰ ممکن ہے تو مزید دعویٰ بھی ممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بدھا مطلق خاموش رہے۔ انہوں نے یہ بھی نہ کہا کہ ''خدا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا'' وہ یہ بھی نہیں کہیں گے۔ آپ ان سے خدا کے بارے میں پوچھتے ہیں اور وہ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ آپ خدا کے بارے میں بات کرتے ہیں اور وہ سنتے تک نہیں۔ وہ موضوع کو بدل دیں گے اور کسی اور شے کے بارے میں بات شروع کر دیں گے۔ وہ یہ بھی نہیں کہیں گے کہ ''اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا'' کیونکہ یہ لغو بات ہے۔ تو پھر آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟ یہاں تک کہ ہم نفی کے ذریعے بھی اشارہ دے دیتے ہیں۔ مثبت دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہوتا بلکہ منفی دعویٰ بھی دعویٰ ہی ہوتا ہے۔

آپ کہتے ہیں ''خدا شکل وصورت کا حامل نہیں ہے'' اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ کیا آپ اسے اس قدر اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''وہ جسم سے ماورا ہے''؟ اگر آپ اسے اچھی طرح جان چکے ہیں تو وہ شکل وصورت بھی رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کہتے ہیں کہ ''یہ سمندر ماپا نہیں جا سکتا۔ یہ بیحد گہرا ہے، اسے ماپنا ممکن ہی نہیں'' ایسے میں دو امکانات ہی ہو سکتے ہیں۔ یا تو آپ اسے ماپ چکے ہیں کہ اسی صورت میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سمندر اس قدر گہرا ہے کہ اسے ماپا نہیں جا سکتا۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ آپ نے اسے نہیں ماپا، ایسے میں آپ یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسقدر گہرا ہے کہ اسے ماپا نہیں جا سکتا؟ گہرائی بھی ماپی جا سکتی ہے، یہ خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو اسے ماپا جا سکتا ہے۔

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا کی کوئی شکل وصورت نہیں تو کیا آپ اس کی حدود سے ہو کر آئے ہیں اور دیکھ چکے ہیں کہ اس کی کوئی شکل نہیں؟ اگر آپ اس کی حدود سے ہو آئے ہیں تو پھر

یقیناً وہ شکل وصورت رکھتا ہے۔ اگر آپ اس کے پاس نہیں گئے تو یہ بھی مت کہیں کہ اس کی شکل و صورت نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے اس کی کوئی شکل وصورت بھی ہو۔ آپ اس کی حدود میں جا کر ہی اس کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ واقعتاً خدا کو پا چکے ہیں وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ یہ بھی نہیں کہیں گے کیونکہ یہ متضاد بات ہے۔

صدی کے معروف ترین ماہر منطق وٹگن سٹین نے ایک خوبصورت فقرہ لکھا ہے۔ اپنی کتاب Tractatus Logico Philosophicus میں اس نے متعدد خوبصورت باتیں کہی ہیں۔ یہ ان میں سے بہترین بات ہے۔ وہ کہتا ہے ''جو کہا نہ جا سکے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ اگر کسی شے کے بارے میں کچھ نہ کہا جا سکے تو خاموش رہنا چاہئے''

تھامس قریب آ گیا مگر دور ہی رہا۔ اس نے کہنے کی کوشش کی اور نا قابل اظہار کا اظہار کرنا چاہا تھا۔

تھامس نے اسے کہا ''آقا، میں یہ کہنے کے قابل نہیں کہ آپ کس طرح دکھائی دیتے ہیں''

مسیحؑ نے کہا ''میں تمہارا آقا نہیں ہوں..... '' کیونکہ کوئی مجھے نہیں سمجھتا، لہٰذا میں آقا کیسے ہو سکتا ہوں؟

اگر آپ سمجھ جاتے ہیں تو تبھی حواری بن سکتے ہیں۔ اگر آپ سمجھ جاتے ہیں تو اسی صورت میں معبد میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ سمجھ جاتے ہیں تو تبھی آقا کے وجود کا حصہ بن سکتے ہیں۔

مسیحؑ نے کہا ''میں تمہارا آقا نہیں ہوں''

اس نے ان تینوں سے کہا ''میں آپ کا آقا نہیں ہوں'' تھامس قریب آ گیا مگر اس نے بھی مسیحؑ کو کھو دیا..... وہ بہترین ہے مگر مکمل نہیں ہے۔ اسے ''تقریباً بہترین'' کہا جا سکتا ہے۔ وہ قریب آ جاتا ہے مگر رکاوٹ موجود رہتی ہے۔ وہ تا حال الفاظ پر یقین رکھتا ہے کیونکہ وہ اس بات کے اظہار کی کوشش کرتا ہے جس کا اظہار کرنا ممکن ہی نہیں۔

''میں تمہارا آقا نہیں ہوں کیونکہ آپ اس ندی کے پانی کے نشے میں ہیں جسے میں پیچھے چھوڑ چکا ہوں''

یہاں وہ بے حد گہری سچائی بیان کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ''تم تینوں ذہن سے بات کر رہے ہو۔ اس ندی کو میں پیچھے چھوڑ چکا ہوں، پار کر چکا ہوں، تم ابھی تک دماغ سے باتیں

کر رہے ہو۔ ایک اخلاقی ذہن سے بات کر رہا ہے، دوسرا دینیاتی ذہن سے بول رہا ہے اور تیسرا صوفیانہ ذہن سے بات کر رہا ہے مگر تینوں دماغ کا ہی حصہ ہیں۔ اگر آپ ذہن سے بولتے ہیں تو میں آپ کا آقا نہیں ہوں کیونکہ سارا زور ذہن کو ایک طرف رکھ دینے پر دیا گیا ہے۔

آقا اس پر اصرار کرتا ہے کہ ''ذہن کو چھوڑ دو'' آپ چال چلتے ہیں، آپ آقا سے اسی زمین کی بابت گفتگو کرتے ہیں جسے چھوڑ دینے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بودھی دھرما کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ اس کے پاس کم از کم ایک حواری ایسا ضرور تھا جو واقعتاً خاموش رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس سے بھی زیادہ خوش قسمت آقا موجود رہے ہیں۔ رنزائی انہی میں سے ایک تھا۔ اس نے بھی اپنے حواریوں سے یہی بات پوچھی کہ یہ کہانی ہر دور میں ایک ہی رہی ہے۔ بدھا اور اس کے حواری، مسیحؑ اور اس کے حواری، بودھی دھرما اور اس کے حواری، اب رنزائی اور اس کے حواری۔ کہانی ایک جیسی ہے۔ یہ مختلف ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ تعلق ایک جیسا ہے۔ مظہر ایک جیسا ہے۔ رنزائی کہیں زیادہ خوش قسمت ہے۔ کیا ہوا تھا؟ جب اس نے اپنے اہم ترین حواری سے پوچھا کہ ''سچائی کے بارے میں کچھ کہو'' حواری نے کیا کہا؟ کیا آپ جانتے ہیں؟ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس نے آقا کو تھپڑ جڑ دیا۔ آقا ہنسا اور بولا ''درست، تم نے بالکل ٹھیک کیا، کیونکہ جب سوال ہی غلط ہو تو اس کا جواب کیونکر ممکن ہے؟''

یہ سب سے خوش قسمت تھا۔ جب سوال ہی غلط ہو تو آپ جواب کیسے دے سکتے ہیں؟ حواری کہہ رہا ہے کہ ''احمق مت بنو، میرے ساتھ کھیل مت کھیلو، مجھے حیرانی میں مت ڈالو، مجھے غیر منطقی بیہودگی میں مبتلا مت کرو، کیونکہ اگر میں جواب دوں تو یہ غلط ہوگا اور جواب نہ دوں تو بھی غلط بات ہوگی کیونکہ میرے آقا نے سوال کیا ہے۔ اگر میں جواب دوں تو یہ غلط ہوگا کہ سوال ہی غلط ہے کیونکہ سچائی کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر میں جواب نہیں دیتا تو یہ ناشائستہ بات ہوگی کہ آقا نے سوال پوچھا اور میں نے جواب تک نہ دیا۔ اس نے آقا کو تھپڑ مار کر دراصل یہی بات کہی تھی۔ رنزائی ہنسا اور کہنے لگا ''درست، جب شاگرد اپنے استاد کو تھپڑ مار سکتا ہے تو وہ خود آقا بن چکا ہے، جاؤ اور دوسروں کو تعلیم دو'' مسیحؑ نے کہا ''میں تمہارا آقا نہیں ہوں کیونکہ آپ اس ندی کے پانی کے نشے میں ہیں جسے میں چھوڑ چکا ہوں''

آپ تا حال نشے کی حالت میں ہیں۔ آپ ذہنی پاگل پن کا شکار ہیں۔ تمام تر پاگل پن کا منبع ذہن ہے۔ پاگل پن کے کئی درجے ہیں مگر دماغ رکھنے والا شخص قدرے زیادہ پاگل ہوتا ہے۔ ذہن پاگل پن کے مساوی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ زیادہ پاگل نہ ہوں اور صرف نیم پاگل کہلا سکتے ہوں۔ چنانچہ آپ کھول رہے ہیں نہ بھاپ پیدا کر رہے ہیں۔ کوئی آپ کو پاگل خانے میں بھیجنے کا نہیں سوچتا۔ آپ تھوڑے سے پاگل ہیں۔ آپ کام کرنے والے پاگل ہیں۔ آپ کام کر سکتے ہیں، آپ حرکت کر سکتے ہیں اور اپنے پاگل پن کو اپنے اندر چھپا سکتے ہیں۔ انسان پاگل پن کی حدود سے اسی وقت پرے جاتا ہے جب وہ دماغ کی حدود پار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''آپ نشے کی حالت میں ہیں''

''تم تینوں ذہن سے بات کر رہے ہو۔ آپ نے مجھے نہیں دیکھا کیونکہ جب آپ مجھے دیکھتے ہیں تو دماغ آپ کے ساتھ نہیں ہوتا''

آقا کے پاس دماغ لے کر مت جائیں۔ یہ حماقت ہوگی کیونکہ اگر آپ ذہن لے کر آقا کے پاس جائیں گے تو اس سے قریب نہیں ہو پائیں گے۔ ایسے میں آپ کو ''ست سنگ'' حاصل نہیں ہو سکے گا۔ آپ اس کی موجودگی میں نہیں ہوں گے۔ آپ اپنے ذہن سے بھرے ہوں گے اور اپنے ذہن کے نشے کے زیر اثر ہوں گے۔ جب ذہن آپ کے ساتھ ہوتا ہے تو آپ سوچنے اور باتیں کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ آپ کے اندر دماغ گھومتا رہتا ہے اور ایک دیوار تعمیر کر دیتا ہے۔ ایسے میں مسیحؑ کے لیے آپ کے اندر اترنا ممکن نہیں رہتا۔

تھامس کو ہی لیجئے۔ چونکہ وہ قریب ترین اور بہترین تھا اس لیے وہ تنہائی میں چلا گیا۔ مسیحؑ نے اسے تین الفاظ کہے۔

جب تھامس اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا ''مسیحؑ نے تم سے کیا کہا؟''

مسیحؑ کو دستیاب بہترین آدمی سے کام لینا پڑا تھا۔ حقیقی بہترین شاگرد موجود نہ تھا۔ چنانچہ تھامس کا انتخاب ہوا۔ مسیحؑ نے اسے ساتھ لیا اور علیحدگی میں تین الفاظ کہے۔

جب تھامس اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا ''مسیحؑ نے تم سے کیا کہا؟'' وہ تا حال مسیحؑ کے ''کہے'' میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہیں مسیحؑ کے ''ہونے'' سے کوئی

سروکار نہیں۔ وہ ابھی تک علم میں دلچسپی رکھتے ہیں، انہیں وجود کے بجائے الفاظ میں دلچسپی ہے۔ تھامس نے ان سے کہا ''اگر میں تمہیں ان کے الفاظ میں سے ایک بھی بتا دوں تو تم لوگ پتھر اٹھا لوگے اور مجھ پر برساؤ گے، ان پتھروں سے آگ نکلے گی جو تم لوگوں کو جلا کر راکھ کر دے گی''

یہ بیحد پراسرار بات ہے۔ وہ تین الفاظ ضبط تحریر میں نہیں لائے جا سکے اور تھامس نے بھی حواریوں کو ان تین الفاظ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تاہم اس نے اشارہ ضرور دے دیا کیونکہ جب آپ تیار نہ ہوں تو صرف اشارہ ہی دیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی تیار نہ ہو تو اس کے لیے اشارہ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ واقعتاً کسی شے کی جستجو میں ہیں تو اشاروں کے ذریعے بھی اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ حتمی راز آشکار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو اس کیلئے تیار ہونا چاہیے۔ آپ جس قدر تیار ہوں گے اسی قدر راز عیاں ہو جائے گا۔ وہ اشارے دیتا ہے، لہٰذا پہلے اشارے سمجھنے کی کوشش کریں۔

''اگر میں آپ کو اس کے بتائے الفاظ میں سے ایک بھی بتا دوں تو تم پتھر اٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دو گے، ان پتھروں سے آگ نکلے گی جو تم سب کو جلا کر بھسم کر دے گی''

وہ ایک بات کہتا ہے ''اگر میں ایک لفظ بھی بیان کروں تو...... ''مسیح'' نے تین الفاظ کہے ہیں مگر ''میں ایک لفظ بھی کہہ دوں تو...... '' آپ فوری طور پر مجھ پر پتھروں سے حملہ کر دیں گے'' اس کا کیا مطلب ہے؟

انسان فریب میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر شخص جھوٹ میں زندگی گزارتا ہے کہ جھوٹ بے حد موزوں اور اطمینان بخش ہوتے ہیں۔ سچ سخت ہوتا ہے اور یہ جھوٹ کی طرح باسہولت یا اطمینان بخش نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولنا ڈھلان سے اترنے کے مترادف ہے جس میں زور اور طاقت خرچ نہیں کرنا پڑتی۔ آپ ناچتے قدموں کے ساتھ باآسانی نیچے جاتے ہیں۔ سچائی چڑھائی پر جانے جیسا عمل ہے۔ یہ مشکل اور مشقت طلب ہوتا ہے۔ اس میں آپ کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے اور آپ بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔ جھوٹ موزوں اور اطمینان بخش ہوتے ہیں کیونکہ آپ انہیں بنا سکتے ہیں اور ایجاد کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے مقصد کے مطابق جھوٹ گھڑ سکتے ہیں مگر سچ گھڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔

آپ جھوٹ گھڑ سکتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ آپ درزی کے پاس جائیں اور وہ آپ کو لباس سی دے۔ آپ لباس کی طرح جھوٹ بنا اور بنوا سکتے ہیں اور یہ جھوٹ آپ پر پورا اترتے ہیں۔

تاہم سچائی آپ کی شخصیت پر پورا نہیں اترتی۔ آپ اسے گھڑ نہیں سکتے۔ آپ کو خود سچ کے مطابق ڈھلنا پڑتا ہے۔ سچ کو لباس کی طرح تراشا خراشا نہیں جا سکتا۔ سچ سے ہم آہنگ ہونے کیلئے آپ کو تبدیل ہونا پڑے گا۔ جھوٹ خوبصورت ہوتے ہیں کیونکہ آپ کو تبدیل ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آپ محض جھوٹ کو تبدیل کر دیتے ہیں اور یہ آپ کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ یہ بے حد آرام دہ اور دوستانہ ہوتا ہے۔ یہ آپ سے چمٹ جاتا ہے۔ یہ آپ کو تبدیل ہونے کیلئے نہیں کہتا۔ اس کے ہوتے ہوئے آپ بدستور ساکن و جامد رہ سکتے ہیں۔

جھوٹ ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کبھی آپ کے خلاف نہیں ہوتا۔ سچائی پروا نہیں کرتی۔ اگر آپ سچے ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو تبدیل ہونا پڑے گا۔ سچ ایجاد نہیں کیا جا سکتا۔ اسے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ یہ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جھوٹ میں زندہ رہتا ہے، آپ اپنے جھوٹ خود تخلیق کر سکتے ہیں۔

ہر ملک کے اپنے جھوٹ ہوتے ہیں۔ ہر نسل، ہر مذہب، ہر کلیسا، ہر معبد اور ہر گوردوارے کے اپنے جھوٹ ہیں۔ یہ بے حد آرام دہ جھوٹ ہیں، آپ ان سے چمٹ سکتے ہیں اور یہ سچ کے خلاف آپ کو تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی سچائی کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو آپ دعویٰ کرنے والے پر پتھر برسانا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ سچا ہے تو آپ کی پوری زندگی جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کا احساس کرنا بیحد مشکل ہے۔ آپ جھوٹ میں بے حد سرمایہ کاری کر چکے ہیں۔ آپ نے اس کیلئے زندگی گزاری ہے۔ ایسے میں کوئی شخص آ کر آپ کے جھوٹے خوابوں کو چکنا چور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں دو امکانات ہی ہو سکتے ہیں۔ یا تو آپ مکمل طور سے گرنے کیلئے تیار ہو جائیں یا اس شخص پر پتھر پھینکنا شروع کر دیں کیونکہ اس پر پتھر مارنا اس کے سچ کو آپ کے جھوٹ تار تار کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اب آپ اپنے جھوٹ کے ساتھ ایک مرتبہ پھر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ماہر نفسیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان جھوٹ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جہاں تک ننانوے فیصد لوگوں کا تعلق ہے تو ان کے حوالے سے ماہرین نفسیات کی یہ بات سچ ہے۔ صرف ایک فیصد کو الگ رکھا جا سکتا ہے کہ وہ غیر معمولی ہوتے ہیں۔ فرائیڈ، یونگ اور ایڈلر جیسے عظیم ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ انسان جھوٹ کے بغیر نہیں جی سکتا۔ اسے جھوٹ کی

ضرورت ہوتی ہے اور یہ انسان کی خوراک سے بھی زیادہ بنیادی ضرورت ہے۔ آپ خوراک کے بغیر تین ماہ تک زندہ رہ سکتے ہیں تاہم جھوٹ کے بغیر تین سیکنڈ بھی زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ یہ سانس لینے جیسا ہے۔

ذرا دیکھئے کہ آپ کس طرح جھوٹ بولتے ہیں۔ جب کوئی شخص آپ کے جھوٹ کی تائید کرتا ہے اور اسے سچ مانتا ہے تو آپ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ آپ کو موت سے خوف آتا ہے۔ آپ روح کی ابدیت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ آپ کے لیے جھوٹ ہے۔ آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔ آپ کو روح کی الف ب کا بھی علم نہیں۔ آپ کو یہ علم بھی نہیں کہ روح کا وجود ہے بھی یا نہیں۔ تاہم آپ ابدی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ کوئی شخص دلیل دیتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ روح ابدی ہے تو آپ اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔ آپ اسے عزت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''یہ شخص جانتا ہے'' اس نے کیا کہا ہے؟ اس نے آپ کے جھوٹ کی حمایت ہی نہیں کی بلکہ آپ کے جھوٹ کو مزید زندگی عطا کی ہے۔ آپ ویسے ہی ہیں۔ آپ کو علم ہی نہیں کہ روح کیا ہے۔ آپ نے اس کے بارے میں جاننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ مگر جھوٹ زندگی گزارنے میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ ایسے میں آپ موت سے خوفزدہ نہیں ہوتے کیونکہ موت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ روح ابدی ہوتی ہے۔

ایک نہایت عجیب وغریب بات دیکھنے میں آئی ہے۔ ہندوستان کرہ ارض کا بے ہمت ترین ملک ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس قدر وسیع ملک کو سینکڑوں برس تک غلام بنا کر کیوں رکھا جا سکتا تھا؟ برطانوی نسل جس کی آبادی ہندوستان کے ایک صوبے کی آبادی جتنی بھی نہیں، اس پر سو سال تک حکومت کرتی رہی۔ بظاہر پچاس کروڑ لوگوں کا تین کروڑ کے ہاتھوں غلام بن جانا غیر منطقی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ہن، مغل، ترک اور انگریزوں سمیت جو بھی ہندوستان آیا اس نے ہندوستانیوں کو باآسانی غلام بنا لیا۔ یہ لوگ ان کے غلام بننے کو تیار ہو گئے۔ اس قدر بزدلی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ حالانکہ یہ لوگ اپنی ذات سے ''واقف'' ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بنیادی علم کے مالک ہیں اور روح ابدی ہوتی ہے۔

اگر روح غیر فنا پذیر ہو تو آپ بزدل کیسے ہو سکتے ہیں؟ اگر روح ابدی ہے تو کسی کو آپ سے زیادہ بہادر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کسی نے نہیں مرنا۔ تاہم ایسا نہیں ہے، صورتحال اس سے برعکس

ہے۔ روح ابدی ہے جبکہ ہندوستانی انتہائی ڈرپوک اور بزدل ہیں۔ واقعتاً ایسا ہی ہے۔ چونکہ وہ بزدل ہیں اس لیے وہ اپنی بزدلی کو روح کی ابدیت کے فلسفے کی آڑ میں چھپاتے ہیں۔ یہ ابدیت ان کا علم نہیں ہے۔ بدھا کو علم ہو سکتا ہے مگر یہ ایسا علم نہیں کہ جسے دوسروں کو منتقل کیا جا سکے۔

ذات کا علم ہمیشہ انفرادی رہتا ہے۔ کوئی ملک اس پر قبضہ نہیں جما سکتا۔ یہ ورثہ نہیں بن سکتا۔ یہ روایت بھی نہیں ہوتا۔ ایک شخص کچھ جانتا ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اس کا یہ علم دنیا سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس علم کو بار بار دریافت ہونا ہے۔ آپ اسے اپنی ملکیت نہیں بنا سکتے۔

یہ بزدلوں کا ملک ہے مگر ان کے پاس ایک خوبصورت نظریہ بھی ہے۔ یہ لوگ موت سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں تو ایورسٹ پہاڑ کو سر کرنے کیلئے بھی غیر ملکیوں کو آنا پڑتا ہے۔ ہندوستانی ایسے کام کی زحمت نہیں کریں گے کیونکہ ہر شخص کہے گا کہ ''آپ کیسی حماقت کرنے چلے ہیں؟، آپ وہاں جا کر کیا کریں گے؟ اپنے آپ کو خطرات میں کیوں دھکیلا جائے؟'' ہندوستانی خطرات سے ہمیشہ خوفزدہ رہے ہیں۔ جہاں بھی خطرہ ہو گا یہ اس جانب کا رخ نہیں کریں گے۔ ایسے میں یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں روح کے ابدی ہونے کا علم ہے۔ نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ ایسی بات نہیں کہ یہ سچ نہیں بلکہ آپ کیلئے جھوٹ ہے اور آپ اس کے ذریعے اپنی بزدلی چھپا رہے ہیں۔

ہندوستان کو دیکھیں۔ آپ کو دنیا میں اس قدر لالچی اور بخیل لوگ کہیں دکھائی نہ دیں گے۔ یہ لوگ الٹا ساری دنیا کو مادہ پرست کہتے ہیں۔ یہ ذہن کی خوبصورت چال ہے۔ اپنے تئیں یہ روحانی لوگ ہیں اور باقی ساری دنیا مادہ پرست ہے۔ جب بھی یہ لوگ کسی مغربی آدمی کو دیکھتے ہیں تو دل میں کہتے ہیں ''مادہ پرست''۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو ہندوستانیوں سے زیادہ مادہ پرست کہیں اور نہیں ملے گا۔ وہ پیسے کیلئے جیتے ہیں اور ملکیت کے لالچ میں مرے جاتے ہیں۔ ان کے لیے کچھ دینا ناممکن ہے۔ وہ دینا بھول چکے ہیں اور ہر شے سے چمٹ گئے ہیں۔ تاہم وہ ساری دنیا کو مادہ پرست کہتے ہیں اور خود کو روحانی سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ اور صریح جھوٹ ہے تاہم اسے اس قدر دہرایا گیا ہے کہ یہ سچ دکھائی دیتا ہے۔ یہ صاف جھوٹ ہے۔ ہر شخص اپنا انفرادی جھوٹ بھی ایجاد کرتا ہے۔ یہ عوامی جھوٹ ہیں جن کے بعد آپ اپنے ذاتی جھوٹ تخلیق کرتے ہیں اور انہی میں رہتے ہیں۔

یہ جھوٹ مخصوص انداز میں آپ کی مدد کرتے ہیں۔آپ بزدل ہو سکتے ہیں مگر خود کو بہادر سمجھتے ہیں اور بہادروں جیسا برتاؤ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سے تھوڑا سا فائدہ ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ بزدل ہوں اور خود کو بزدل ہی سمجھیں تو دنیا میں ایک قدم آگے بڑھانا بھی محال ہو جائے۔آپ کہیں گے کہ ''میں بزدل ہوں'' ایسے میں آپ اپاہج ہو کر رہ جائیں گے۔

چنانچہ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسان جھوٹ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔جھوٹ کے سہارے بزدل آدمی بھی زندگی گزار لیتا ہے۔تقریباً ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔آپ جو کچھ بھی ہوں متضاد جھوٹ تخلیق کر لیں گے اور اسے دوسروں کے سامنے سچ ثابت کرنے کیلئے بے حد بناوٹ سے کام لیں گے اور خود کو بھی یہی یقین دلانے کی کوشش کریں گے۔آپ مبالغے سے کام لیں گے اور بزدل بھی مبالغہ کرتا ہے۔وہ بظاہر بے باک بن جاتا ہے مگر اندر سے بزدل ہوتا ہے ورنہ مبالغہ آرائی کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔وہ بلا ضرورت بھی خطرات میں کود سکتا ہے اور اس کا مقصد دوسروں پر اپنی مصنوعی دھاک بٹھانا اور انہیں یہ یقین دلانا ہو گا کہ ''میں بزدل نہیں ہوں'' چنانچہ وہ متضاد شے کی عکاسی کرتا ہے۔

لالچی آدمی دنیا کو ترک کر سکتا ہے، برہنہ رہ سکتا ہے، اس کا مقصد اپنے آپ کو اس بات کا قائل کرنا ہے کہ ''میں لالچی نہیں ہوں'' مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔یہ جھوٹ ہے۔کپڑے پھاڑ دینے اور گھر چھوڑنے سے آپ لالچ کو ترک نہیں کر سکتے کیونکہ لالچ کوئی بیرونی شے نہیں ہوتی۔یہ گھر یا آپ کے خزانے کا حصہ نہیں بلکہ آپ کا حصہ ہے۔آپ جہاں بھی جائیں، برہنہ ہوں یا باللباس، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اب لالچ مبالغے کے ذریعے خود کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔اب یہ ترک دنیا کی متضاد انتہا تک جا کر خود کو پوشیدہ رکھنے کا سامان کر رہا ہے۔

جو آدمی لالچی نہیں ہو گا وہ تارک الدنیا بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے اداکاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔بے خوف انسان نام نہاد بہادری سے بھی پاک ہوتا ہے کیونکہ اسے بناوٹی بہادری کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔جو شخص اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے وہ اس یا اُس انتہا پر نہیں ہوتا۔وہ متوازن ہوتا ہے اور اس کی زندگی توازن کا نمونہ ہوتی ہے۔آپ کا کیا خیال ہے؟ بدھا کے راستے میں سانپ آ جائے تو وہ کیا کرے گا؟ وہ چھلانگ لگا کر ایک طرف ہو جائے گا۔کیا آپ اسے بزدل یا بہادر کہیں گے؟ وہ محض ایک حساس آدمی ہے جو سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔آپ ایسے شخص کو

پسند کریں گے جو سانپ کو دیکھ کر وہیں کھڑا رہے۔جسے پرواہی نہ ہو کہ سانپ کیا کرے گا۔خواہ سانپ اسے ڈس ہی کیوں نہ لے، آپ اسے بہادر کہیں گے، مگر یہ بہادری نہیں بلکہ احمقانہ بات ہے۔اندر سے وہ لازماً بزدل ہو گا۔وہ محض اپنی بزدلی چھپانے کی خاطر سانپ کے پاس کھڑا ہے۔

تاہم جب آپ بدھا کو سانپ کے راستے سے چھلانگ لگا کر ہٹتا دیکھیں گے تو سوچیں گے کہ ''میں کیسے شخص کی پیروی کر رہا ہوں، یہ تو بزدل ہے'' حقیقت میں وہ بزدل نہیں ہے۔راستے میں سانپ آ جائے تو ایک جانب ہٹ کر اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔یہ سادہ ذہانت ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص راستہ مانگنے کی خاطر گاڑی کا ہارن بجائے جا رہا ہے اور آپ سڑک کے درمیان میں ٹانگیں پھیلائے کھڑے خود کو بہادر سمجھ رہے ہوں۔آپ بہادر نہیں بلکہ احمق ہیں۔سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر آپ کسے قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ اپنے آپ کو؟ کیا آپ خود کو یہ یقین دلا رہے ہیں کہ ''میں بہادر آدمی ہوں''

سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص متضاد کا رخ نہیں کرتا بلکہ وہ سمجھ بوجھ کے ساتھ عمل کرتا ہے۔جو بھی صورتحال ہو وہ اپنی آگاہی کی مدد سے ردعمل ظاہر کرتا ہے۔وہ بہادر ہے نہ بزدل۔آپ بزدل ہو سکتے ہیں یا بہادر۔بزدل آدمی بھی مخصوص حالات میں بہادر ہو سکتا ہے اور مخصوص صورتحال میں بہادر آدمی بھی بزدل ثابت ہو سکتا ہے۔

اس مسئلے کو دیکھیں۔بہادر ترین آدمی بھی گھر آ کر بزدل بن جاتا ہے۔حتیٰ کہ ملکہ جوزیفائن کے سامنے نپولین جیسا شہنشاہ بھی بزدل نظر آنے لگتا ہے۔ایسا کیوں ہوتا ہے کہ دنیا کا عظیم ترین جنگجو سمجھا جانے والا خاوند اپنی بیوی کے سامنے بزدل بن جاتا ہے؟ کیا ہوتا ہے؟ ہر مرد زن مرید ہوتا ہے۔یہ بظاہر مبالغہ آمیز بیان معلوم ہوتا ہے۔تاہم ایسا نہیں ہے کیونکہ اشد ضرورت کے وقت ہر شوہر کو زن مرید بننا پڑتا ہے، تمام دن اسے بہادری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور وہ گھر میں بہادری سے آرام چاہتا ہے۔اگر اسے گھر میں آرام نہ ملے تو وہ کہاں آرام ڈھونڈے گا؟ چنانچہ جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو اپنا اسلحہ ایک جانب رکھ دیتا ہے۔

وہ بازار میں بہادری کا مظاہرہ کرتا رہا ہے، مسلسل لڑتا رہا ہے اور دشمنوں کے مقابل ڈٹا ہے۔یہ جنگ ہے، دنیا میں مسلسل جنگ جاری ہے۔سارا دن جنگ ہوتا ہے۔جب وہ گھر آتا ہے تو جنگ سے تھک چکا ہوتا ہے۔وہ بہادری سے تھک چکا ہوتا ہے۔آپ چوبیس گھنٹے بہادر نہیں رہ

سکتے۔ یاد رہے کہ کوئی بھی شخص چوبیس گھنٹے بہادر نہیں رہ سکتا۔ آپ چوبیس گھنٹے صرف مستعد رہ سکتے ہیں۔ اس کے سوا ہر شے متضاد سمت میں حرکت کرتی ہے۔

آپ گھر آتے ہیں۔ آپ تھکاوٹ زدہ ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اب آپ لڑ نہیں سکتے۔ آپ سارا دن لڑتے رہے ہیں۔ بیوی سارا دن کیا کرتی رہی ہے؟ اسے کوئی مقابلہ درپیش تھا نہ وہ جنگ میں شریک تھی۔ وہ گھر میں تھی اور محفوظ تھی۔ وہ سارا دن آرام سے رہی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دن بھر کوئی ایسا معاملہ درپیش نہ تھا کہ جس میں وہ بہادری کا مظاہرہ کرتی۔ وہ بزدلی سے تنگ آ چکی ہے، چنانچہ آپ گھر آتے ہیں اور وہ تیار ہوتی ہے، وہ آپ پر پل پڑے گی۔

ایک شیر سدھانے والا شخص بیحد بہادر سمجھا جاتا تھا تاہم وہ اپنی ٹھگنی سی بیوی سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا۔ جب بھی وہ دیر سے گھر پہنچتا تو مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ ایک رات وہ دیر تک دوستوں کے ساتھ رہا۔ شراب پی اور گھر جانا بھول گیا۔ آدھی رات کو اسے گھر کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ اس کا ایک گھر اور ایک بیوی بھی ہے۔ ایسے میں گھر جانا بیحد مشکل تھا چنانچہ اس نے سوچا کہ چھپنے کی جگہ کیا ہو سکتی ہے؟ وہ چھوٹے سے قصبے میں رہتا تھا اور اگر وہ کسی ہوٹل میں بھی چلا جاتا تو اس کی بیوی اسے وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالتی۔ کوئی جگہ نہ پا کر وہ شیروں کے پنجرے میں چلا گیا۔ یہ پنجرہ چڑیا گھر میں تھا جہاں وہ شیروں کو سدھایا کرتا تھا۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا، اس کے اندر چھ خوفناک شیر بیٹھے تھے۔ اس نے ایک شیر کی پشت پر سر رکھا اور اسے تکیہ بنا کر سو گیا۔

اس کی بیوی نے سارے قصبے میں اسے تلاش کیا۔ کہیں نہ پا کر وہ علی الصبح چڑیا گھر میں پہنچ گئی۔ شوہر پنجرے میں لیٹا خراٹے بھر رہا تھا۔ بیوی نے پنجرے کے سوراخ میں اپنی چھتری کی نوک داخل کر کے اسے چبھوئی اور بولی ''بزدل، تم باہر تو آؤ، میں تمہیں بتاتی ہوں''

ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ اگر آپ ایک انتہا کا انتخاب کرتے ہیں تو دوسری آپ کا پیچھا کرے گی۔ ہو سکتا ہے کہیں آپ بہادر ہوں مگر کہیں نہ کہیں آپ بزدل بھی ہوں گے۔ ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ بزدلی آرام کا دوسرا نام بھی ہے۔ چنانچہ میں کہتا ہوں کہ اشد ضرورت کے باعث شوہر کو بزدل بھی بننا پڑتا ہے۔ صرف ایک صورت میں ہی شوہر زن مرید نہیں ہوتا۔ اگر وہ گھر میں بیوی کے طور پر کام کرے اور بیوی گھر سے باہر نوکری کرے تو ایسا شوہر زن مرید نہیں کہلائے گا۔ ایسے

میں شوہر شوہر نہیں رہتا بلکہ بیوی بن جاتا ہے اور اس کی بیوی شوہر کا کردار ادا کرنے لگتی ہے۔ ایک انتہا دوسری کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے اور آپ کو اسے کہیں نہ کہیں ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ بصورت دیگر یہ بے حد بوجھ بن جائے گی اور اس کے نیچے زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے گا۔ صرف ذہانت اور آگاہی (جسے بدھ مت کے پیروکار ''پراجنیان'' کہتے ہیں) سکون بخش ہوتی ہے۔ آگاہی کی حالت بلی جیسی ہوتی ہے جو نیند کی حالت میں بھی مستعد رہتی ہے۔ سوتی بلی کے اردگرد ہلکی سی آواز بھی پیدا کی جائے تو وہ چھلانگ لگا کر بھاگ کھڑی ہوگی۔ درمیانی حالت میں رہنے والا ذہن ہی متوازن ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ نیند کی حالت میں بھی چوکنا ہوگا۔ ایسا شخص آرام کی حالت میں نہیں ہوتا کہ آرام کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ کبھی تناؤ کا شکار بھی نہیں رہا۔ وہ بہادر ہے نہ بزدل۔ اس نے دونوں چیزیں سمجھ لی ہیں اور ان سے آگے بڑھ گیا ہے۔

انسان جھوٹ میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے ایسا ہی کرنا ہے کیونکہ وہ اپنے وجود کو مکمل طور سے قبول نہ کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ وہ صرف وجود کے کچھ حصے کو قبول کرتا ہے۔ ایسے میں دوسرے حصوں کا کیا کیا جائے؟ اسے ان حصوں کو چھپانے کیلئے کوئی جھوٹ تخلیق کرنا ہے۔

تھامس نے انہیں کہا ''اگر میں مسیح کے بتائے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی بول دوں تو تم لوگ پتھر اٹھا لو گے اور مجھ پر برساؤ گے''

سچائی کا استقبال ہمیشہ اسی انداز میں ہوتا ہے۔ سچائی کا دعویٰ کرنا آسان نہیں۔ جو بھی اسے سنے گا وہ آپ کا دشمن بن جائے گا۔ لوگ آپ کو پتھر مارنا شروع کر دیں گے۔ لوگ آپ کیخلاف نہیں ہوتے بلکہ وہ تو اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے جھوٹ کو بچانا چاہتے ہیں، اس لیے آپ کو پتھر مارتے ہیں۔

''تم پتھر اٹھا لو گے اور مجھ پر برساؤ گے....''

اس کے بعد وہ بے حد خوبصورت بات کہتا ہے ''.....ان پتھروں سے آگ نکلے گی جو تم لوگوں کو جلا کر راکھ کر دے گی''

''تم مجھ پر پتھر پھینکو گے، تم سچائی پر پتھر برساؤ گے، مگر پتھروں سے آگ نکلے گی جو تمہیں جلا دے گی'' آپ سچائی کو نہیں جلا سکتے۔ سچ کو مصلوب نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے مسیح کو مصلوب کر دیا۔ اسی باعث میں کہہ رہا تھا کہ جب یہودیوں نے مسیح کو مصلوب کیا تو وہ حقیقت میں مصلوب

نہیں ہوئے تھے۔ یہودیوں نے دراصل خود کو مصلوب کر دیا۔ ان کے پتھروں سے نکلنے والی آگ آج تک بھڑک رہی ہے۔ وہ اس سے اجتناب برتتے ہیں اور آگ سے دور بھاگتے ہیں جبکہ آگ ان کا پیچھا کرتی ہے۔ آپ جتنے چاہیں پتھر پھینکیں، سچائی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

آپ جس لمحے سچائی پر پتھر برساتے ہیں اسی لمحے خود زخمی ہو جاتے ہیں۔ آپ کے اپنے پتھروں سے آگ بھڑکے گی۔ یہی یہودیوں کی کُل تاریخ ہے۔ وہ بیس صدیوں سے مسلسل جل رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہودیوں کو تکلیف پہنچانے والے لوگ راستی پر ہیں۔ نہیں، میں ہٹلر کا حمایتی نہیں ہوں۔ میں ان دوسرے لوگوں کا بھی حامی نہیں جنہوں نے یہودیوں کو نقصان پہنچایا۔ بالکل بھی نہیں، وہ لوگ درست نہیں کر رہے۔ یہودی اپنے زخم اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ وہ اپنے ہٹلر خود تخلیق کرتے ہیں۔ یہ بات سمجھنا بیحد مشکل ہے۔

ندامت کا شکار انسان ایسے شخص کو تلاش کرتا ہے جو اسے سزا دے سکے۔ جب کوئی اسے سزا نہیں دیتا تو اس کیلئے زندہ رہنا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ جب کوئی اسے سزا دیتا ہے تو وہ آسانی محسوس کرتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی بچوں کو دیکھا کہ اگر آپ انہیں سزا نہ دیں تو وہ اپنے آپ کو خود سزا دے لیتے ہیں۔ وہ اپنے ہی منہ پر تھپڑ مارتے ہیں۔ اس سے انہیں سکون ملتا ہے۔ جب وہ کچھ غلط کرتے ہیں تو انہیں اس بات کا انتظار ہوتا ہے کہ ماں، باپ، بڑا بھائی یا کوئی اور انہیں سزا دے گا۔ جب انہیں علم ہوتا ہے کہ کسی کو ان کی غلطی کا علم ہو گیا ہے اور اب انہیں سزا ملے گی تو وہ پرسکون ہو جاتے ہیں۔ کہانی ختم ہوئی، بچے نے غلطی کی اور اسے اس کی سزا مل گئی۔ تاہم اگر بچے کی غلطی کا کسی کو علم نہ ہو پائے تو وہ مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی شے نامکمل رہ جاتی ہے۔ ایسے میں وہ کونے میں جا کر اپنے منہ پر خود چانٹا مار لے گا۔ ایسا کر کے وہ پرسکون ہو جائے گا۔

بااصول لوگوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ جب وہ کچھ غلط کرتے ہیں تو خود کو سزا دیتے ہیں۔ آپ انہیں بہت بڑا ولی سمجھتے ہیں مگر وہ عام لوگ ہوتے ہیں جو ندامت کے احساس کے تحت خود کو سزا دیتے ہیں۔ اس مقصد کیلئے وہ روزہ رکھ سکتے ہیں، اپنی ہی چھاتی پیٹ سکتے ہیں اور خود کو زندہ جلا سکتے ہیں تاہم ان کی مثال غلطی کرنے والے بچوں جیسی ہوتی ہے۔ وہ ناپختہ بچے ہیں جو خود کو سزا دیتے ہیں۔ جب وہ کچھ غلط کرتے ہیں تو توازن برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ خدا سے کہنا چاہتے ہیں کہ ''میں نے خود کو بیحد تکلیف پہنچائی ہے، اب مجھے سزا ملنی چاہئے'' یہودی جو کچھ کر

رہے ہیں وہ انسانی ذہن کی گہری ترین پیچیدگیوں میں سے ایک ہے۔ یہودی ہمیشہ اپنے ہٹلروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اپنا قاتل ڈھونڈ کر انہیں سکون ملتا ہے۔ جب انہیں کوئی زحمت نہیں دیتا تو وہ بے سکونی محسوس کرتے ہیں، ندامت ان کا پیچھا کرتی ہے۔ جب آپ سچائی پر پتھر پھینکتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے، حتیٰ کہ بیس صدیوں کے بعد بھی یہودیوں نے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ نہیں، مسیحؑ ناقابل قبول ہیں۔ وہ ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا مسیحؑ کا وجود ہی نہ تھا۔ مسیحؑ تاحال ان کا حصہ نہیں ہیں۔ میں آپ کو باور کر دوں کہ جب تک وہ مسیحؑ کو قبول نہیں کر لیتے ان کی حالت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ وہ بدستور مشکل میں مبتلا رہیں گے۔ یہ مشکل دوسروں کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ وہ خود اس کے متلاشی ہیں۔ انہیں اپنے جرم پر ندامت ہے اور یہ بہت بڑی ندامت ہے۔

کیا آپ کے خیال میں بدھا، مسیحؑ اور کرشنا کو مصلوب کرنے سے بڑا گناہ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ مسیحؑ کی پیروی اور پوجا ہونا چاہئے تھی، آپ نے اس سے الٹ کیا۔ مسیحؑ کو آپ کی زندگی بننا چاہئے تھا، آپ کے دل کی دھڑکن میں تبدیل ہونا چاہئے تھا مگر آپ نے اس سے الٹ کیا۔ آپ نے اسے ہلاک کر دیا۔ اسے اپنی زندگی بنانے کے بجائے الٹا اس کی زندگی ختم کر دی۔ یہ زخم یہودیوں کا پیچھا کرے گا۔ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ اس مقصد کیلئے انہیں مسیحؑ کو قبول کرنا پڑے گا۔

ہندو یہودیوں سے بہتر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کندھوں پر کم گناہوں کا بوجھ ہے۔ انہوں نے بدھا کو ہلاک نہیں کیا۔ بدھا مسیحؑ سے کہیں زیادہ ''خطرناک'' تھا۔ اس نے ہندوازم کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالیں۔ مسیحؑ نے کہا تھا کہ ''میں روایت ختم کرنے نہیں آیا بلکہ اسے مکمل کرنے آیا ہوں'' بدھا نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کا کہنا تھا ''میں تمام روایت کی جڑ ختم کرنے آیا ہوں، تمام وید بکواس ہیں'' تاہم ہندوؤں نے اسے ہلاک نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو احساس گناہ کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف بدھا کو ہلاک نہیں کیا بلکہ وہ بیحد چالاک اور ہوشمند لوگ ہیں۔ انہوں نے اسے اوتار بنا لیا۔ انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ چند لوگ بھٹکے، اس کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اسے روایت میں قبول کر لیا۔ وہ کہتے ہیں ''بدھا ہمارا دسواں اوتار ہے'' انہوں نے اس کے گرد ایک کہانی گھڑ لی۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہندوؤں کو بے حد چالاک اور ہوشیار سمجھتا ہوں۔

کوئی اور نسل اس قدر چالاک نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ وہ بے حد قدیم ہیں، پرانا ہونا ہی انہیں زیادہ عقلمند بناتا ہے۔ تجربات نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے بدھا کو مصلوب کر دیا تو پھر کبھی اس سے آزاد نہیں ہو پائیں گے کیونکہ وہ آپ کا پیچھا کرے گا اور آپ پر مسلط ہو جائے گا۔ چنانچہ اسے مصلوب مت کرو، البتہ اسے نظرانداز کر دو۔ تاہم جب آپ کسی شے کو نظرانداز کرتے ہیں تو بار بار اس کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے۔ تاہم قبولیت کا انداز مسترد گی جیسا ہونا چاہئے۔ اسے ہوشیاری کہتے ہیں۔

ہندوؤں نے ایک کہانی گھڑی۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ''خدا نے دوزخ اور جنت تخلیق کیں، مگر ہزاروں برس تک دوزخ خالی ہی رہی کہ کوئی گناہ گار ہی نہ تھا۔ ہر شخص مذہبی اور خدا ترس ہونے کے ناطے جنت میں جاتا تھا۔ ایسے میں شیطان خدا کے پاس گیا اور کہنے لگا ''تم نے یہ دوزخ کس کے لیے تخلیق کی ہے؟ یہ بے حد بیکار ہے، یہاں کوئی نہیں آتا جبکہ میں انتظار کر کے اکتا گیا ہوں، لہٰذا کچھ کرو ورنہ اسے بند کر دو''

خدا نے جواب دیا ''انتظار کرو، میں گوتم بدھا نامی شخص کو دنیا میں بھیجوں گا۔ وہ لوگوں کو پریشان کر دے گا۔ جب لوگ پریشان ہوں گے تو راہِ راست سے بھٹکنا شروع ہو جائیں گے۔ یوں وہ دوزخ میں آتے جائیں گے اور دوزخ بھر جائے گی'' چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دوزخ بھر گئی۔ تاہم انہوں نے بدھا کو خدا کے بھیجے ہوئے اوتار کے طور پر قبول کر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے لطیف انداز میں مسترد بھی کر دیا۔ انہیں کبھی گناہ کا احساس نہیں ہوا۔

تاہم یہودی احساس گناہ میں مبتلا رہے۔ زخم ان کا پیچھا کرتا ہے اور وہ تا حال مسیحؑ کو قبول نہیں کر رہے۔ انہیں مسیحؑ کو اپنا لینا چاہئے۔ مسیحؑ یہودی تھے، وہ یہودی پیدا ہوئے، یہودیوں کے طور پر جیے اور یہودی کی حیثیت سے ہی مرے۔ وہ کبھی عیسائی نہیں تھے۔ یہودی انہیں قبول کر سکتے ہیں۔ کوئی اور یہودی ان کے مرتبے کو نہیں پہنچا۔ حالیہ صدی میں بھی بہت سے عظیم یہودی پیدا ہوئے ہیں مگر مسیحؑ جیسا کوئی نہیں ہے۔ دورِ جدید کے عظیم ترین لوگ یہودی تھے۔ ان میں بیحد صلاحیت پائی جاتی ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ یہودی تھا، کارل مارکس اور آئن سٹائن بھی یہودی تھے۔ عظیم بیسویں صدی تخلیق کرنے والی یہ تینوں شخصیات یہودی تھیں۔ تاہم ان کا مسیحؑ سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہودیوں نے عظیم ترین یہودی کو مسترد کر دیا۔ جب وہ اسے قبول کر لیں گے تو پرسکون ہو

جائیں گے۔ ان کا زخم بھر جائے گا۔ وہ صحت مند اور مکمل ہو جائیں گے اور انہیں ایڈولف ہٹلر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ انہوں نے اپنے ہٹلر خود تخلیق کیے ہیں۔ جب میں یہ بات کہتا ہوں تو آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب بھی آپ کو احساس گناہ ہوتا ہے، تو آپ سزا دینے والا ڈھونڈتے ہیں۔ آپ کو سزا درکار ہوتی ہے کیونکہ سزا آپ کو پرسکون کر دیتی ہے اور آپ کا احساس گناہ ختم کر دیتی ہے۔ خود کو گناہگار محسوس مت کریں، بصورت دیگر آپ سزا کے متلاشی ہو جائیں گے۔

زندگی سے اس کی ہمہ گیری میں لطف اٹھائیں، وگرنہ آپ احساس گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ زندگی کو ''جیسے ہے'' کی بنیاد پر قبول کریں، اس پر شکرگزار ہوں اور دل کی گہرائیوں سے ممنون رہیں۔ یہی بات ہمیں ''مذہبی'' بناتی ہے۔ جب ایک مرتبہ آپ کُل کو قبول کر لیتے ہیں تو خود کُل بن جاتے ہیں۔ تمام تر تقسیم غائب ہو جاتی ہے اور ایک گہری خاموشی آپ کو اوپر اٹھا لیتی ہے۔ آپ نامعلوم سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ جب آپ مکمل ہو جاتے ہیں تو اسی صورت میں معلوم آپ کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔

☆☆☆

مسیحؑ نے کہا

''اگر تمہارے رہنما تمہیں کہیں کہ 'دیکھو، خدا کی سلطنت جنت میں ہے' تو جنت کے پرندے تم سے پہلے وہاں پہنچیں گے''

''اگر وہ تم سے کہیں کہ 'خدا کی سلطنت سمندر میں ہے' تو مچھلیاں تم سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گی''

''مگر خدا کی سلطنت تو آپ کے اندر اور آپ سے باہر موجود ہے''

''اگر تم خود کو جان لو گے تو سبھی تمہیں پہچان لیں گے۔ ایسے میں تمہیں علم ہو جائے گا کہ تم زندہ باپ کے بیٹے ہو''

''اگر آپ خود کو نہیں پہچانتے تو غربت میں رہتے ہیں اور غربت بن جاتے ہیں''

چھٹا باب

کُھلا بھید

خدا کی سلطنت کے حوالے سے یہی بیان کیا جاتا رہا ہے کہ جیسے یہ کہیں اور واقع ہے۔ گویا یہ سلطنت فی الوقت یہاں موجود نہیں ہے بلکہ وقت اور خلا میں کہیں پائی جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ خدا کی سلطنت ابھی اور یہیں موجود کیوں نہیں ہے؟ یہ مستقبل میں اور کسی اور جگہ کیوں واقع ہے؟

ایسا انسانی ذہن کے باعث ہے۔ انسانی ذہن زمانہ ءحال میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہ مستقبل میں بستا ہے، امید میں زندہ رہتا ہے اور مستقبل کے وعدے پر خوش رہتا ہے۔ یہ خواہش کے ذریعے عمل کرتا ہے۔ خواہش کو وقت درکار ہوتا ہے۔ وقت کے بغیر خواہش کا وجود قائم رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر کسی لمحے اچانک آپ کو یہ محسوس ہو کہ وقت غائب ہو چکا ہے، اب کوئی وقت اور کوئی کل وجود نہیں رکھتے تو آپ کی خواہش کا کیا بنے گا؟ ایسے میں خواہش بھی وقت کے ساتھ غائب ہو جائے گی۔

وقت بنیادی طور پر مادی مظہر نہیں ہے بلکہ یہ نفسیاتی مظہر ہوتا ہے۔ وقت آپ سے باہر موجود نہیں ہوتا۔ یہ آپ کے ذہن کی اختراع ہے۔ مسیحؑ وقت کے بغیر زندہ رہتا ہے جبکہ آپ وقت میں زندہ رہتے ہیں۔ تمام بدھا اور مسیحؑ اور آگاہ لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''خواہشات ختم کرو، تبھی جنت کے دروازے تم پر وا ہوں گے'' تاہم خواہش ختم کرنے کے لیے آپ کو اب اور یہیں ہونا پڑتا ہے کیونکہ ایسے میں مستقبل میں جانے کیلئے کوئی پل باقی نہیں رہتا۔ خواہش ہی یہ پل ہوتی ہے۔ ذہن کو وقت درکار ہوتا ہے۔ ذہن وقت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کے پاس جس قدر وقت ہوگا ذہن کے پاس کھیلنے کیلئے اتنا ہی میدان ہوگا اور وہ اسی قدر احمقانہ حرکتیں کر سکے گا۔ تب

یہ بہت سی خواہشات اور خواب تخلیق کر کے ان میں رہ سکتا ہے۔ مذہبی پیشوا ہمیشہ کچھ ایسی بات کرتے چلے آئے ہیں جیسے جنت مستقبل میں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ذہن صرف مستقبل کو ہی سمجھتا ہے اور صرف مستقبل کی بدولت ہی آپ کا استحصال ممکن ہے۔ آپ خود بھی اسی میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک گرجا گھر میں پادری خدا کی سلطنت (جنت) کی تعریف بیان کرنے میں مصروف تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ''جنت میں گلیاں سونے اور میدان زمرد سے بنے ہیں'' اس نے جس قدر ممکن تھا تعریف کر ڈالی اور کہنے لگا ''کون وہاں جانا پسند کرے گا؟'' ایک بوڑھے کے سوا تمام لوگوں نے ہاتھ بلند کر دیے۔ پادری کو اس پر یقین نہ آیا۔ اس نے سوچا ''بوڑھے نے ہاتھ بلند کیوں نہیں کیا؟ اسے تو سب سے پہلے ہاتھ بلند کرنا چاہئے تھا کہ وہ قریب المرگ ہے اور اس کے دوسروں سے پہلے جنت میں جانے کا امکان ہے'' اب اس نے جہنم کا نقشہ کھینچا اور اس کی تمام تر بدصورتی، تشدد، تکالیف، مصائب اور آگ کا منظر بیان کیا۔ بیان کے بعد اس نے حاضرین سے دوبارہ پوچھا کہ ''کون خدا کی سلطنت یعنی جنت میں جانے کا خواہاں ہے؟'' تمام لوگوں نے ہاتھ بلند کیے مگر بوڑھا بدستور ہاتھ جھکائے بیٹھا رہا۔ پادری بے حد حیران ہوا۔ اس نے بوڑھے سے پوچھا ''تم نے میری بات نہیں سنی؟ کیا تم بہرے ہو؟ کیا تم خدا کی سلطنت میں جانا پسند نہیں کرتے'' بوڑھے نے جواب دیا ''یقیناً، میں جنت میں جانا چاہتا ہوں، مگر تم جس انداز میں بیان کر رہے ہو اس سے تو لگتا ہے کہ تم ہمیں ابھی جنت میں لے جانا چاہتے ہو، میں جنت میں ضرور جانا چاہتا ہوں مگر فوری طور پر نہیں''

اگر آپ سے کہا جائے کہ ''خدا کی سلطنت ابھی اور یہیں موجود ہے'' تو آپ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ دنیا چھوڑنے سے قبل آپ نے بہت سی خواہشات مکمل کرنا ہیں۔ خدا کی سلطنت میں داخلے سے قبل بہت سی باتیں مکمل ہونا باقی ہیں۔ آپ بھی تک محو خواب ہیں اور جاگنے کو تیار نہیں۔ آپ کو وقت چاہئے۔ آپ کیلئے پیشوا تو باعث کشش ہے مگر بدھا اور مسیحؑ کوئی کشش نہیں رکھتے کیونکہ مسیحؑ بے وقتی کی اصطلاح میں بات کرتے ہیں۔ مسیحؑ کے ساتھ رہنا مستقل بے اطمینانی میں زندگی بسر کرنے جیسا ہے۔ وہ آپ کو خواب کی سہولت سے مستفید ہونے نہیں دے گا۔ وہ آپ کو وقت اور مستقبل بھی نہیں دے گا۔ وہ کہے گا ''کوئی کل وجود نہیں رکھتی''

''کل'' ایک اور انداز میں معاونت فراہم کرتی ہے۔ آپ اس وقت جس حالت میں ہیں اس میں خود کو قبول نہیں کرتے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ قدر و قیمت کے حامل نہیں ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ اس حالت میں آپ خود بھی اپنے آپ کو قبول نہیں کر سکتے تو خدا آپ کو کیسے قبول کرے گا؟ نہیں، یہ ناممکن ہے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ آپ نے اپنی بیحد مذمت کی ہے۔ آپ اس قدر خطا کار ہیں کہ خدا آپ کو قبول نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ اس وقت اگر جنت کا دروازہ کھلتا ہے تو آپ میں اس قدر ہمت نہیں ہوگی کہ اس میں داخل ہو جائیں۔ آپ کو اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کیلئے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ آپ کو اچھا ہونے اور پاکیزہ انسان بننے کیلئے تھوڑا سا وقت چاہئے۔ آپ کو بہت سے کام کرنے کیلئے تھوڑا سا وقت درکار ہے تاکہ آپ قابل قبول بن جائیں اور خدا آپ سے پیار کر سکے۔ بہت سی خواہشات ایسی ہیں جنہیں تکمیل کی ضرورت ہے۔ بہت سے ''ہونا چاہئے'' منتظر ہیں اور انہیں وقت درکار ہے۔

دنیا کی تمام تر اخلاقیات (اس کی اشکال مختلف ہو سکتی ہیں مگر لازمی بنیاد ایک ہی ہے) آپ کی مذمت کرتی رہی ہے۔ آپ غلط ہیں، کچھ ہونا چاہئے، آپ کو درست ہونا ہے، آپ کو پختہ ہونا ہے، آپ کو قدر و قیمت کا حامل بننا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کہے کہ ''دروازہ کھلا ہے'' تو آپ بے اطمینانی محسوس کریں گے۔ ایسے میں آپ اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ تاہم اگر وہ کہتا ہے کہ ''آپ کو مستقبل میں داخل ہونا ہے'' تو کافی وقت باقی ہے۔ آپ پرسکون ہیں، آپ اس پر کام کر سکتے ہیں، آپ خود کو بہتر بنا لیں گے۔ آپ اپنی عمدہ شبیہ تخلیق کر سکتے ہیں۔ ایک مثالی ہستی بنا سکتے ہیں، آپ اس مثال کی پیروی کریں گے۔ کسی نہ کسی روز آپ ولی بن جائیں گے۔ یہی دنیا کا فریب ہے۔ اگر آپ ملتوی کر سکتے ہیں تو ذہن پہلے جیسا ہی رہے گا۔ پہلے جیسا رہنے کیلئے ذہن التوا چاہتا ہے۔ یہ تبدیلی نہیں چاہتا، اسے مثالوں کی ضرورت ہے۔ نصب العین کی ضرورت ہے۔ چھلانگ نہ لگانے کیلئے وقت درکار ہے چنانچہ آپ ملتوی کر سکتے ہیں۔

آپ جس طرح ہیں اسی طرح رہنے کی بنیاد التوا ہے۔ اگر گھر میں آگ لگ جائے تو آپ وہاں سے بھاگنا ملتوی نہیں کریں گے۔ آپ فوراً بھاگ اٹھیں گے۔ آپ کسی سے یہ بھی نہیں پوچھیں گے کہ ''دروازہ کہاں ہے؟ سیڑھیاں کہاں ہیں؟ کہاں سے باہر نکلنا ہے؟'' آپ کسی رہنما کو بھی تلاش نہیں کریں گے۔ آپ چھلانگ لگا کر باہر کود جائیں گے۔ ایسے میں ہر سمت دروازہ بن

جائے گی۔ آپ جہاں بھی ہوں وہیں سے باہر جانے کا سفر شروع ہو جائے گا۔ آپ یہ نہیں کہیں گے کہ ''کیا میری اس قدر اہمیت ہے کہ مجھے بچایا جائے؟ کیا میں اہم ہوں؟'' نہیں، یہ تمام سوالات کبھی نہیں ابھریں گے۔

فلسفہ عیاشی کے لمحات کیلئے ہوتا ہے۔ آپ سوال کر سکتے ہیں، جواب لے سکتے ہیں اور ملتوی کر سکتے ہیں۔ مگر جب خطرہ سامنے ہوگا تو آپ تمام تر فلسفہ ایک جانب رکھ دیں گے۔ کیا آپ نے کبھی مشاہدہ کیا کہ جب آپ خطرے میں ہوتے ہیں تو اپنے ذہن کو ایک جانب رکھ دیتے ہیں؟ آپ سوچتے بھی نہیں۔ سوچنے کیلئے وقت ہی نہیں ہوتا۔ گھر میں آگ لگی ہے اور آپ چھلانگ لگا کر بھاگ نکلتے ہیں۔ جب آپ باہر نکل آتے ہیں تو درخت تلے بیٹھ کر سوچ سکتے ہیں کہ کیا ہوا تھا۔ تاہم خطرے کے موقع پر جب موت سر پر کھڑی ہو تو وقت کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آپ کو محض عمل کرنا ہوتا ہے۔ سوچنے کا وقت نہیں ہوتا، آپ کو عمل کرنا ہے اور عمل ہی آپ کی جان بچاتا ہے۔

وقت التوا کا نام ہے۔ آپ لاکھوں وجوہات کی بنا پر التوا پسند کریں گے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے معاملات نامکمل ہیں۔ آپ نے دنیا کا ذائقہ ہی نہیں چکھا۔ آپ لاکھوں مرتبہ اس دنیا میں رہے ہیں۔ آپ نے لاکھوں انداز میں اس کا ذائقہ چکھا ہے مگر بھوک تا حال باقی ہے۔ پیاس بدستور باقی ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ آپ کو دنیا میں خاطر خواہ وقت نہیں ملا۔ تمام ماضی کا مطلب ابدی ہے، آپ ابد سے یہیں ہیں۔ آپ لاکھوں انداز سے لاکھوں خواہشات کی تکمیل کرتے چلے آئے ہیں اور تا حال بھوکے پیاسے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں مزید وقت درکار ہے؟ آپ بہت سا وقت لے چکے ہیں۔ آپ کو مزید وقت نہیں چاہئے بلکہ سمجھ بوجھ اور آگہی کی تکمیل کرنا ہے۔

آپ کو جس قدر وقت بھی دیا جائے (خواہ یہ لامحدود ہی کیوں نہ ہو) خواہش بدستور نامکمل رہے گی۔ خواہش کی بنیادی فطرت یہی ہے کہ یہ تشنہ رہتی ہے۔ یہ بار بار ابھرے گی اور آپ اسے پورا کرنے کی جس قدر کوشش کریں گے یہ اسی قدر اور ابھرے گی۔ جب آپ یہ سوچتے ہیں کہ آپ خواہش کی تکمیل کر رہے ہیں تو دراصل آپ اس کی پرورش کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ جنسی عمل میں حصہ لیتے ہیں، آپ کا خیال ہوتا ہے کہ آپ اس خواہش کی تکمیل کر رہے ہیں مگر آپ اس کی پرورش

کر رہے ہوتے ہیں۔ کل یہ مزید وحشیانہ انداز میں سامنے آ کھڑی ہوگی اور اب کے توقعات بھی پہلے سے زیادہ ہوں گی۔ آپ اس کی دوبارہ پرورش کرتے ہیں تاہم کل یہ پھر آپ کے دروازے پر دستک دے گی اور ہر روز بڑھتی چلی جائے گی۔ جوں جوں آپ کو اس کا تجربہ ہوتا چلا جائے گا آپ مزید بھوکے بنتے چلے جائیں گے۔ آپ خواہش کی تکمیل نہیں بلکہ پرورش کر رہے ہیں۔

ہر قسم کی خواہش کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ عام خواہش کو دیکھیں۔ کسی بالکل عام خواہش کو لیں۔ آپ کھانا کھاتے ہیں، بھوک غائب ہو جاتی ہے، تاہم یہ صرف دوبارہ آنے کے لیے ہی غائب ہوتی ہے۔ کیا خوراک کے ذریعے بھوک ہمیشہ کیلئے غائب ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی ایسا امکان موجود ہے کہ صرف کھانا کھا کر بھوک کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے؟ آپ پیاسے ہیں، آپ پانی پیتے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پانی پی کر پیاس ہمیشہ کیلئے غائب ہو گئی؟ نہیں، یہ خواہش کی فطرت نہیں ہے۔ یہ وہ عام سی خواہشات ہیں جنہیں آپ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بار بار ابھرنے والی خواہشات ہیں اور آپ انہیں جس قدر دہراتے ہیں یہ آپ کو اسی قدر اپنے ساتھ جکڑ لیتی ہیں کیونکہ دہرائی تنویم ہوتی ہے۔ آپ نے کل کیا، آج کیا اور کل پھر کریں گے۔ آپ آج ایک خواہش کی تکمیل کر رہے ہیں اور آپ کو کل دوبارہ ایسا ہی کرنے کی امید ہے۔ آپ خواہش کو دہرا رہے ہیں۔ آپ جس قدر دہراتے ہیں اسی قدر اس میں گر جاتے ہیں۔

آپ نے اپنی لاکھوں زندگیوں میں بے شمار انداز میں مختلف خواہشات کی ہیں۔ آپ جیسی بھی خواہش کرتے ہیں اگلے جنم میں ویسا ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کتے کی طرح جنسی عمل کرنا چاہتا ہے تو وہ اگلے جنم میں کتا بن کر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص سور کی طرح لالچی ہو تو سور جیسا پیدا ہوگا۔ آپ ہر ممکن انداز میں پیدا ہو چکے ہیں۔ آپ درخت، پرندے اور جانور کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ہندو اسے ''آواگون'' کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ لاکھوں عورتوں سکے بطن سے پیدا ہو چکے ہیں۔ آپ کی خواہش بہت سے روپ بدل چکی ہے اور آپ ہر ممکنہ جہت سے تھک چکے ہیں۔

اب تک کچھ نہیں ہوا، کبھی کچھ نہیں ہونے والا کیونکہ خواہش کی فطرت تشنہ ہی رہتی ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے مستقبل درکار نہیں ہے۔ مستقبل کی ضرورت نہیں۔ مستقبل کے بغیر ہی آپ یہیں اور ہمیشہ رہتے ہیں۔ جب مستقبل ختم ہو جاتا ہے تو خواہش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ایک اور انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ خود کو ہر انداز میں تبدیل کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ آپ اپنے گزشتہ جنم سے واقف نہیں ہیں مگر اس زندگی کو ضرور جانتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو تبدیل کرنے کیلئے سب کچھ کر چکے ہیں۔ کیا آپ تھوڑے سے بھی تبدیل ہوئے؟ میں نے ''تھوڑا سا'' کہا ہے۔ کیا آپ میں تھوڑی سی تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے؟ یا ایسا ہے کہ آپ پہلے جیسے ہی ہیں۔ کیا آپ میں واقعتاً کوئی حقیقی تبدیلی رونما ہوئی ہے؟ کیا آپ میں کوئی جینیاتی تغیر رونما ہوا؟ اگر اب تک ایسا نہیں ہوا تو یہ سوچنے کی کیا وجہ ہے کہ مستقبل میں ایسا ہو جائے گا؟ اگر آپ اسی انداز میں جیتے ہیں تو پھر کبھی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ التوا ذہن کی چال ہے جو تبدیلی رونما ہونے سے روکتی ہے۔

یہ بے حد گہری چال ہے اور اسے سمجھا جانا چاہئے۔ آپ مستقبل کے لیے التواء کی حکمت عملی کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اس لیے کہ آپ کسی کام کو اب نہیں کرنا چاہتے۔ آپ منطقی کھیل کھیلتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ''اس وقت یہ مشکل ہے مگر کل ایسا کرنا آسان ہوگا'' مگر ہر کل آج بن جاتا ہے، کل جب بھی آئے گی وہ آج ہوگی۔ یہ ذہن کی چال ہے جو آسائش وسہولت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کل کبھی نہیں آتی۔

التواء تبدیلی کا راستہ نہیں ہوتا۔ اب تک آپ ملتوی کرتے چلے آئے ہیں۔ آپ بار بار ملتوی کرتے چلے آئے ہیں۔ آپ ہر لمحے ملتوی کرتے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی حالت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اگر آپ یہ بات سمجھ لیں تو اسی لمحے تبدیلی واقع ہوگی۔ تبدیلی کیلئے کسی کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بیداری کا نام ہے۔ یہ تبدیلی یا ترمیم کا سوال نہیں۔ یہ اپنی ذات کے ساتھ کچھ کرنے کا سوال نہیں۔ آپ جیسے بھی ہیں مکمل ہیں۔ آپ میں کوئی کمی نہیں۔ آپ کو صرف بیداری کی ضرورت ہے۔ خواب کی حالت سے باہر نکل آئیں۔ اپنی آنکھیں کھولیں اور حقیقت پر نظر ڈالیں، حقیقت تبدیل کر دیتی ہے۔ ایسے میں آپ اچانک ماضی سے نکل آتے ہیں۔

جب آپ مستقبل کو چھوڑ دیتے ہیں تو ماضی فوراً غائب ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کے بنیادی ترین قوانین میں سے ایک ہے۔ اگر آپ مستقبل کو ترک کر سکتے ہیں تو ماضی فوراً ختم ہو جاتا ہے کیونکہ مستقبل کے بغیر یہ وجود ہی نہیں رکھ سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کسی دریا پر پل بناتے ہیں۔ پل کو وجود قائم کرنے کیلئے دو کناروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایک کنارہ غائب ہو جائے

تو دوسرا کنارہ اکیلا پل کو قائم نہیں رکھ سکتا اور پل گر جاتا ہے۔ ہر شے غائب ہو جاتی ہے۔ ماضی اور مستقبل دو کنارے ہیں۔ انکے مابین آپ خواہش کا پل بناتے ہیں۔ آپ ہمیشہ کہیں نہ کہیں جا رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ کہیں نہیں پہنچ پاتے تو ذہن کہتا ہے ''تیز چلو'' یہی وجہ ہے کہ تمام جدید رجحان ''رفتار'' کیلئے ہے۔ ذہن کہتا ہے ''آپ اس لیے نہیں پہنچ پا رہے کہ رفتار خاطر خواہ نہیں ہے۔ منزل فلاں جگہ پر ہے۔ آپ اسے کل، پرسوں یا اگلے دن جالیں گے۔ منزل سامنے ہے۔ آپ اسے افق پر دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کی رفتار تیز نہیں ہے۔ جلدی چلیں، بھاگیں، رفتار کو مزید بڑھاوا دینے کیلئے نیا طریق کار تخلیق کریں''

اس منطق کے باعث ہم چاند پر پہنچ گئے ہیں اور ہم نے کوئی منزل سر نہیں کی۔ رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جلد یا بدیر ہم روشنی کی رفتار حاصل کر لیں گے۔ اس وقت ہم آواز کی رفتار سے چل رہے ہیں۔ رفتار جس قدر زیادہ ہوگی آپ اسی قدر کھوئے جائیں گے۔ ایسے میں واپسی بیحد مشکل ہو جائے گی۔ اس وقت آپ بہت زیادہ رفتار کے حامل نہیں ہیں۔ رفتار جس قدر تیز ہوئی واپسی اسی قدر مشکل ہو جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اپنی ذات کا علم تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ رفتار کا دور ہے۔ بدھا نے اپنے آپ کو با آسانی پہچان لیا۔ مسیحؑ نے خود کو آسانی سے جان لیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ ایسے دور میں زندہ تھے جب رفتار بیحد آہستہ تھی۔ وہ سادگی سے سفر کرتے تھے۔ بیل گاڑی تیز ترین سواری تھی جبکہ آپ بیل گاڑی سے زیادہ تیز رفتاری سے چل سکتے ہیں۔ وہ زمین پر چلتے تھے جبکہ ہم فضاؤں میں اڑ رہے ہیں۔ ہم خلا میں نقب لگا چکے ہیں۔ ہم جس قدر تیز رفتاری سے چل رہے ہیں واپسی اسی قدر مشکل ہوگی۔

دو بھکاریوں کو گلی میں موٹر سائیکل کھڑی مل گئی جسے کوئی شخص وہاں بھول گیا تھا۔ موٹر سائیکل کے ساتھ فاضل نشست والی گاڑی بھی لگی ہوئی تھی۔ ایک بھکاری اچھل کر موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا اور دوسرا اس کے ساتھ لگی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب دونوں تیز رفتاری سے دوسرے قصبے کی طرف چل دیے۔ پندرہ منٹ کے بعد موٹر سائیکل چلانے والے بھکاری نے اپنے ساتھی کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہے مرنے کے قریب ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بھکاری نے اس سے پوچھا ''کیا معاملہ ہے؟'' دوسرے نے جواب دیا

''رفتار ہلکی کردو، اس گاڑی کا تو پیندا ہی نہیں اور میں تمام راستے بھاگتا چلا آرہا ہوں'' خواہش کا کوئی پیندا نہیں ہوتا۔ آپ تمام راستے بھاگتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے قریب المرگ ہیں۔ آپ بے حد تیز رفتاری سے بھاگتے چلے آئے ہیں جبکہ اس شے کا تو پیندا ہی نہیں۔ چونکہ خواہش کا پیندا نہیں ہوتا اس لیے یہ کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اگر آپ بے پیندے کے برتن میں پانی بھرنا شروع کر دیں تو کب تک بھرتے رہیں گے؟ اس کا بھرنا ممکن ہی ہیں۔ آپ خواہش کے اس بے پیندہ برتن کو بھرنے کے قابل کیوں نہیں ہیں؟ آپ نے اس کے پیندے کو تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ آپ تو بس چھلانگ لگا کر اس میں سوار ہو گئے ہیں۔ آپ اس کے ساتھ تیزی سے بھاگ رہے ہیں۔ آپ کیلئے ٹھہرنا ممکن نہیں اور ذرا دیکھیں تو آپ کی کیا حالت ہے؟

تمام مذہبی پیشواؤں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ تاہم مسیحؑ پیشوا نہیں ہیں۔ آپ مسیحؑ سے زیادہ کسی کو پیشوا مخالف نہیں پائیں گے۔ حقیقی مذہبی آدمی کبھی پیشوا نہیں ہوتا۔ وہ ایسا ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ پیشوا آپ کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ حقیقی مذہبی آدمی اور استاد آپ کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہے۔ پیشوا محض ایک مکار شخص ہوتا ہے جو آپ کی کمزوریوں کو بخوبی جانتا ہے۔ آپ کی کمزوری ''مستقبل'' ہے۔ آپ کی کمزوری ہر معاملے کو ''مستقبل'' پر ملتوی کرنا ہے۔ گویا کہ کبھی نہ کبھی آپ ضرور خدا کی سلطنت میں داخل ہوں گے تاہم ابھی نہیں۔ بہت سے دیگر اہم ترین کام کیے جانا باقی ہیں۔ بہت سی خواہشات تا حال تشنہ ہیں جنہیں پورا کیا جانا ہے۔ آپ کی فہرست میں خدا کا نام سب سے آخر میں ہے اور یہ فہرست لامحدود ہے۔ خدا کو کبھی کوئی موقع ہیں ملنے والا۔ وہ آخری نام ہے۔

اب مسیحؑ کے ان الفاظ پر نظر ڈالیں۔

''اگر تمہارے رہنما تمہیں یہ کہیں کہ 'دیکھو، خدا کی سلطنت جنت میں ہے'...... '' گویا یہاں نہیں، کہیں آسمان میں یا کہیں بہت دور۔ خدا کی سلطنت کہیں بہت دور واقع ہے۔ ''..... تو جنت کے پرندے آپ سے پہلے پہنچیں گے'' وہ آپ سے پہلے جنت میں پہنچ جائیں گے اور آپ گھاٹے میں رہیں گے۔ مسیحؑ مذاق کر رہے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں ''ایسے میں امید مت رکھیں، جنگ کے پرندے آپ سے پہلے پہنچیں گے''... ''اگر وہ آپ سے کہیں کہ خدا کی سلطنت سمندر میں ہے تو مچھلیاں آپ سے پہلے پہنچیں گی''

ایسے میں مچھلیاں آپ سے پہلے خدا کی سلطنت میں پہنچ جائیں گی اور آپ دیکھتے رہ جائیں گے۔ مسیحؑ کس کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں؟ وہ پیشواؤں کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ پیشوا مذہب کے دشمن ہیں مگر وہ اس کے منتظم بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہر شے کا انصرام کرتے ہیں۔ وہ ہر کہیں انتظام و انصرام کرنے کے بعد ہی مسیحؑ جیسے شخص کو اپنے معبدوں میں داخلے کی اجازت دیتے ہیں۔

معروف روسی ناول نگار دستوئفسکی کے شہرہ آفاق ناول ''برادرز کرامازوف'' میں ایک خوبصورت کہانی بیان کی گئی ہے۔

''مصلوب ہونے کے اٹھارہ سو سال بعد مسیحؑ نے سوچا کہ'' زمین پر دوبارہ جا کر دیکھنا چاہئے کہ وہاں کیا حالات ہیں۔ مسیحیت کے اٹھارہ سو سال بعد اہل زمیں مجھے بہر صورت قبول کر لیں گے۔ وہ مجھے ماضی کی طرح مسترد نہیں کریں گے کیونکہ جب میں زمین پر آیا اس وقت وہاں ایک بھی عیسائی نہ تھا۔ میں ان لوگوں میں اجنبی تھا۔ اب تقریباً آدھی دنیا عیسائی ہے۔ زمین پر لاکھوں گرجا گھر ہیں اور مذہبی پیشوا مسلسل ''مسیحؑ'' کا لفظ دہراتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں میرا بھرپور استقبال کیے جانے کی امید ہے۔ مجھ پر تمام دروازے کھول دیے جائیں گے۔ یہی وقت ہے۔ مجھے پہلے وہاں نہیں جانا چاہئے تھا۔ وہ زمین پر جانے کیلئے درست وقت نہیں تھا''۔

چنانچہ ایک اتوار کی صبح مسیحؑ دوبارہ زمین پر آ گئے۔ انہوں نے اتوار کا انتخاب اس لیے کیا کہ ہفتے کے دیگر ایام میں عیسائی اور غیر عیسائی لوگوں کے مابین امتیاز کرنا مشکل تھا۔ یہ امتیاز کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ہر شخص ایک سا ہے۔ صرف اتوار کے دن ہی آپ عیسائی کو شناخت کر سکتے ہیں کیونکہ مذہب اتوار کا معاملہ ہے۔ اس کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو مذہبی رسم ہے۔ یہ تو گویا رسم ہے جسے بادل ناخواستہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ بہرحال مسیحؑ اپنے اسی گاؤں میں پہنچ گئے جہاں اٹھارہ سو سال قبل وہ پیدا ہوئے تھے۔ یہ گاؤں بیت اللحم تھا۔ وہ بازار کی جانب گئے۔ اس موقع پر انہیں قدرے تشویش لاحق تھی کیونکہ لوگوں نے تا حال انہیں نہیں پہچانا تھا۔ لوگ گرجا گھر میں آ جا رہے تھے۔ اسی اثنا میں چند لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے ''تم بالکل مسیحؑ جیسے دکھائی دیتے ہو، تم نے بیحد عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے، تم اچھے اداکار ہو'' مسیحؑ نے انہیں کہا ''میں اداکار نہیں بلکہ حقیقی مسیحؑ ہوں''

لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور بولے ''اگر تم واقعی مسیحؑ ہو تو پادری کے باہر آنے سے پہلے ہی بھاگ نکلو، بصورت دیگر مشکل میں پھنس جاؤ گے'' اسی دوران چھوٹے بچوں نے ان پر پتھر پھینکنا شروع کر دیے اور لوگ ہنسنے لگے۔ لوگوں نے انہیں کہا ''یہودیوں کا بادشاہ آ گیا ہے، یہ وہ شخص ہے جسے انہوں نے مصلوب کر دیا تھا، وہ دوبارہ زندہ ہو کر آ گیا ہے''

لوگ ہنسنے اور مذاق کرنے میں مصروف تھے جس پر مسیحؑ نے بے حد دکھ محسوس کیا کہ یہ لوگ تو ان کے ''اپنے'' تھے۔ یہ لوگ یہودی نہیں بلکہ عیسائی تھے۔ یہ ان کی پیروی کرتے تھے اور جب وہ حقیقی حالت میں ان کے سامنے موجود تھے تو انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ تاہم مسیحؑ نے انتظار کیا۔ انہیں امید تھی کہ ''کم از کم میرا پیشوا مجھے ضرور پہچان لے گا، ہو سکتا ہے یہ احمق لوگ ہوں، جاہل ہوں، مگر میرا پیشوا مجھے ضرور پہچانتا ہے''

اسی دوران پیشوا بھی آن پہنچا۔ لوگوں نے اس کی تعظیم میں ہنسنا بند کر دیا۔ اس کے لیے راستہ خالی کر دیا گیا۔ لوگ اس کے سامنے تعظیماً جھک گئے۔ مسیحؑ دل ہی دل میں ہنسے کہ ''یہ لوگ میرے سامنے نہیں جھکے، انہوں نے مجھے تعظیم نہیں دی، مگر پیشوا کا احترام کر رہے ہیں۔ کم از کم یہی ایک اچھی علامت ہے کیونکہ وہ ''میرا'' پیشوا ہے۔ اس کے ذریعے لوگ مجھے پہچان لیں گے۔ چونکہ لوگ ''اندھے'' ہیں اور مجھے دیکھ اور پہچان نہیں سکتے اس لیے امید ہے کہ وہ مجھے پیشوا کے ذریعے ہی پہچانیں گے۔

پیشوا نے مسیحؑ کی طرف دیکھا اور بولا ''ادھر آؤ بدمعاش، تم ہمارے خدا کی توہین کر رہے ہو'' مسیحؑ نے جواب دیا ''کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟''

پیشوا نے انہیں گریبان سے پکڑ لیا اور بولا ''میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ'' وہ انہیں گرجا گھر میں لے گیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ مسیحؑ یہ سوچ کر بے حد حیران تھے کہ ''کیا ہونے والا ہے، کیا آپ میرے اپنے ہی لوگ مجھے مصلوب کرنے والے ہیں؟''

رات کے وقت پیشوا دوبارہ گرجا گھر میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی موم بتی تھی۔ اس نے کمرے کا درواہ کھولا اور اندر آ کر مسیحؑ کے قدموں میں جھک گیا۔ اس نے مسیحؑ کے پاؤں چھوئے اور کہنے لگا ''میں نے آپ کو اچھی طرح پہچان لیا تھا مگر بازار میں دوسرے لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا کیونکہ آپ بہت پرانا مسئلہ ہیں۔ ہم نے کسی نہ کسی طرح معاملات کو

سنبھال رکھا ہے مگر آپ سارا کھیل بگاڑ دیں گے۔ اب ہر شے اچھی طرح کام کر رہی ہے۔ عیسائیت مستحکم ہو چکی ہے۔ ہم نصف دنیا کو عیسائیت میں لا چکے ہیں اور بقیہ بھی جلد مسیحیت کے دائرے میں آ جائے گی۔ آپ وہیں رہ کر انتظار کریں، آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمام معاملات نہایت عمدگی سے انجام دے رہے ہیں۔ آپ کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہئے''

پیشوا نے مزید کہا ''ہم آپ کو اس وقت پہچان لیں گے جب ارد گرد کوئی نہ ہو گا تاہم آپ کو بازار میں اور دوسروں کے سامنے نہیں پہچانیں گے کیونکہ آپ پیشوا مخالف، کلیسا مخالف اور حاکمیت مخالف ہیں۔ اگر آپ اپنی ضد پر اڑے رہے تو ہمیں آپ کو دوبارہ مصلوب کرنا پڑے گا۔ جب آپ موجود نہ ہوں تبھی ہم آپ کی عبادت کر سکتے ہیں کیونکہ اس سے کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ہر شے اچھے انداز میں روبہ عمل ہے۔ ذرا دیکھیے تو ہم نے سب کچھ کس قدر عمدگی سے سنبھال رکھا ہے۔ نصف دنیا کو عیسائی بنایا جا چکا ہے۔ یہاں لاکھوں گرجا گھر ار پیشوا آپ کا نام الاپ رہے ہیں۔ آپ کو مطمئن ہونا چاہئے۔ چنانچہ یہاں سے فوری بھاگ نکلیں اور دوبارہ یہاں کا رخ مت کیجئے گا۔ آپ جو کچھ کرنا چاہیں ہمارے توسط سے کر سکتے ہیں۔ ہم یہاں آپ کے کارندے ہیں۔ آپ کو براہ راست عوام میں جانے کی اجازت نہیں۔ آپ خطرناک ہیں''

پیشوا بنیادی ترین بات سچائی بیان کر رہا ہے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ پیشوا مذہبی نہیں ہو سکتا۔ وہ بدھا کا پیشوا تو ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں وہ بدھا کا مخالف ہے۔ وہ اس کیلئے کام کرتا ہے، اس کے الفاظ دہراتا ہے تاہم اگر بدھا دنیا میں واپس آ جائے تو یہی پیشوا خدا اور آپ کے درمیان کھڑا ہو گا۔ وہ آپ کو بدھا سے ملنے نہیں دے گا کیونکہ بدھا اور مسیحؑ ہمیشہ باغی ہوتے ہیں۔ وہ عبادت گاہ اور پیشوا کے ہمنوا نہیں ہوتے۔ وہ انقلاب لا سکتے ہیں تاہم حاکمیت پیدا نہیں کر سکتے۔

جب مسیحؑ یہ کہتے ہیں کہ ''اگر تمہارے رہنما..... '' تو ان کا اشارہ پیشواؤں کی طرف ہوتا ہے۔ خدا کی سلطنت جنت میں ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ''جنت کے پرندے تم سے پہلے پہنچیں گے'' اگر وہ تمہیں کہیں کہ ''خدا کی سلطنت سمندر میں ہے تو مچھلیاں تم سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گی'' پیشوا ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ یہ کہیں اور واقع ہے۔

ہندوستان کی سنیے۔ یہ پیشواؤں کا قدیم ترین ملک ہے۔ ہندوستان میں مذہبی پیشواؤں کے وسیع طبقے نے ''برہمن'' نامی ذات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ خود کو سماج سے مکمل طور پر الگ

رکھتے ہیں۔ان کی ہر بات خفیہ ہوتی ہے اور ہر ایک کو ان کی زبان سیکھنے یا بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہر ایک کو ان کے انداز میں تعلیم نہیں دی جا سکتی تھی کیونکہ تعلیم یافتہ ہونے کی صورت میں لوگ ان کی مذہبی کتابیں پڑھ کر سچ سے آگاہ ہو سکتے تھے۔صرف پیشوا کو ہی علم کی گہری ترین خانقاہ میں داخلے کی اجازت دی گئی۔اس کے علاوہ کسی کو علم تک رسائی نہ دی جاتی تھی۔

ان براہمنوں نے ملک پر ہزاروں سال تک حکومت کی۔ابتداء میں وہ یہ کہتے رہے کہ خدا کوہ ہمالیہ میں بستا ہے کیونکہ ہمالیہ نا قابل رسائی تھا۔تاہم آہستہ آہستہ لوگ ہمالیہ پر پہنچنا شروع ہو گئے اور انہیں وہاں خدا دکھائی نہ دیا۔ چنانچہ براہمنوں نے کہا ''یہ وہ ہمالیہ نہیں جس کی ہم بات کرتے ہیں، یہ تو اصل ہمالیہ کا محض نمونہ ہے، اصل ہمالیہ تو جنت میں ہے، یہ تو محض اس کا عکس ہے۔آپ کو خدا عکس میں نہیں ملے گا، حقیقی کیلاش اور حقیقی ہمالیہ دوسری دنیا میں ہے'' تب ان کے خدا دوسری جگہ، چاند اور ستاروں میں چلے گئے۔

جب انسان پہلی مرتبہ چاند پر پہنچا تو ہندو بے حد پریشان ہوئے۔جین مت کے پیروکاروں کو بھی بے حد بے چینی لاحق ہوگئی۔مغرب کو اندازہ ہی نہیں کہ انہیں کس قدر پریشانی ہوئی کیونکہ مغربی دنیا کو علم ہی نہیں تھا کہ ہم نے چاند میں کس قدر ''سرمایہ کاری'' کر رکھی ہے۔ہندوستان میں بے حد بے چینی پھیل گئی۔

یہاں ایک مذہبی پیشوا ایسا بھی ہے جو یہ ثابت کرنے کیلئے کوشاں ہے کہ یہ سارا کھیل اور انسان کا چاند پر پہنچنا جھوٹ ہے۔کیوں؟ سادہ سی بات ہے کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے۔وہ اس سے انکار کیوں کر رہا ہے؟اس شخص نے بہت بڑا ادارہ قائم کر رکھا ہے۔بہت سے لوگوں نے اس ادارے کو لاکھوں روپے عطیہ کیے ہیں اور اس کا مقصد انسان کے چاند پر پہنچنے کو نری خیالی داستان ثابت کرنا ہے۔ایسا کیوں ہے؟اس لیے کہ لوگ اس میں بے حد سرمایہ لگا چکے ہیں۔

اگر انسان چاند پر پہنچ گیا اور اسے خدا وہاں دکھائی نہ دیا تو پھر خدا کا ٹھکانہ کہیں اور منتقل کرنا ہے۔سائنس دان ہر جگہ پہنچ رہے ہیں۔اب خدا کو کسی ایک جگہ پر طویل قیام کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔جب بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا فلاں مقام پر موجود ہے تو انسان وہاں پہنچ جاتا ہے۔جنت نا قابل رسائی تھی، سمندر نا قابل رسائی تھا۔بعض قدیم مذاہب میں خدا کو سمندر کا رہائشی کہا گیا ہے۔ایسے مذاہب بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ خدا جنت میں رہتا ہے۔تاہم پیشوا کے لیے ایک بات

یقینی ہے کہ '' خدا یہاں نہیں رہتا کیونکہ اگر وہ زمین پر رہتا ہے تو بے حد مشکل کھڑی ہو جائے گی۔ ایسے میں پیشوا کیلئے کوئی جگہ نہیں بچے گی۔

مذہبی پیشوا کی حیثیت خدا اور بندے کے مابین دلال کی سی ہے۔وہ کارندہ اور مصالحت کنندہ ہے۔اگر خدا یہاں موجود ہے تو پھر آپ اس کا براہ راست سامنا کر سکتے ہیں۔ایسے میں مذہبی پیشوا کا کام کیا رہ جائے گا؟ پیشوا کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب خدا دور ہوتا ہے اور اس کی آواز براہ راست آپ کے کانوں میں نہیں پہنچ پاتی۔وہ اپنا پیغام پیشوا کو دیتا ہے اور پیشوا آپ کے سامنے اس کی تشریح کرتا ہے۔اس تشریح کے ذریعے وہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔کلید اسی کے پاس ہے اور آپ جاہل ہیں۔وہ آپ کی رہنمائی کرے گا، وہ آپ کا استاد ہے اور گرو ہے، آپ اس کے پیروکار ہیں۔

کرہ ارض پر پیشوا کا پیشہ سب سے زیادہ عیارانہ ہے۔سب سے زیادہ عیارانہ کیوں؟اس لیے کہ وہ بے حد معصوم دل کا استحصال کر رہا ہے۔ایک انسان خدا کی جستجو میں ہے، جو خلوص اور سچائی کی جستجو میں ہے اسے استحصال کا شکار بنایا جا رہا ہے۔اگر آپ دولت کے متلاشی کا استحصال کریں تو اس میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں ہوگا کیونکہ دونوں دولت کے متلاشی ہیں۔تاہم اگر آپ سچائی کے متلاشی کا استحصال کریں تو یہ عیاری اور مکاری ہوگی۔عیارانہ ترین اور بدترین شے بھی ممکن ہے۔مذہبی پیشواؤں کو سوچنا، کہنا اور ثابت کرنا چاہئے کہ وہ واقعتاً خدا کے نمائندے ہیں یا واقعتاً خدا کے نمائندے نہیں ہیں۔اگر وہ نمائندے ہیں، اگر وہ خدا کے نمائندے ہیں تو پھر شیطان کے نمائندے ہیں۔تاہم وہ منتظم بن چکے ہیں۔

مسیحؑ نے کہا ''اگر تمہارے رہنما تمہیں کہیں کہ دیکھو، خدا کی سلطنت جنت میں ہے'' تو انہیں مت سنیں، بصورت دیگر آپ خدا کی سلطنت کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کھو دیں گے۔

مگر سلطنت آپ کے اندر موجود ہے، یہ کہیں اور واقع نہیں ہے، یہ عین وہیں ہے جہاں اس لمحے آپ موجود ہیں۔یہ آپ کے بغیر ہے، یہ آپ میں ہے اور آپ کے بغیر ہے۔یہ آپ میں مرکز کی طرح ہے اور باہر سے آپ کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے۔

مسیحؑ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیونکہ اندرون اور بیرون کا مجموعہ ہی تمام دنیا اور تمام کائنات ہے۔ایسے میں کچھ باقی نہیں رہتا۔مسیحؑ کہہ رہے ہیں '' خدا کائنات ہے اور سب کچھ ہونے کا نام

خدا ہے۔ سب کچھ خدا ہے۔ خدا خود کو اپنی تخلیق میں حل کر چکا ہے" خدا مصور جیسا نہیں ہے جو تصویر بنا کر خود اس سے الگ رہتا ہے۔ وہ رقاص کی طرح ہے جو رقص کرتے ہوئے خود رقص بن جاتا ہے۔ آپ رقص اور رقاص کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔ آپ مصور کو تصویر سے الگ کر سکتے ہیں، شاعر کو شاعری سے الگ کر سکتے ہیں مگر رقاص کو رقص سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اپنے دیوتا شیوا کو "ناتاراج" یعنی عظیم رقاص کہتے ہیں کیونکہ رقص اور رقاص میں کوئی علیحدگی نہیں ہوتی۔

اگر آپ رقص کو سمجھ سکیں تو رقاص کو سمجھ لیتے ہیں۔ اگر آپ رقص کو پکڑ لیں تو رقاص کو پکڑ لیں گے۔ اگر آپ اس دنیا سے محبت کر سکتے ہیں تو گویا آپ نے خدا سے محبت کی۔ اگر آپ پھول میں سرایت کر سکتے ہیں تو اسے وہاں بھی پا لیں گے۔ وہ یہیں چھپا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ظاہر بھی ہے کیونکہ وہ خود کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس لیے چھپا ہوا ہے کہ آپ ظاہر نہیں ہیں۔ بصورت دیگر وہ کھلا بھید ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ ہر جانب موجود ہے، وہ اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ خدا کی سلطنت آپ کے اندر ہے، یہ آپ کے اردگرد ہے۔

"اگر آپ خود کو جان لیں گے تو آگاہ ہو جائیں گے اور سمجھ لیں گے کہ آپ زندہ باپ کے بیٹے ہیں۔ مگر آپ نے خود کو نہ جانا تو غربت میں ہی رہیں گے"

سنیے، خدا کی سلطنت آپ کے اندر ہے۔ ایسے میں تمام عبادت گاہیں بے کار ہو جاتی ہیں کیونکہ آپ خود عبادت گاہ بن جاتے ہیں۔ آپ گرجا گھر بن جاتے ہیں اور ویٹی کن بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں روم محض بوجھ ہی لگتا ہے، ایسے میں گرنار اور کاشی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ خود مندر بن جاتے ہیں۔ آپ خدا کا چلتا پھرتا مندر ہوتے ہیں۔ خدا آپ میں موجود ہے۔ ایسے میں پیشوا کی کیا ضرورت؟ مصالحت کار کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ ایسے میں پیشوا کا تمام پیشہ مفہوم کھو دیتا ہے۔

وہ آپ میں بستا ہے۔ وہ ہمیشہ سے آپ کے اندر رہتا چلا آ رہا ہے، خواہ آپ جیسے بھی ہوں"

کسی نے رنزائی سے کہا "میں خود جاننا چاہتا ہوں، اس مقصد کیلئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

رنزائی نے جواب دیا "اگر تم اس کی جستجو کرو گے تو نہیں بن پاؤ گے کیونکہ تم پہلے ہی بدھا ہو"

یہ لغو بات ہے۔ بدھا خود بدھا کا متلاشی ہے اور بدھا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ خدا کو نہیں ڈھونڈ سکتے کیونکہ وہ کہیں اور نہیں بلکہ آپ کے اندر ہے۔ آپ اپنے اندر کبھی نہیں دیکھتے

کیونکہ مذہبی پیشوا کہتا ہے "دیکھو، جنت وہاں ہے، خدا بہت دور ہے، سفر طویل ہے، تمہیں وہاں تک پہنچنے کیلئے میری مدد درکار ہوگی" مسیح تمام کلیساؤں، معبدوں، پیشواؤں اور مصالحت کاروں کا کردار ختم کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "وہ تم میں موجود ہے" تاہم وہ نہایت خوبصورتی سے ایک اور خوبصورت بات بھی کہتے ہیں کہ "اور وہ تم سے باہر موجود ہے"

دنیا میں تین اقسام کے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو کہتی ہے کہ "خدا باہر ہے" ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب میں خدا کے باہر ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ دوسری قسم کے مذاہب کہتے ہیں کہ "خدا اندر ہے" جین مت اور بدھ مت انہی مذاہب میں شامل ہیں۔ ان مذاہب کا کہنا ہے کہ "آپ خدا ہیں" وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ "خدا باہر ہے" مسیح کہتے ہیں کہ "خدا اندر اور باہر ہے" یہ ممکنہ ترین درست ترتیب ہے۔ وہ کسی انتہا کا انتخاب نہیں کر رہے۔

ایک انتہا یہ ہے کہ "خدا باہر ہے" یہی وجہ ہے کہ اسلام میں "میں خدا ہوں" کہنا کفر کے زمرے میں آتا ہے اور اسے بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ منصور حلاج کو اسی لیے ہلاک کر دیا گیا تھا کہ وہ وجد کی کیفیت میں "اناالحق" کہتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ "میں خدا ہوں" یہ بات توہین خدا سمجھی جاتی ہے۔ اسلام کے نزدیک خدا انسان کی ذات کا حصہ نہیں ہے۔ انسان خدا سے قریب تو ہو سکتا ہے مگر خدا نہیں ہو سکتا۔ مخلوق خالق کیسے ہو سکتی ہے؟ مخلوق ہمیشہ مخلوق رہتی ہے۔ چنانچہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ خود کو خدا کہنا خدا کی توہین ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی غلام یا تخلیق کردہ شے یہ دعویٰ کر دے کہ میں خود خالق یا آقا ہوں۔ یہ غیر مذہبی بات ہے۔

کچھ لوگ اس سے متضاد سمت میں کھڑے ہیں۔ جین مت کے پیروکاروں کا شمار انہی میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا انسان کے اندر ہے۔ آپ کی روح ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ یہ لوگ دوسری انتہا پر چلے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ کسی خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ عبادت ان کیلئے مفہوم کھو چکی ہے۔ وہ عبادت کرتے ہیں نہ دعا مانگتے ہیں۔ کس سے دعا مانگی جائے؟ یہ ان کیلئے بے معنی ہو چکی ہے۔

مسلمانوں کو عبادت کرتا اور نماز پڑھتا دیکھیں۔ وہ عبادت کر سکتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ مسلم کی عبادت جیسی کوئی اور شے نہیں۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو مسلمان کو دیکھیں۔ عبادت کے دوران وہ بے حد معصوم اور مکمل طور سے سپر انداز نظر آتا ہے۔ تاہم وہ خطرناک بھی ہے۔ اگر

آپ دعویٰ کریں کہ آپ خدا ہیں تو وہ آپ کو ہلاک کر دے گا۔ جین عبادت نہیں کر سکتے۔ وہ دعا نہیں مانگ سکتے۔ عبادت اور دعا کی جہت غائب ہو چکی ہے۔ وہ صرف استغراق کر سکتے ہیں۔ استغراق کی اجازت ہے کیونکہ خدا انسان کے اندر ہی موجود ہے۔ آپ نے صرف آنکھیں بند کرنا ہیں اور مراقبہ شروع ہو جائے گا۔

مسیحؑ ترکیب کی انتہا پر پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے ایک عظیم ترین سچائی بیان کی ہے کہ ''خدا اندر اور باہر موجود ہے'' ایسے میں عبادت بھی ممکن ہے اور استغراق بھی ہو سکتا ہے۔ آپ وجد کی حالت میں ''باہر والے'' کیلئے گا سکتے ہیں اور وجدانی کیفیت میں ''اندر والے'' کیلئے خاموش بھی رہ سکتے ہیں۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ دعا کو ترک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ استغراق کو چھوڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسلامی روایت میں مراقبے جیسے کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔ ان کے ہاں صرف عبادت ہی ممکن ہے۔ جین مت میں عبادت جیسی کوئی شے موجود نہیں، وہاں صرف مراقبے کی گنجائش ہے۔ دونوں دو متضاد انتہاؤں پر کھڑے ہیں۔

مسیحؑ بدستور متوازن ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''خدا کی سلطنت آپ اندر اور باہر ہے'' اگر آپ خود کو جان لیں گے تو آگاہ ہو جائیں گے''

یہ مرکب ہے۔ جین مت کے مطابق اگر آپ خود کو جان لیں گے تو گویا سب کچھ جان جائیں گے۔ اس کے بعد مزید کسی شے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسلام کی رو سے صرف خدا کی پہچان ضروری ہے اور اگر انسان خدا کو پہچان لے تو اس کی رحمت سے معمور ہو جاتا ہے۔ ذات کے علم کا کوئی امکان نہیں کیونکہ اگر آپ نے خود کو جاننے کی کوشش کی تو خدائی کا دعویٰ کر بیٹھیں گے۔ صرف خدا اپنے آپ کو جانتا ہے، اس کی مخلوق اسے مکمل طور سے نہیں جان سکتی۔ انسان خدا کی عظمت اور شان سے مستفید ہو سکتا ہے اور اس کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کر سکتا ہے۔

اسلام کی رو سے انسان خدا کی طاقت کے ذریعے آگے تو بڑھ سکتا ہے مگر اپنی ذات کی پہچان کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے بجائے جین مت میں ذات کی پہچان ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر آپ خود کو جان لیتے ہیں تو گویا آپ نے سب کچھ جان لیا۔ اس کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا۔ تاہم مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''اگر آپ خود کو جان لیں گے تو سب آپ کو جان لیں گے''۔ یہ بیحد لطیف نکتہ ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ''سب آپ کو جان لیں گے'' تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اگر آپ خود کو جان لیں تو

سب آپ کو جان لیں گے۔ آپ کے علم میں تمام تر ہستی آپ کو دیکھے گی۔ ایسے میں صرف آپ ہی تمام زندگی کو نہیں دیکھیں گے بلکہ زندگی بھی آپ کو دیکھے گی کیونکہ خدا اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہے۔ جب کوئی شخص خود کو جان لیتا ہے تو یہ صرف اپنے آپ کی پہچان ہی نہیں ہوتا بلکہ تمام خدائی آپ کو جان لیتی ہے۔ اپنی ذات کے علم میں آپ جانے پہچانے ہیں۔ خدا آپ کو ہر پھول ہر پتے اور ہر پتھر کے ذریعے دیکھتا ہے۔ اس طرح آپ خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتے۔ واقعتاً جب تک آپ نے خود کو نہیں پہچانا تھا اس وقت تک آپ اکیلے تھے۔ جب آپ خود کو جان لیتے ہیں تو ساری خدائی آپ کو جان لیتی ہے۔ آپ کا علم یگانہ فعل نہیں ہے۔ یہ کوئی اکیلی چیز نہیں بلکہ ہم آہنگی کا نام ہے۔ جب آپ جان لیتے ہیں تو ہر شے آپ کو جان جاتی ہے۔ جب آپ خود کو پہچان لیتے ہیں تو ہر شے آپ کو پہچان لیتی ہے۔ ایسے میں درخت، پتھر اور پرندے بھی پہلے جیسے نہیں رہتے۔ یہ تمام چیزیں آپ سے کسی اور انداز میں پیش آنے لگتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیونکہ سب کچھ ایک سا ہے۔ اندر اور باہر ایک ہی شعور کار فرما ہے۔

جب آپ خود کو جان لیتے ہیں تو تمام خدائی آپ کو پہچان لیتی ہے اور خوشی مناتی ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہئے کیونکہ آپ زندگی کا حصہ ہیں۔ آپ کے علم پر تمام خدائی کو خوشی منانا چاہئے۔ کیونکہ اس کا ایک حصہ جان چکا ہے۔ ایک حصہ بدھا، مسیحؑ کے روپ میں ڈھل گیا ہے۔ اس حصے کے ذریعے ساری خدائی ایک چوٹی اور مقام عروج پر پہنچ گئی ہے۔ اب تمام خدائی خوش ہوگی۔ اب تمام خدائی مختلف انداز میں پھلے پھولے اور کھلے گی۔ آپ پہچان لیے جائیں گے۔

اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد آپ اکیلے نہیں رہیں گے۔ اب ہر شے اس پر خوشی منائے گی۔ مسیحؑ نے جو خوبصورت ترین بات کہی ہے وہ یہی ہے۔ آپ کے علم پر پوری خدائی جشن مناتی ہے۔ خدائی کا ایک حصہ پھول کی مانند کھلتا ہے تو اس کی تکمیل پر ہر ایک خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

''اگر آپ خود کو جان لیں گے تو سبھی آپ کو جان جائیں گے''

انسان کے دل میں جانے اور پہچانے جانے کا گہرا میلان پایا جاتا ہے۔ یہ میلان اپنی ذات کے علم سے بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ آپ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ آپ کو جانا جائے۔ آپ کے دل میں، کہیں گہرائی میں یہ خواہش ضرور پائی جاتی ہے کہ ہر شخص آپ کو جانے اور پہچانے۔ ہو سکتا ہے یہ خواہش کسی غلط سمت میں جا رہی ہو، ہو سکتا ہے آپ غلط طریقے سے لوگوں کی توجہ حاصل

کرنے کیلئے کوشاں ہوں۔ تاہم آپ کی ذات کی گہرائیوں میں اس خواہش کا بیج موجود ہے۔ یہ بے حد بامعنی بیج ہے۔ یہ کہتا ہے کہ جب تک ساری خدائی آپ کو پہچان نہ لے اور آپ سے خوش نہ ہو اس وقت تک آپ کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

آپ کو چاہنے اور چاہے جانے کی ضرورت ہے۔ آپ کو اپنی پہچان اور دوسروں کی جانب سے پہچانے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو اپنے حوالے سے دوسروں کا ردعمل درکار ہے۔ بصورت دیگر تمام کارخانہء ہستی مردہ ہو کر رہ جائے گا اور صرف آپ ہی جان پائیں گے اور بقیہ خدائی ایسے خاموش ہوگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایک انسان مسیحؑ بن گیا اور پوری خدائی اس سے بے خبر رہی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ کسی نے زحمت ہی گوارا نہ کی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تمام خدائی کو بہر صورت پہچانا چاہئے کیونکہ ہم اس خدائی کیلئے اجنبی نہیں ہیں۔ یہ خدائی گویا ایک خاندان ہے، یہ خدائی باہم مربوط مظہر کے طور پر وجود رکھتی ہے۔ ایسے میں اگر ایک حصہ آگاہ ہو جائے تو اس کی روشنی تمام دلوں کو منور کر دیتی ہے اور ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسیحؑ کہتے ہیں ''اگر آپ خود کو جان لیں گے تو سبھی آپ کو جان جائیں گے اور آپ کو علم ہو جائے گا کہ آپ زندہ باپ کے بیٹے ہیں''

عیسائی کیا کہتے چلے آئے ہیں؟ اس سے قطعی متضاد۔ وہ کہتے ہیں ''مسیحؑ خدا کے واحد بیٹے ہیں'' ان کا تمام تر عقیدہ ''واحد'' کے گرد گھومتا ہے کیونکہ اگر تمام لوگ خدا کے بیٹے ہو جائیں تو مسیحؑ میں کیا خاص بات رہ جاتی ہے۔ ایسے میں وہ منفرد کیوں کہلائیں گے؟ ان کی پوجا کیوں ہوگی؟ صرف مسیحؑ کو خاص آدمی بنانے کی خاطر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا طرز عمل مسیحؑ سے متضاد ہے۔ مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''...... اور آپ جان لیں گے کہ آپ زندہ باپ کے بیٹے ہیں''

مندرجہ بالا قول میں دو نقاط اہم ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کائنات میں موجود ہر جز وکُل کا بیٹا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے۔ آپ اس کے ذریعے اور اس میں پیدا ہوئے ہیں۔ تمام خدائی آپ کی باپ بلکہ ماں ہے۔ ماں کا لفظ استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تاہم یہ بیحد مشکل تھا کیونکہ یہودی ہمیشہ اپنی مردانہ انا کے اسیر رہے ہیں۔ ان کیلئے ''ماں'' کا لفظ استعمال کرنا مشکل تھا۔ دنیا میں ایسے ملک اور نسلیں بھی پائی جاتی ہیں جو مردانہ برتری کی قائل ہیں۔ جرمن اپنے ملک کو ''فادر لینڈ'' کہتے ہیں۔ یہ واحد ملک ہے جہاں ملک کو ''مادر وطن'' نہیں کہا جاتا۔ یہ جرمن خطرناک لوگ ہیں۔ فادر لینڈ

کیوں کہا جاتا ہے؟ خدا کو باپ ہی کیوں ہونا چاہئے؟ خدا ماں کیوں نہیں ہو سکتا؟ وہ نر کیوں ہے اور مادہ کیوں نہیں ہے؟ ماں زیادہ بہتر لفظ معلوم ہوتا ہے کیونکہ بیٹے کی تخلیق میں باپ کا زیادہ حصہ نہیں ہوتا۔ اس کا زیادہ سے زیادہ کردار یہ ہے کہ وہ صرف لبلبی دباتا ہے اور آغاز کرتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ باپ تلف ہو جانے والی چیز ہے۔

باپ کا کام ایک عام انجکشن سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ باپ کا کام سرنج سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ باپ کو استعمال کے بعد ایک جانب پھینکا جا سکتا ہے۔ تمام تخلیق ماں کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ بچے کو نو ماہ تک پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے، اس کا خون اور دیگر چیزیں بچے کا حصہ بن جاتی ہیں۔ آپ کائنات میں اس طرح رہتے ہیں جس طرح ماں کے رحم میں رہا جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کیلئے ''ماں'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ بہتر طور سے سوچتے ہیں۔ تاہم ان کی سوچ محض ''بہتر'' ہی ہے، اسے ''مطلق بہتر'' نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ بصورت دیگر خدا ماں اور باپ دونوں خصوصیات کا حامل ہوگا۔ وہ نر نہیں ہو سکتا مگر وہ مادہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ آغاز کرنے والا اور لبلبی دبانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ آدھا نر اور آدھا مادہ ہے۔ اس میں دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

تاہم یہ حالات پر منحصر ہے۔ جب مسیحؑ دنیا میں موجود تھے تو ان کیلئے خدا کو ''ماں'' کہنا بیحد مشکل تھا کیونکہ تب کسی نے ان کی بات نہ سمجھنا تھی۔ ان کے مخاطب یہودی تھے اور وہ بے حد سفاک نیز باپ نما خدا پر یقین رکھتے تھے جو بیحد انتقام پرور تھا۔ اگر آپ ایسے خدا کو ناراض کر دیں گے تو وہ وہ آپ سے بدترین انتقام لے گا۔ ماں کبھی انتقام پرور نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیشہ درگزر کرتی ہے، وہ ہمیشہ بات سنتی ہے۔ ماں کبھی اصرار نہیں کرتی کہ اس کا حکم مانا جائے۔ اس کے بجائے باپ ہی یہ اصرار کرتا ہے۔

موسیٰؑ کے دس خدائی احکامات ماں کی طرف سے نہیں آ سکتے۔ وہ صرف باپ کی جانب سے ہی موصول ہو سکتے ہیں۔ احکامات، یہ لفظ ہی غلط ہے۔ اس سے یوں ظاہر ہوتا ہے جیسے خدا کوئی جرنیل اور تمام خدائی فوجی کیمپ ہے جس پر اس کا حکم چلتا ہے۔ ایسے میں آپ صرف اپنی ذمہ داری پر ہی حکم عدولی کر سکتے ہیں۔ مسیحؑ نے مروجہ زبان استعمال کی تاہم میں جانتا ہوں کہ وہ لفظ ''ماں'' کو ترجیح دینا چاہتے ہوں گے۔ ماں کا درجہ باپ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ماں کی حیثیت مرکز کی سی

ہے جبکہ باپ محیط ہے۔ خدا میں دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ میں بھی اسے بطور نر مخاطب کرتا ہوں، تاہم میں ایسا صرف سہولت کی خاطر کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا میں مرد اور عورت دونوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔

اور ''....... آپ زندہ باپ کے بیٹے ہیں''

ہر شخص بیٹا ہے۔ بیٹا ہونا اس اصطلاح میں نہیں کہا گیا جس کو اہل منطق، ماہرین عمرانیات اور ماہرین نفسیات بیان کرتے ہیں۔ یہ تشبیہیت نہیں ہے۔ خدا کو ماں باپ اور خود کو بیٹا سمجھنے سے یوں لگتا ہے جیسے آپ انسانی رشتوں کو کائناتی رنگ دے رہے ہیں اور تمام کائناتی مظہر کو خاندانی معاملہ سمجھنے لگے ہیں۔ آپ انسانی اصطلاحوں میں سوچ رہے ہیں۔ یہ ملامت ہے۔

اسے تشبیہیت قرار دینے والے ماہرین عمرانیات ونفسیات (انسان سمجھتا ہے کہ وہ کائنات کا مرکز ہے اور ہر شے کے بارے میں اپنی ہی اصطلاحات اور محسوسات کا اظہار کرتا ہے) جب اسے تشبیہ کہتے ہیں تو وہ دراصل اسے غلط قرار دے رہے ہوتے ہیں۔ تاہم وہ بات کی تہہ تک نہیں پہنچے۔ یہ بظاہر تشبیہیت معلوم ہوتا ہے اور اسے ایسا ہی ہونا ہے کیونکہ انسان کی بات انسانی ہی ہونا ہے۔ حتیٰ کہ معروضی سچائی بھی اسے بیان کرنے والے کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ معروضیت داخلیت کے بغیر وجود ہی نہیں رکھتی۔ یہ داخلی میں ہی پنہاں ہوتی ہے۔

سائنسی سچائیاں بھی معروضی نہیں ہوتیں۔ انہیں دریافت کرنے والا ان میں داخل ہوتا ہے۔ خالص موروثی سچائی تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا کیونکہ اس سے آگاہ ہونے والا اس میں اپنا رنگ بھی شامل کر دیتا ہے۔ تمام علم انفرادی ہوتا ہے۔ جب انسان کچھ سیکھتا ہے تو یہ انسانی بات بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، یہ خوبصورت ہے۔

جب مسیحؑ کہتے ہیں کہ ہم تمام خدا کے بیٹے ہیں تو یہ صرف علامتی بات ہوتی ہے۔ یہ محض تشبیہ ہے۔ ان کا کیا مطلب ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ خالق اور مخلوق کے مابین تعلق میکانکی نہیں ہوتا بلکہ یہ نامیاتی ہوتا ہے۔ تعلق کی نوعیت مکینک کے ہاتھوں مشین کی تخلیق جیسی نہیں ہے۔ بنانے والا باپ بھی نہیں ہے کیونکہ وہ بدستور علیحدہ ہے اور اپنی تخلیق سے الگ کھڑا ہے۔ یہی مفہوم ہے۔ خدا آپ سے الگ نہیں ہوسکتا۔ وہ آپ کے باپ جیسا ہے جو آپ کے ذریعے حرکت کرتا ہے اور افعال انجام دیتا ہے۔ وہ آپ کا خیال رکھتا اور آپ سے محبت کرتا ہے۔ وہ آپ کے گرد ہر انداز

سے خوبصورت دنیا تخلیق کرتا ہے تاکہ آپ تکمیل کے مرحلے کو پہنچ سکیں۔ جب مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''خدا باپ ہے'' تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات آپ کا خیال رکھتی ہے اور آپ کی مدد کرتی ہے۔ صرف آپ ہی خدا کی تلاش میں نہیں ہوتے بلکہ خدا بھی آپ کی تلاش میں مصروف ہوتا ہے۔ کائنات مردہ اور آپ سے الگ نہیں ہے بلکہ یہ پیار بھرے دل سے آپ کو جواب دیتی ہے۔ اگر آپ روتے ہیں تو یہ آپ کے ساتھ روتی ہے، اگر آپ ہنستے ہیں تو یہ آپ کے ساتھ ہنستی ہے۔ اگر آپ تکلیف میں ہوتے ہیں تو پوری خدائی تکلیف محسوس کرتی ہے۔ اگر آپ خوش ہوتے ہیں تو ساری خدائی خوش رہتی ہے۔ آپ اور کائنات کے مابین ایک گہرا رشتہ ہے۔ یہ باپ کا بیٹے سے رشتہ ہے۔

اگر باپ مر جائے تو وہ بیٹے کے ذریعے زندہ رہتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگا۔ بیٹا باپ کا نیا نمونہ ہوتا ہے۔ یہی مفہوم ہے۔ بیٹا باپ کی از سرِ نو پیدائش ہے۔ اسی وجہ سے مسیحؑ بار بار کہتے ہیں کہ ''میں اور میرا باپ ایک ہیں'' اس کا مطلب ہے کہ بیٹا باپ کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ باپ ہے۔ یہ دونوں اکٹھے ہیں، یہ دو نہیں ہیں۔ یہ ایک ہیں اور تعلق نامیاتی ہے۔ آپ کو اکیلا محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔

تمام دنیا اکیلا پن محسوس کرتی ہے۔ ہر شخص اجنبی معلوم ہوتا ہے اور ہر شخص مشکل میں مبتلا ہے۔ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ''ایک دوسرے سے کیسا برتاؤ کیا جائے؟'' اب ہر شخص پوچھتا ہے کہ ''کیا ہوا ہے؟'' یہ بے حد نیا سوال ہے۔ دو سو سال پہلے یہ سوال کسی نے نہیں پوچھا ''کیسے پیش آیا جائے؟'' اب ہر شخص پوچھتا ہے کہ ''ایک دوسرے سے کیسے پیش آیا جائے؟'' تعلق بے حد مشکل بن گیا ہے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے۔ اگر آپ خود کو کُل سے نہیں جوڑ سکتے تو جزو (افراد) سے بھی عمدہ تعلق نہیں رکھ سکتے۔ آپ اپنے باپ سے اچھا تعلق نہیں رکھ سکتے۔ یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ کائنات سے متعلق نہیں ہو سکتے تو پھر کسی سے تعلق نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ تمام کا منبع ہے۔ ایسے میں مذہب اور تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔

جو ملک لادینیت اختیار کر لے وہ ہمیشہ تعلقات میں مشکلات محسوس کرتا ہے۔ آپ اپنی بیوی، اپنے بھائی، بہن، بیٹے، اپنے باپ اور ماں سے بھی تعلق نہیں رکھ سکتے۔ ایسا ناممکن ہے۔ تعلق ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ تمام تعلقات کی بنیاد غائب ہو گئی ہے۔ آپ انکار کر چکے ہیں۔ آپ

نے کہہ دیا ہے کہ ''خدا کا کوئی وجود نہیں، خدا مردہ ہے'' ایسے میں تمام کائنات اجنبی بن جاتی ہے۔ آپ خود کو الگ تھلگ اور غیر متعلق محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے میں آپ کی جڑیں کائنات میں نہیں رہتیں اور کائنات آپ کا خیال رکھنا چھوڑ دیتی ہے۔

سائنسدان کی دنیا اور مسیح جیسے آدمی کی کائنات بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سائنسدان کے لیے کائنات ایک حادثاتی شے ہے۔ اس کائنات کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ آپ کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ آپ حادثاتی مخلوق ہیں، اگر آپ نہ ہوتے تو کائنات کو آپ کی غیر موجودگی کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔ اگر آپ ہیں تو کائنات میں آپ کی موجودگی اہمیت کی حامل نہیں۔ اگر آپ غائب ہو جاتے ہیں تو کائنات آپ کیلئے آنسو نہیں بہاتی۔

سائنسدان کی کائنات مردہ ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ ''خدا مردہ ہو چکا ہے'' تو اس کا مطلب ہے کہ کائنات بھی مردہ ہو چکی ہے۔ گویا آپ مردہ کائنات میں رہتے ہیں۔ ایسے میں آپ گردو پیش سے کیسے تعلق رکھ سکتے ہیں؟ ہر شے حادثاتی ہوگی۔ آپ کو کچھ کرنا ہے مگر نامیاتی اتحاد ہی موجود نہیں ہے۔ آپ اکیلے زندہ ہیں اور آپ کو تمام بوجھ خود اٹھانا ہے۔ اس کی مثال اس چھوٹے بچے کی ہے جس نے جنگل میں اپنے والد کا ہاتھ تھام رکھا ہو اور کسی طرح اس سے بچھڑ کر درختوں میں گم ہو جائے۔ ایسے میں وہ روئے اور چلائے گا جبکہ کوئی اس پر دھیان نہیں دے گا۔

انسان کی حالت یہی ہے۔ وہ اپنے باپ کا ہاتھ تھامے چھوٹا سا بچہ ہے اور جنگل میں باپ سے بچھڑ گیا ہے۔ جب اس نے اپنا ہاتھ باپ کے ہاتھ میں دے رکھا تھا تو بادشاہوں کی طرح چلتا تھا، اسے کوئی خوف نہ تھا۔ خوف کا وجود ہی نہ تھا کیونکہ باپ موجود تھا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی۔ بچہ خود کسی شے کا ذمہ دار نہ تھا۔ اس کی ہر ضرورت باپ کے ذریعے پوری ہوتی تھی۔ اسے کسی شے کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا پڑتا تھا۔ وہ چلتا پھرتا، تتلیوں اور پھولوں کو دیکھتا، آسمان کو تکتا اور ہر شے سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ زندگی پر مسرت تھی۔ اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا ہاتھ باپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس نے باپ کو کھو دیا ہے۔ اب تتلیاں ہیں نہ پھول، ہر شے پتھریلی، مردہ، اجنبی اور خطرناک دکھائی دینے لگی ہے۔ اب اسے ہر درخت کے سائے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اسے موت سے ڈر لگتا ہے۔ موت ہر کونے سے حملہ آور ہوگی، اس پر جھپٹے گی اور اسے ہلاک کر دے گی۔

محض ایک لمحہ قبل ہر شے زندہ تھی اور دوستانہ معلوم ہوتی تھی۔ بچے اور تمام کائنات کے مابین ایک ہم آہنگی موجود تھی۔ کیوں؟ کیونکہ باپ کا ہاتھ جو موجود تھا۔ باپ کے ذریعے کائنات دوستانہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ تعلق تھا۔ باپ غائب ہوا تو تعلق بھی ختم ہو گیا۔ اب بچہ رو رہا ہے اور گہرے اندیشے و اذیت میں مبتلا ہے۔ دور جدید کے آدمی کی یہی حالت ہے کیونکہ آپ کائنات کو باپ اور ماں کے طور پر دیکھنے کے اہل نہیں رہے۔ ایسے میں اگر ہر شخص اعصابی مریض بن جائے تو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بچہ بھی مریض بن جائے گا اور پاگل ہو جائے گا۔ اس کے سینے کا زخم اسے ہر وقت رونے چلانے پر مجبور کرتا رہے گا۔ یہ زخم ہر رشتے کو درہم برہم کر دے گا۔ اب وہ کہیں بھی پرسکون انداز میں نہیں رہ پائے گا۔

اپنے ہاتھ کو دیکھیں۔ کیا آپ اس میں کائناتی ہاتھ محسوس نہیں کر سکتے؟ اگر نہیں تو آپ مشکل میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مسیح یہی کہتے ہیں کہ ''خدا باپ ہے، یہ تمام کائنات آپ کا خیال رکھتی ہے'' اگر ایسا نہیں ہے تو آپ یہاں کیوں موجود ہیں؟ آپ کو زندہ کیوں رہنے دیا جا رہا ہے؟ ساری کائنات کو آپ کی فکر ہے۔ یہ آپ کی پرورش کر کے آپ کو شعور کے درجے تک لے آئی ہے اور اب یہ آپ کو حتمی اونچائی اور آگاہی کے آخری مرحلے تک لے جانا چاہتی ہے۔ یہ ہر انداز میں آپ کی مدد کرے گی۔ حتیٰ کہ آپ گمراہ ہو جائیں تو اس صورت میں بھی یہ آپ کے پیچھے پیچھے آئے گی۔ جونہی آپ اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ محسوس کرتے ہیں تو اچانک سارا منظر بدل جاتا ہے۔

مسیح کہتے ہیں کہ ''ہر شخص بیٹا ہے'' صرف مسیح ہی خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ تاہم اگر ہر شخص خدا کا بیٹا بن جائے تو عیسائیت قائم نہیں رہ سکتی۔ ایسے میں مسیح منفرد نہیں رہیں گے۔ یہ غلط رویہ ہے۔ ہر شخص بیٹا ہے اور مسیح بھی منفرد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پا چکے ہیں جبکہ آپ کی تلاش تا حال جاری ہے۔

انفرادیت زندگی کی فطرت نہیں ہے۔ انفرادیت شناخت کی فطرت میں ہوتی ہے۔ مسیح یہ بات جانتے ہیں جبکہ آپ نہیں جانتے۔ ہندومت میں کہا گیا ہے کہ باعلم اور بے علم کے مابین فرق صرف علم ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سو رہا ہو اور آپ جاگ رہے ہوں۔ دونوں کا وجود ایک سا ہے مگر سونے والا خواب دیکھتا ہے جبکہ آپ جاگ رہے ہیں اور خواب نہیں دیکھتے۔ اگر آپ اسے ہلائیں اور اٹھائیں تو وہ بھی آپ کی طرح بیدار ہو جائے گا۔ اب اس کے خواب ختم ہو جائیں

گے۔ صرف ہلانے اور جھنجھوڑنے کی دیر ہے۔ مسیحؑ جاگ رہے ہیں اور آپ گہری نیند میں ہیں۔ دونوں میں یہی فرق ہے۔ مسیحؑ بیدار ہونے کی وجہ سے منفرد ہیں وگرنہ جسمانی اعتبار سے ان کے اور ہمارے مابین کوئی فرق نہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ''آپ زندہ باپ کے بیٹے ہیں''

دوسری تاکید ''زندہ باپ'' پر ہے کیونکہ عام باپ نے مرجانا ہے۔ باپ کا جسمانی حصہ مر جائے گا۔ حیاتیاتی حصہ فنا ہوجائے گا مگر کائناتی حصہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور یہی اصل بات ہے۔ یہ کبھی نہیں مرتا۔ یہ ابدی ہے۔

چند عشرے قبل نطشے نے کہا تھا ''خدا مر گیا ہے'' ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ کائنات مر نہیں سکتی اور خدا کسی فرد کا نام نہیں۔ اگر وہ کوئی مادی وجود رکھتا ہے تو مر سکتا ہے کہ مادی شے نے فنا ہی ہونا ہے۔ خدا شکل وصورت نہیں رکھتا کہ شکل وصورت کو ختم ہوجانا ہے۔ خدا کا جسم بھی نہیں ہے کیونکہ جسم فنا پذیر ہے۔ خدا سب کچھ ہے۔ ہم خدا میں ہی پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ ہم شکل اختیار کرتے ہیں اور شکل غائب ہوجاتی ہے مگر کُل قائم رہتا ہے۔ یہ کبھی نہیں مرتا۔ یہ ابدی ہوتا ہے۔ یہ بذاتِ خود زندگی ہے۔ لہٰذا آپ مردہ کائنات میں زندگی بسر نہیں کر رہے بلکہ یہ ایک زندہ خدا، باپ اور ماں ہے۔ یہ تعلق گہرا اور نامیاتی ہے۔ آپ کا خیال رکھا جا رہا ہے اور کوئی آپ کو مسلسل دیکھ رہا ہے۔

یہ احساس آپ کو بنیاد مہیا کرتا ہے۔ ایسے میں آپ خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتے، آپ باہر سے آنیوالے نہیں بلکہ اندر رہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔

''تاہم اگر آپ خود کو نہیں جانتے تو غربت میں رہتے ہیں''

یہ واحد غربت ہے۔ اپنے آپ سے لاعلمی کے سوا کوئی غربت نہیں۔ ہوسکتا ہے آپ امیر نہ ہوں، ممکن ہے آپ کے پاس اونچے محلات نہ ہوں، ممکن ہے آپ کے پاس دولت نہ ہو۔ مگر یہ حقیقی امارت نہیں ہوتی۔ صرف ایک شے ہی حقیقی دولت ہوتی ہے کیونکہ اسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دولت اپنی ذات کا علم ہے۔

مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''اگر آپ خود سے واقف نہیں ہوتے تو غربت میں رہتے ہیں''

آپ غریب ہیں۔ صرف ایک غربت کا وجود ہی ممکن ہے اور وہ غربت خود کو نہ پہچاننا ہے۔ یہ غربت کیوں کہلاتی ہے؟ کیونکہ آپ بادشاہ ہیں اور زندہ خدا کے بیٹے ہیں۔ آپ اس قدر شان د

شوکت کے مالک ہیں اور اس سے آگاہ بھی نہیں ہیں۔ الٹا آپ بھیک مانگنے نکلے ہیں۔ تمام خواہشات کی مثال بھیک جیسی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''اگر خواہشات گھوڑے ہوتیں تو بھکاری ان پر سوار ہوتے'' تمام خواہشات گھوڑے ہیں اور ان کے سوار بھکاری ہیں۔ آپ تمام خواہشات کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اپنے گھوڑوں کو دیکھئے۔ یہ آپ کی خواہشات ہیں۔ بھیک اور مطالبات ہیں۔ تمام باتیں آپ میں بدرجہءاتم موجود ہیں۔ آپ ان کے اندر کبھی نہیں جھانکتے۔ اگر آپ غور کریں تو امارت کی حقیقت آپ پر عیاں ہوجائے گی۔

خواہشات لامختتم اور ابدی ہوتی ہیں۔ آپ ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ جب آپ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو تمام کائنات آپ کی بادشاہت کو پہچان لیتی ہے اور جان جاتی ہے کہ آپ کون ہیں۔ آپ کُل کے بیٹے ہیں۔ ایسے میں آپ کا بھیک مانگنا ختم ہوجاتا ہے اور آپ پہلی مرتبہ حقیقی مفہوم میں امیر ہوجاتے ہیں۔

''اگر آپ خود کو نہیں پہچانتے تو غربت میں رہتے ہیں اور غربت بن جاتے ہیں''

میں نے ایک کہانی سن رکھی ہے۔ ایک عظیم بادشاہ اپنے بیٹے سے بے حد خفا رہتا تھا۔ اسے بیٹے کے انداز واطوار اور طرزِ زندگی بالکل پسند نہ تھا۔ بادشاہ کا ایک ہی بیٹا تھا اور اس کے علاوہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بیٹے نے باپ کو اس قدر پریشان کیا کہ باپ نے مجبوراً اسے عاق کر کے محل سے نکال دیا۔ چونکہ وہ بہت بڑے بادشاہ کا بیٹا تھا اس لیے اس کے ہاتھ میں کسی قسم کا کوئی ہنر نہ تھا۔ شہزادوں کو روزمرہ زندگی کے کاموں سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ وہ کوئی کام کرنا نہیں جانتا تھا۔ جب وہ شاہی محل میں رہتا تھا تو ہر شے خود بخود اور کہے بنا مہیا ہوجاتی تھی جبکہ اب اسے پوچھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اسے روزی کمانے کا کوئی طریقہ نہیں آتا تھا، تاہم شہزادے کو موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ صرف یہی کام کرسکتا تھا اور اس نے بطور مشغلہ یہ کام سیکھا تھا۔ قصہ مختصر اسے صرف ستار بجانا آتا تھا۔

چنانچہ شہزادے نے بھیک مانگنا شروع کردی۔ وہ ستار بجاتا اور لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔ اگر بادشاہ اپنی بادشاہت کھودیں تو وہ بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔ یہ خوبصورت بات ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ اندر سے بھکاری ہوتے ہیں۔ بادشاہت کی بنا پر آپ ان کا اصل چہرہ نہیں دیکھ پاتے۔ جونہی بادشاہت رخصت ہوتی ہے تو وہ بھکاری بن جاتے ہیں۔ وہ اس

کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ شہزادہ دس سال تک مسلسل بھیک مانگتا رہا۔ وہ یہ بات بالکل ہی بھول گیا کہ وہ کسی عظیم بادشاہ کا بیٹا ہے۔ دس سال بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اتنے لمبے عرصے تک کوئی بات یاد رکھنا بیحد مشکل ہوتا ہے۔ مزید براں اگر آپ ہر روز صبح سے شام تک بھیک مانگیں تو آپ کو کیسے یاد رہے گا کہ آپ ایک عظیم بادشاہ کے فرزند ہیں۔

شہزادہ خود کو مکمل طور سے بھول گیا۔ وہ بھکاری بن گیا۔ حتیٰ کہ ماضی کی یادیں بھی باقی نہ رہیں۔ یہ یادیں بہت بری ہوتی ہیں۔ یہ ڈراؤنے خواب کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ ذہن میں بے حد تکلیف کا موجب بنتی ہیں اس لیے آپ انہیں بھلانا چاہتے ہیں۔ یادیں انسانی ذہن میں موازنے کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ ''میں عظیم بادشاہ کا بیٹا ہوں اور بھیک مانگ رہا ہوں'' ایسے میں بھیک مانگنا بیحد تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ خیال ہی چھوڑ دیا۔ وہ بھول گیا اور بھیک مانگنے سے آشنا ہو گیا۔

دس برس کے بعد باپ کو بیٹے کی یاد ستانے لگی۔ باپ کا فیصلہ مکمل طور سے ٹھیک نہ تھا۔ اگرچہ بیٹے کے طور طریقے مختلف تھے مگر وہ اس کا واحد بیٹا تھا۔ اب باپ بوڑھا ہو چکا تھا اور کسی بھی وقت مر سکتا تھا۔ بیٹا اس کے تخت و تاج کا واحد وارث تھا اور اسے وہیں بلایا جانا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے وزیر کو بیٹے کی تلاش میں بھیج دیا۔

وزیر شہزادے تک پہنچ گیا۔ اگرچہ شہزادہ یہ بات مکمل طور سے بھول چکا تھا کہ وہ ایک بڑے بادشاہ کا بیٹا ہے اور بھیک مانگنے سے مکمل طور پر آشنا ہو چکا تھا مگر اس میں شہزادوں والی کوئی نہ کوئی بات ضرور باقی تھی۔ اس کا تعلق یادداشت سے نہیں بلکہ آپ کے وجود سے ہوتا ہے۔ اس کے چلنے اور بھیک مانگنے کے انداز میں بھی شہزادوں اور بادشاہوں جیسا وقار پایا جاتا تھا۔ وہ کچھ اس طرح سے بھیک مانگتا تھا جیسے بھیک دینے والے پر احسان کر رہا ہو۔ وہ دوسروں کو اس طرح دیکھتا تھا جیسے اس نے بھیک مانگ کر ان پر کوئی مہربانی کی ہو۔ اس کے چلنے کا انداز بھی بادشاہوں جیسا تھا۔ اگرچہ اس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے مگر یہ وہی لباس تھا جس میں اس نے محل چھوڑا تھا۔ اگرچہ وہ بظاہر گندا تھا مگر اس کے گرد آلود چہرے کو غور سے دیکھنے پر اس میں خوبصورتی کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ بھکاری ہو کر بھی اس کی آنکھوں میں انا تھی اور ان میں وہی فخر موجود تھا جو شہزادوں کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ ذہنی اور شعوری طور پر وہ اپنا ماضی بھول چکا تھا مگر غیر شعوری طور پر وہ تا حال

بادشاہ تھا۔ وہ عظیم سلطنت کا وارث تھا۔ وزیر نے اسے پہچان لیا۔ جس لمحے اس نے اسے پہچانا اس وقت وہ بھیک مانگنے میں مصروف تھا۔ ایک درخت تلے چند لوگ تاش کھیل رہے تھے اور وہ انکے قریب بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ گرمیوں کی سہ پہر تھی۔ موسم بیحد گرم تھا اور بھکاری شہزادے کے پاؤں میں جوتے بھی نہ تھے۔ اسے شدید پسینہ آ رہا تھا اور وہ چند پیسوں کیلئے بھیک مانگنے میں مصروف تھا۔ وہ کہہ رہا تھا'' مجھے کچھ دے دو، میں دو دن سے بھوکا ہوں'' وزیر نے اسے پہچان کر اپنا رتھ روک لیا۔ وزیر نیچے اترا اور بھکاری شہزادے کے پاس جا کر اس کے پاؤں چھو لیے۔ شہزادہ بیحد حیران ہوا اور بولا'' کیا معاملہ ہے؟''

وزیر نے اسے بتایا کہ'' تمہارے باپ یعنی شہنشاہ نے تمہیں واپس بلایا ہے، وہ تمہیں معاف کر چکا ہے'' ایک ہی ثانیے میں'' بھکاری'' غائب ہو گیا۔ کچھ بھی نہ کرنا پڑا۔ شہزادے کو ایک ہی لمحے میں اپنی اصلیت کا ادراک ہو گیا۔ اس نے سوچا'' باپ نے مجھے بلایا ہے، مجھے معاف کر دیا ہے'' یہ خیال آتے ہی اس کے اندر کا بھکاری غائب ہو گیا۔ اس کا لباس وہی تھا، جسم بھی گندا اور میلا تھا، مگر سب کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ اب ہر طرف شان و شوکت اور روشنی تھی۔

اس نے وزیر کو حکم دیا کہ'' بازار جا کر میرے لیے کپڑے اور جوتے لاؤ اور غسل کا اہتمام کرو'' بھیک مانگنے کا عمل خود بخود ختم ہو گیا تھا۔ وہ رتھ میں بیٹھا اور حکم دیا کہ'' مجھے شہر کے بہترین ہوٹل میں لے جاؤ'' وزیر رتھ کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہا تھا۔

یہ صوفیانہ کہانی ہے۔ آپ کی حالت بھکاری شہزادے جیسی ہے۔ جب آپ اپنے'' باپ'' کو پہچان لیتے ہیں تو بھیک مانگنے کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ہی لمحے میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا کیونکہ آپ اندر سے پہلے جیسے ہی ہوتے ہیں۔ صرف شناخت میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے میں آپ صرف ذہن کے سطحی حصے میں کچھ اور بن گئے ہوتے ہیں، اندر سے آپ خدا کے بیٹے ہی ہوتے ہیں۔ تاہم یہ سب کچھ اسی صورت میں ہی ہو گا جب آپ اپنی حقیقت سے واقف ہو جائیں گے۔ ایسے میں تمام کائنات آپ کو پہچان لے گی۔ مسیح کہتے ہیں کہ

''اگر آپ اپنی ذات کو نہیں پہچانتے تو غربت میں رہتے ہیں اور خود غربت بن جاتے ہیں''

☆☆☆

مسیحؑ نے کہا

''تکلیف جھیلنے والا بابرکت ہے، اس نے زندگی پالی ہے''

مسیحؑ نے کہا

''جب تک زندہ ہو زندہ کو دیکھو، مبادا کہ تم مرجاؤ اور اسے دیکھنے کی کوشش کرو مگر دیکھ نہ پاؤ''

انہوں نے ایک سامری کو دیکھا جو میمنا اٹھائے جودیہ کی طرف جا رہا تھا

مسیحؑ نے اپنے حواریوں سے کہا

''یہ شخص اپنے ساتھ میمنے کو کیوں لیے پھرتا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا

''اس لیے کہ وہ اسے ذبح کر کے کھا سکے''

مسیحؑ نے انہیں کہا

''جب تک میمنا زندہ ہے اس وقت تک وہ اسے نہیں کھا سکتا۔ وہ اسے صرف اسی صورت میں کھا سکتا ہے جب وہ مر کر لاش میں تبدیل ہو جائے گا''

حواری بولے

''بصورت دیگر وہ اسے نہیں کھا پائے گا''

مسیحؑ نے حواریوں سے کہا

''تم خود محفوظ جگہ ڈھونڈتے ہو مبادا کہ لاش بن جاؤ اور کھا لیے جاؤ''

مسیحؑ نے کہا

''بستر پر دو آدمی ہوں گے، ایک مر جائے گا اور دوسرا زندہ رہے گا''

ساتواں باب

جلد اور آہستہ

زمانہء قدیم سے ہی انسان بارہا یہ سوال کرتا چلا آیا ہے کہ ''زندگی مصائب سے عبارت کیوں ہے؟'' اگر خدا ''باپ'' ہے تو اس قدر مصیبتیں اور تکالیف کیوں ہیں؟ اگر خدا پیار اور رحم دلی کا نام ہے تو خدائی اس قدر تکالیف کیوں برداشت کرتی ہے؟ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مصائب جھیلتا ہے کیونکہ پختہ ہونے اور بڑھوتری کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ انسان تکالیف سہتا ہے کہ اس ذریعے سے وہ مزید آگاہ ہو سکتا ہے۔ آگاہی ہی کلید ہے۔

اپنی زندگی کا مشاہدہ کریں۔ جب بھی آپ مطمئن، پرسکون اور خوش ہوتے ہیں تو آگاہی غائب ہو جاتی ہے۔ ایسے میں آپ ایک طرح سے نیند کی حالت میں ہوتے ہیں۔ آپ کٹھ پتلی کی طرح تنویمی انداز میں جیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کچھ یوں ہوتی ہے جیسے نیند میں چل رہے ہوں، آپ اپنے تمام امور انجام دیتے ہیں مگر یہ سب کچھ خواب خرامی سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کو کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی تو مذہب آپ کی زندگی سے غائب ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آپ عبادت گاہ کا رخ نہیں کرتے۔ آپ کے لیے اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ آپ خدا سے دعا بھی نہیں مانگتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

جب بھی آپ کو کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو آپ معبد کی طرف بھاگتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں خدا کو تلاش کرتی ہیں اور آپ کا دل عبادت کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ مصیبت میں کوئی ایسی شے پوشیدہ ہوتی ہے جو آپ کو اپنے حوالے سے مزید آگاہ بنا دیتی ہے۔ مصیبت کے وقت آپ کی آگاہی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

دنیا میں کوئی شے بے معنی نہیں ہوسکتی۔ یہ کائنات ہے، افراتفری نہیں۔ ہوسکتا ہے آپ اسے سمجھنے کے قابل نہ ہوں۔ یہ الگ بات ہے مگر آپ صرف اجزاء سے واقف ہیں۔ آپ کُل سے آگاہ نہیں ہیں۔ زندگی کے بارے میں آپ کا تجربہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کو کسی ناول سے پھاڑ یا گیا ایک ورق پڑھنے کو دے دیا جائے۔ آپ اسے ھتے ہیں مگر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے کیونکہ یہ پورے ناول کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ آپ کو پوری کہانی کا علم ہی نہیں۔ جب آپ پوری کہانی سے واقف ہوجاتے ہیں تب صفحے کی تحریر سمجھ میں آجاتی ہے۔ اب یہ مربوط اور بامعنی دکھائی دیتا ہے۔

مفہوم کیا ہے؟ مفہوم کا مطلب جزو کے کُل سے تعلق کی بابت آگاہی ہے۔ مفہوم یا مطلب جزو اور کُل کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ سڑک پر چلتے پاگل کی گفتگو بے معنی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آپ اس کی گفتگو کا سرا کسی شے سے نہیں جوڑ سکتے۔ اس کی گفتگو صرف ایک حصہ ہے۔ وہ کسی سے گفتگو نہیں کررہا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں۔ گفتگو کرنے کے لیے کوئی موجود نہیں ہے۔ اس کی بات بے ترتیب اور ٹکڑوں میں بٹی ہے۔ یہ کسی بڑے کُل کا جزو نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اسے بے ربط پائیں گے۔ کوئی اور شخص بھی اس پاگل جیسے الفاظ استعمال کرسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے دونوں کے الفاظ میں کوئی فرق نہ ہو مگر دوسرا شخص کسی نہ کسی سے محو گفتگو ہے۔ ایسے میں یہی الفاظ بامعنی ہوجاتے ہیں۔ کیوں؟ الفاظ ایک جیسے ہیں، فقرے بھی ایک جیسے ہیں، تاثرات یکساں ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ ایک شخص پاگل اور دوسرا ہوشمند ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہوشمند کی بات سننے والا موجود ہے۔ اس کی بات چیت محض ایک حصہ نہیں رہی بلکہ یہ کُل کا جزو بن گئی ہے۔ یہ بامعنی ہوگئی ہے۔

پکاسو کی تصویر کا ایک حصہ کاٹ دیں۔ یہ بے معنی ہوجائے گا۔ یہ محض ایک حصہ ہے۔ یہ حصہ مردہ ہوچکا ہے۔ اسے دوبارہ تصویر میں لگا دیں۔ یہ اچانک ایک مرتبہ پھر بامعنی ہوجائے گا۔ یہ مربوط ہوگیا ہے کیونکہ اب یہ کُل کا جزو بن چکا ہے۔ جب آپ کُل میں شامل ہوتے ہیں تبھی بامعنی ہوسکتے ہیں۔ اگر آج کا آدمی خود کو مسلسل بے معنی محسوس کیے جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو بھلا دیا گیا ہے یا اس سے انکار کیا گیا ہے۔ خدا کے بغیر انسان بامعنی نہیں ہوسکتا کیونکہ خدا کا مطلب کُل ہے اور انسان محض ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے؟ آپ نظم کا صرف ایک مصرعہ ہیں۔ اکیلا مصرعہ مہمل ہوتا ہے۔ مکمل شاعری کے ساتھ اہمیت ابھر آتی ہے کیونکہ کُل کے ساتھ تعلق میں ہی

اہمیت ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں۔ مجھے یہاں برٹرینڈ رسل کا واقعہ یاد آرہا ہے۔ وہ لادین تھا، اس نے کبھی خدا پر اعتقاد نہیں رکھا۔ وہ کبھی کُل کے ادراک میں مدد دینے والے وسیع مفہوم سے آشنا نہ ہوسکا۔ وہ ایک خواب بیان کرتا ہے۔ اس نے نیند میں کسی کو دروازہ کھٹکھٹاتے سنا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہاں قدیم خدا کو کھڑا پایا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کیونکہ اس نے کبھی خدا پر اعتقاد نہیں رکھا تھا۔ اسے تو اپنے خواب میں بھی یاد رہتا تھا کہ ''میں خدا پر یقین نہیں رکھتا'' بوڑھا خدا یکا و تنہا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے، چہرہ گرد آلود تھا اور جسم بھی میلا کچیلا تھا۔ وہ اس قدر گیا گزرا لگتا تھا جیسے کوئی بوسیدہ تصویر ہو۔ آپ ایسی تصویر کو واضح طور سے نہیں دیکھ سکتے۔ اسے خدا پر بیحد ترس آیا۔ اس نے خدا کو خوش کرنے کیلئے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ رسل نے خدا کی پشت پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارا اور بولا ''اندر آجاؤ'' اچانک وہ بیدار ہوگیا اور خواب ختم ہوگیا۔

دور حاضر کے انسان کی یہی حالت ہے۔ جدید دماغ اسی انداز میں سوچتا ہے۔ خدا بیکار ہوگیا ہے۔ آپ اس کے خلاف ہوتے ہیں یا اس پر رحم کھاتے ہیں۔ رحم کھانے کا مقصد اسے خوش کرنا اور اس کا دل بہلانا ہوتا ہے وگرنہ یہ آپ کے لیے بامعنی شے نہیں رہا۔ یہ محض بدرنگ اور بوسیدہ تصویر ہے اور اس کی اہمیت ماضی کے کاٹھ کباڑ سے زیادہ نہیں رہی۔ یہ مردہ ہے یا اس کی حالت اس قدر خراب ہے کہ کسی بھی وقت اسے موت آسکتی ہے۔ تاہم اگر کُل ختم ہوجائے یا قریب المرگ ہو تو جزو کیسے زندہ اور بامعنی ہوسکتا ہے؟ اگر کُل پرانا ہوچکا ہے تو جزو کیسے نیا اور تازہ ہوسکتا ہے؟ اگر سارا درخت مردہ ہوچکا ہے تو اس کا کوئی پتہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسے میں اگر پتہ یہ سمجھے کہ وہ زندہ ہے تو یہ بہت بڑی حماقت ہوگی۔ ہوسکتا ہے پتے کو مرنے میں کچھ مزید وقت درکار ہو تاہم اگر درخت مردہ ہے تو پتے نے بھی مردہ ہونا ہے۔ اس کی موت کا آغاز ہوچکا ہے۔

اگر خدا مردہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسان بری طرح بیمار ہے کیونکہ کُل کے بغیر جزو کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ جب بھی آپ خوش ہوتے ہیں تو یہ خوشی کی محض جھلک ہوتی ہے۔ یہ حقیقی خوشی نہیں ہوتی۔ جب آپ مطمئن اور پرسکون ہوں اور کوئی شے آپ کو پریشان نہ کرے تبھی آپ خود کو ''کُل'' محسوس کرتے ہیں۔ یہ مغالطہ آمیز ہے۔ جب آپ کو مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو اچانک آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ ''کُل'' نہیں ہیں۔ اس لمحے آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ

ویسے نہیں ہیں جیسے آپ کو ہونا چاہئے۔ کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہے۔ کچھ غلط ہے اور کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مصائب آپ کو آگہی دیتے ہیں۔ یہ آپ کو اس احساس سے مالا مال کرتے ہیں کہ آپ کو تغیر کی ضرورت ہے۔ آپ کو تیار ہونا ہے، آپ کو نیا جنم لینا ہے۔ آپ جس حالت میں ہیں اس میں مصیبت ہی آپ کا مقدر ہے اور کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے۔

مسیحؑ نے کہا ''مصیبت جھیلنے والا بابرکت ہوتا ہے، اس نے زندگی پالی ہے''

یہ بات بظاہر لغو اور مہمل دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ''مصائب جھیلنے والا بابرکت ہے.... ''ہم ہمیشہ اسی کو بابرکت اور خوش کہتے ہیں جس نے کبھی مصیبت نہ جھیلی ہو، تاہم کیا آپ نے کبھی ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے کبھی کوئی مصیبت نہ جھیلی ہو؟ اگر آپ نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا ہو تو اسے نابالغ، بچگانہ، ناپختہ اور کسی قسم کی گہرائی و آگاہی سے محروم پائیں گے۔ وہ نرا احمق ہوگا۔ آپ ایسے شخص کو خوش نہیں کہہ سکتے۔

صرف ایسا شخص ہی مصیبت سے بچا رہ سکتا ہے جس نے کبھی زندہ رہنے کی کوشش ہی نہ کی ہو اور جو زندگی کرنے سے اجتناب برتتا چلا آرہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امیر ترین خاندانوں میں احمق ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں بے پناہ حفاظت میں رکھا جاتا ہے۔ جب آپ کسی کا اس قدر تحفظ کرتے ہیں تو یہ موت کے خلاف تحفظ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ زندگی کے خلاف تحفظ بھی بن جاتا ہے۔ یہی مسئلہ ہے۔ جب آپ کسی کو موت کیخلاف محفوظ بناتے ہیں تو تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ آپ کو زندگی کیخلاف تحفظ کرنا پڑتا ہے کیونکہ زندگی موت کی جانب لے جاتی ہے۔ چنانچہ اگر آپ مرنے سے ڈرتے ہیں تو زندگی مت کریں۔ یہ سادہ سی منطق ہے۔ اگر آپ مرنے سے ڈرتے ہیں تو زندہ بھی نہ رہیں۔ وگرنہ زندگی سے ہر قسم کا ناطہ توڑ لیں۔ اس طرح آپ زندگی نہیں کرتے بلکہ ایک جگہ پڑے سڑتے رہتے ہیں۔

مسیحؑ نے راہبانہ زندگی اور کام کاج نہ کرنے کو بابرکت زندگی نہیں کہا۔ کوئی شخص قوت و حرکت سے محروم زندگی کو بابرکت زندگی نہیں کہہ سکتا۔ یہ انسان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کیونکہ وہ کبھی آگاہی اور پختگی میں نشو ونما نہیں پائے گا۔ اس کا شعور اعلیٰ درجات تک رسائی نہیں پا سکے گا کہ یہ اعلیٰ درجات اسی وقت قابل رسائی ہوتے ہیں جب ان کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب آپ مصیبت جھیلتے ہیں تو گویا اعلیٰ درجے کی طرف بڑھتے ہیں۔ جب آپ کو کوئی مسئلہ درپیش

ہوتا ہے تو گویا یہ آپ کی ترقی کا زینہ بن جاتا ہے۔ آپ مسائل کا سامنا کر کے ہی پختہ ہو سکتے ہیں۔ آپ جس قدر غیر محفوظ ہوں گے اسی قدر آگے بڑھیں گے۔ اس طرح آپ جس قدر محفوظ ہوں گے اسی قدر کم نشو ونما پائیں گے۔ اگر آپ کے گرد ہر شے محفوظ و مامون ہو جائے تو گویا آپ پہلے ہی اپنی قبر میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے میں آپ زندہ نہیں ہوتے۔ زندگی خطرات میں پنہاں ہوتی ہے۔ زندگی کا راستہ گمشدگی سے نکلتا ہے۔ جو شخص گم ہو جائے یا راہ سے بھٹک جائے اس کی واپسی کا امکان بہر حال موجود ہوتا ہے مگر ناکام ہو جانے والا کامیابی نہیں پا سکتا۔

نپولین کو شکست ہو گئی۔ اس نے اپنے روزنامچے میں خوبصورت فقرہ لکھا کہ ''صرف ایک لڑائی ہاری گئی ہے، جنگ نہیں ہاری گئی'' بعض اوقات پاگل بھی کس قدر خوبصورت باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اگر آپ جنگ جیتنے کے خواہشمند ہیں تو آپ کو کئی لڑائیاں ہارنا ہوں گی۔ اگر آپ ہارنے سے خوفزدہ ہیں تو کبھی جنگ میں داخل نہیں ہو پائیں گے۔ تب ایسا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

جب بھی آپ کو کسی کام میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ حتمی ناکامی نہیں ہوتی۔ آپ اس سے بلند ہو سکتے ہیں۔ آپ کو آئندہ اپنی سابقہ غلطیاں نہیں دہرانا چاہئیں۔ آپ کو آئندہ یہ غلطیاں نہیں کرنی اور کامیابی پانا ہے۔ عقلمند آدمی بھی بیوقوف کے برابر مصائب برداشت کرتا ہے تاہم وہ ہر مرتبہ مختلف انداز میں مصائب کا سامنا کرتا ہے۔ عقلمند آدمی بعض اوقات احمق سے زیادہ غلطیاں کرتا ہے مگر وہ کبھی ایک غلطی کو دوسری مرتبہ نہیں دہراتا۔ دونوں میں یہی واحد فرق ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے مقدار زیادہ ہو مگر معیار مختلف ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی احمق زیادہ غلطیاں نہ کرے، ممکن ہے وہ سرے سے کوئی غلطی ہی نہ کرے کیونکہ اسے تو کچھ کرنا ہی نہیں۔ آپ اسی وقت غلطی کرتے ہیں جب آپ کسی کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔

اگر آپ جستجو کرنے لگیں تو گمراہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی راہ پر چل کر ہی گمراہ ہوا جاتا ہے۔ گھر میں بیٹھا شخص کیسے گمراہ ہو سکتا ہے؟ اگر آپ کوئی کام نہیں کریں گے تو کبھی غلطی نہیں کریں گے۔ آپ غلطیوں سے مبرا تو ہو سکتے ہیں مگر آگے بھی نہیں بڑھ سکتے۔ یوں آہستہ آہستہ آپ گل سڑ کر ضائع ہو جائیں گے اور آپ کو موت آلے گی۔ غلطیاں کرنے سے خوفزدہ مت ہوں۔ صرف یہی بات یاد رکھیں کہ غلطی دہرانے کی کوئی ضرودت نہیں۔ آپ ایک غلطی دوسری مرتبہ کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ جب آپ نے پہلی مرتبہ یہ غلطی کی تھی تو آپ نے اس سے کچھ نہ سیکھا۔ یہی وجہ

ہے کہ آپ سے بار بار ایک ہی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ لوگ عمر بھر ایک ہی غلطی کیے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ ایک ہی دائرے میں سفر کرتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندومت میں دنیا کو سنسار کہا جاتا ہے۔ سنسار کا مطلب پہیہ ہے۔ آپ بار بار ایک ہی غلطی دہرائے چلے جاتے ہیں۔ حالات مختلف ہو سکتے ہیں مگر غلطیاں ایک سی رہتی ہیں۔ اس سے کیا بات ظاہر ہوتی ہے؟ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مستعد نہیں ہیں ورنہ ایک ہی غلطی دوسری مرتبہ کیوں ہوگی؟ دوسری غلطی کریں، اسی صورت میں آپ سیکھ پائیں گے۔ کوئی شخص غلطیوں کے بغیر نہیں سیکھتا۔ جب بھی آپ غلطی کرتے ہیں تو آپ کو مصیبت جھیلنا پڑتی ہے۔ کوئی شخص مصیبتوں کے بغیر نہیں سیکھتا۔ ہندو کہتے ہیں کہ آپ کو اس لیے بار بار پیدا ہونا پڑتا ہے کہ آپ بڑے ہی نہیں ہوئے ہوتے۔

صرف پختہ آدمی ہی اس دنیا کی حدود کو پار کر سکتا ہے۔ جو بڑے نہیں ہو پاتے انہیں دوبارہ گڑھے میں گرنا ہے، انہیں سیکھنا ہے۔ سیکھنا مشکل ہوتا ہے کہ اس میں کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔ مشکل راستہ مصیبتوں کا راستہ ہے۔ خود کو مصائب کے خلاف محفوظ مت بنائیں۔ اس کے برعکس مصیبتوں کا سامنا کریں اور جس قدر ہو سکے آگاہ ہو جائیں۔ چیلنج قبول کریں اور ان کا سامنا کریں۔ اس کے ذریعے آپ بڑے ہوں گے۔ اس سے آگے جانے کی کوشش کریں۔ خوفزدہ مت ہوں۔ جب آپ خوفزدہ ہو جائیں گے تو گویا مرنے لگیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحؑ کہتے ہیں کہ ''مصیبت کا سامنا کرنے والا بابرکت ہوتا ہے، اس نے زندگی پالی ہے'' جو مصائب جھیلتا ہے وہ مزید مستعد ہو جاتا ہے اور مستعدی ہی زندگی کے مندر کی کنجی ہے۔ جو شخص جس قدر مستعد ہوگا وہ اسی قدر آگاہ ہوگا۔

آپ اور درختوں میں کیا فرق ہے؟ درخت خوبصورت ہوتے ہیں مگر وہ آپ سے زیادہ بلند نہیں ہوتے کیونکہ ان میں شعور نہیں ہوتا۔ پتھروں کا درجہ درختوں سے بھی کم ہے اور وہ درختوں سے بھی زیادہ بے شعور ہوتے ہیں۔ پتھر بھی مصائب کا سامنا کرتا ہے مگر وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہوتا۔ درخت بھی مصیبت جھیلتا ہے مگر وہ شعوری طور پر ایسا نہیں کرتا۔ آپ کو بھی مصیبت کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسے میں آپ درخت و پتھر کے مابین کیا فرق ہوا؟ ایسے میں آپ کو چلتا پھرتا درخت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

آپ کو جو شے انسان بناتی ہے وہ تا حال وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ شعور ہی آپ کو انسان بناتا

ہے۔ یہی حسن ہے۔ جب بھی آپ باشعور ہوتے ہیں تو مصائب ختم ہو جاتے ہیں۔ مصائب شعوری حالت میں آتے ہیں تاہم اگر آپ شعوری حالت میں زیادہ سے زیادہ عمل کریں تو آپ اپنے سر سے آگاہ ہو جائیں گے۔ بصورت دیگر کوئی شخص سر سے آگاہ نہیں ہوتا۔ جب کچھ غلط ہو جاتا ہے تو آپ صرف جسم سے آگاہ ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں مصیبت کیلئے خوبصورت لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ ''ویدانا'' ہے اور اس کے دو معنی ہیں۔ پہلا مطلب ''مصیبت'' اور دوسرا ''علم'' ہے۔ ویدانا کا ماخذ ''ویدا'' ہے۔ ویدا کا مطلب ''علم کا منبع'' ہے۔ جن لوگوں نے یہ لفظ تخلیق کیا وہ اس امر سے آگاہ تھے کہ علم کی بنیاد مصیبت ہے۔ اس لیے انہوں نے دونوں کیلئے ایک ہی لفظ رکھا ہے۔

جب آپ کے سر پر مصیبت پڑتی ہے تو آپ آگاہ ہو جاتے ہیں۔ پیٹ درد کی صورت میں پیٹ ہی کا خیال آتا ہے۔ اس سے پہلے بھی پیٹ موجود ہوتا ہے مگر آپ نے کبھی اس پر دھیان نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ طبی سائنس خصوصاً آیورویدک طریقہ علاج میں صحت مندی کو ''بے جسمی کی حالت'' قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ جسم سے آگاہ نہیں ہیں، اگر آپ کو جسم کا احساس نہیں ہے اور اس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تو آپ صحت مند ہیں۔ اگر آپ کو جسم کا احساس ہی نہیں اور اس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تو آپ صحت مند ہیں۔ اگر آپ کو جسم کا خیال ہے تو کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے کیونکہ آگاہی تبھی ملتی ہے جب کچھ غلط ہو جاتا ہے۔ فرض کریں آپ ڈرائیور ہیں، آپ کو گاڑی کے انجن میں کچھ عجیب سا شور سنائی دیتا ہے تو آواز سنتے ہی آپ آگاہ ہو جاتے ہیں۔ بصورت دیگر ہر شے پرسکون اور درست حالت میں تھی۔ گاڑی کے انجن یا کسی اور حصے میں معمولی سا شور سن کر آپ جان لیتے ہیں کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ جب خرابی پیدا ہوتی ہے تبھی آپ ہوشیار ہوتے ہیں۔

اگر آپ واقعتاً آگاہ ہو جائیں تو غلط چیز میں پھنسنے سے بچ سکتے ہیں۔ آپ کی آگہی مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ اب ایک دوسرا مظہر سامنے آتا ہے۔ آگہی کے ذریعے آپ کو یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ بیماری یا خرابی کس حصے میں ہے۔ مگر یہ بیماری یا خرابی آپ میں نہیں بلکہ آپ کے اردگرد ہے۔ یہ آپ کے محیط میں ہے۔ مرکز میں آگہی اور اس کے اردگرد مصیبت اور تکلیف ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے مصیبت یا بیماری کسی اور کو لاحق ہے۔ ایسے میں آپ کو درد ہو تو وہ جسم میں ہوگی، آپ

صرف آگاہ ہوں گے۔ ایسے میں جسم مفعول اور آپ مبتدا بن جاتے ہیں اور دونوں کے مابین فاصلہ موجود ہوتا ہے۔

- آگہی اور باخبری میں تمام پل ٹوٹ جاتے ہیں اور فاصلہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ جسم کو تکلیف ہوتی ہے مگر اس کا احساس نہیں ہوتا۔ مصیبت آگہی میں آتی ہے مگر یہ تکلیف نہیں رہتی کیونکہ آگہی تکلیف کا احساس مٹا دیتی ہے۔ یہی زندگی کی کنجی ہے۔

''مصیبت جھیلنے والا بابرکت ہے، اس نے زندگی پالی ہے''

صلیب پر کھنچے مسیحؑ آخری اور مطلق مصیبت کی علامت ہیں۔ یہ مصیبت کی انتہا ہے۔ جب مسیحؑ کو مصلوب کیا گیا تو اپنے آخری لمحے میں وہ قدرے کپکپائے۔ تکلیف بے حد شدید تھی۔ یہ تام تکلیف نہ تھی اور یہ عام جسمانی تکالیف سے مشابہ بھی نہ تھی۔ یہ جسمانی ہی نہیں بلکہ انتہائی گہری ذہنی اذیت تھی۔ اذیت یہ تھی کہ انہوں نے اچانک یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ''آیا خدا نے میری فکر چھوڑ دی ہے.....؟، میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے تو کچھ غلط نہیں کیا، مجھے مصلوب کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ تکلیف کیوں ہے؟ مجھے دار پر کیوں لٹکایا جا رہا ہے؟ مجھے اذیت کیوں دی جا رہی ہے؟'' انہوں نے خدا سے سوال کیا ''کیوں؟''

یقیناً یہ گہری اذیت کا لمحہ ہوتا ہے جب تمام بنیادیں ہل کر رہ جاتی ہیں اور آپ کا ایمان بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ تکلیف بے حد شدید تھی۔ وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتے رہے تھے، جن کے ساتھ انہوں نے کام کیا تھا، جن کے غموں پر انہوں نے مرہم رکھا تھا وہی ان کے دشمن بن گئے تھے اور ان کے قتل کے درپے تھے۔ جبکہ اس کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ انہوں نے خدا سے پوچھا ''کیوں؟'' میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' تبھی اچانک انہیں احساس ہوا کہ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ وہ بے حد آگاہ ہو گئے تھے۔ مصلوب کیے جانے کے وقت وہ مکمل طور سے آگاہ ہو گئے۔

میں ہمیشہ کہتا چلا آیا ہوں کہ اس لمحے سے قبل وہ عیسیٰ تھے اور بعد میں مسیحؑ ہو گئے۔ اس لمحے ان میں مکمل تبدیلی رونما ہو گئی۔ اس سے قبل وہ بے حد قریب تو آ چکے تھے مگر آخری چھلانگ باقی تھی۔ تب اچانک یہ تبدیلی رونما ہو گئی۔

جب وہ کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ تکالیف کیوں دی جا رہی ہیں؟'' تو کیا ہوتا ہے؟ ''کیا تم نے مجھے چھوڑ دیا؟ کیا میں اکیلا رہ گیا ہوں؟'' اس اذیت کے فوری بعد وہ کہتے ہیں ''نہیں، جیسا تم

چاہتے ہو ویسا ہی ہونا چاہئے'' انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ ''کیوں'' استرداد تھا، کیونکہ سوال کرنے کا مطلب شبہ ہے۔ وہ فوراً سمجھ گئے اور کہا ''مجھے یہ قبول ہے، میں سمجھ گیا ہوں، جیسا وہ چاہتا ہے ویسا ہی ہونا چاہئے نہ کہ جیسا میں چاہتا ہوں، کیونکہ میری خواہش غلط ہو گی'' تب وہ پر سکون ہو گئے اور انہوں نے خود کو خدا کی رضا پر چھوڑ دیا۔ بوقت موت انہوں نے موت کو بھی قبول کر لیا۔ اس قبولیت میں وہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہو گئے۔ کلید مل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہا ''جس نے مصیبت جھیلی وہ بابرکت ہے، اس نے زندگی کو پا لیا ہے''

جب بھی آپ کو مصیبت کا سامنا ہو تو دوسری مرتبہ شکایت مت کریں۔ اس سے اذیت تخلیق مت کریں۔ اس کے بجائے اسے دیکھیں، محسوس کریں اور اس کا تمام ممکنہ زاویوں سے مشاہدہ کریں۔ اسے دھیان کی کیفیت میں بدل لیں اور دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ جو توانائی بیماری اور مصیبت میں بدل رہی تھی وہ تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ تبدیلی نہایت معیاری ہوتی ہے۔ یہی توانائی آپ کی آگاہی بن جاتی ہے کیونکہ آپ میں دو توانائیاں نہیں ہیں۔ توانائی یا قوت ایک ہی ہے۔ آپ اسے جنسیت میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اسے عبادت بھی بنا سکتے ہیں۔ آپ اسے مزید بلندی پر لے جا کر آگاہی میں بھی بدل سکتے ہیں۔ تاہم قوت وہی ہو گی۔

آپ مصیبت جھیلتے ہیں اور قوت ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اذیت آپ کی طاقت کے ضیاع کا باعث بن رہی ہے۔ توانائی قطرہ قطرہ بہہ رہی ہے۔ جب بھی مصیبت کا سامنا ہو تو اپنے آپ کو زور سے جھنجھوڑیں، آنکھیں بند کر لیں اور مصیبت کو دیکھیں۔ یہ ذہنی ہو، جسمانی یا وجودی، اسے غور سے دیکھیں اور اسے مراقبے میں بدل لیں۔ اسے مفعول کے طور پر دیکھیں۔

جب آپ اپنی تکلیف کو اس انداز میں دیکھتے ہیں تو خود اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ آپ اس سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور آپ کو اس تکلیف کا احساس بھی نہیں ہو رہا۔ پل ٹوٹ چکا ہے۔ اب جو قوت تکلیف میں بدل رہی تھی وہ ایسا کرنا بند کر دے گی کیونکہ پل ہی موجود نہیں ہو گا۔ پل تکلیف کا احساس ہے۔ اگر آپ خود کو جسم تصور کریں گے تو قوت ایک مرتبہ پھر جسم میں سرایت کرنا شروع کر دے گی اور آپ تکلیف محسوس کرنے لگیں گے۔

ہو سکتا ہے آپ اس سے آگاہ نہ ہوں تاہم اس حوالے سے ایک چھوٹا سا تجربہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی عورت سے محبت ہے تو اس کے قریب بیٹھیں اور ایسا محسوس کریں جیسے آپ عورت

(محبوبہ) ہیں اسی طرح عورت کو یہ محسوس کرنے دیں جیسے وہ آپ (عاشق) ہیں۔ کچھ دیر اسی کیفیت میں رہیں۔ اچانک آپ کو طاقتور جھٹکا لگے گا۔ آپ دونوں کو محسوس ہوگا جیسے دونوں کے اندر سے قوت نکل کر ایک دوسرے میں جذب ہوگئی ہو۔ پیار کرنے والوں کو یہ بجلی کے جھٹکے کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ جب آپ کسی شے کے ساتھ ایک ہوجاتے ہیں تو ایک پل بن جاتا ہے اور اس پل کے ذریعے توانائی ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوسکتی ہے۔

جب ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو وہ صرف دودھ ہی نہیں پلا رہی ہوتی۔ اب ماہرین حیاتیات نے اس گہری حقیقت کو پالیا ہے کہ دراصل وہ بچے کو توانائی منتقل کر رہی ہوتی ہے۔ دودھ اس توانائی کا محض مادی حصہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے سائنسدانوں نے متعدد تجربات کیے ہیں۔
ایک بچے کی پرورش کی گئی، اسے خوراک اور ہر ممکن بہترین غذائی اجزاء دیے گئے نیز طبی سائنس کی رو سے ہر عمدہ شے کھانے پینے کو مہیا کی گئی۔ تاہم اس سے پیار کیا گیا نہ اسے گلے لگایا گیا۔ اس بچے کو ماں نے کبھی نہ چھوا بلکہ دودھ مشینوں کے ذریعے جسم میں منتقل کیا گیا جبکہ وٹامن کے انجکشن بھی لگائے گئے۔ بظاہر ہر شے مکمل تھی مگر بچے کی نشوونما رک گئی۔ اس نے یوں سکڑنا شروع کر دیا جیسے زندگی اس سے دور جا رہی ہو۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ اسے یہ سب کچھ ماں کی جانب سے نہیں مل رہا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی میں بھی ایسا ہی تجربہ کیا گیا۔ بہت سے لاولد بچے ایک ہسپتال میں لائے گئے۔ چند ہفتوں میں تقریباً تمام بچے قریب المرگ ہوگئے جن میں سے نصف جان سے گزر گئے حالانکہ انہیں ہر قسم کی بہترین خوراک اور نگہداشت میسر تھی۔ سائنسی اعتبار سے ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ مگر بچے مر کیوں گئے؟

ایسے میں ایک ماہر نفسیات نے مشاہدہ کیا کہ ان بچوں کو سینے سے چمٹانے اور انہیں گلے لگا کر ان پر ان کی اہمیت واضح کرنے کی ضرورت پوری نہیں کی گئی تھی۔ خوراک ہی کافی خوراک نہیں ہوتی۔ مسیحؑ کہتے ہیں کہ "انسان صرف روٹی کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتا" اسے کوئی اندرونی خوراک اور غیر مرئی خوراک بھی درکار ہوتی ہے۔ اس ماہر نفسیات نے ایک قانون وضع کیا کہ بچوں کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ہر ڈاکٹر، نرس یا نوکر کو پانچ منٹ بچوں کے ساتھ بتانا ہوں گے، انہیں گلے لگانا ہوگا اور ان سے کھیلنا ہوگا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بقیہ بچے زندگی کی طرف

واپس لوٹنے لگے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر نشوونما پانا شروع کر دی۔ اس کے بعد ان بچوں پر مزید تجربات بھی کیے گئے....

جب ماں بچے کو گلے لگاتی ہے تو دونوں کے مابین توانائی کا بہاؤ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ توانائی غیر مرئی ہوتی ہے۔ ہم اسے پیار کی حرارت کہتے ہیں۔ ایسے میں کوئی شے ماں کے جسم سے بچے میں داخل ہو رہی ہوتی ہے۔ توانائی کا یہی بہاؤ ماں سے بچے کی طرف ہی نہیں بلکہ بچے سے ماں کی طرف بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عورت ماں بن کر زیادہ خوبصورت ہوجاتی ہے۔ اس سے قبل اس میں کسی شے کی کمی تھی، وہ مکمل نہیں تھی، ایک دائرہ نامکمل تھا۔ جب عورت ماں بنتی ہے تو دائرہ مکمل ہوجاتا ہے۔ کسی نامعلوم ذریعے سے اس میں ایک نئی شان پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ صرف ماں بچے کو دودھ نہیں پلاتی بلکہ جواباً بچہ بھی ماں کو کچھ نہ کچھ منتقل کر رہا ہوتا ہے۔ وہ "ایک دوسرے میں" خوش ہوتے ہیں۔

کوئی اور رشتہ اس قدر گہرا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ پیار کرنے والے بھی اس قدر قریب نہیں ہوتے کیونکہ بچہ ماں کی جانب سے آتا ہے اور اس کے خون، گوشت اور ہڈیوں کا حصہ ہوتا ہے۔ بچہ ماں کے وجود کا اضافہ حصہ ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی سے اس قدر قریب نہیں ہوسکتا جتنا کہ ماں اور بچہ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔ محبوب کسی کے دل کے قریب تو ہوسکتا ہے مگر بچہ دل کے اندر ہوتا ہے۔ ماں کے دل کی دھڑکن دراصل بچے کی دھڑکن ہوتی ہے۔ اس کا کوئی اور دل نہیں ہوتا۔ اس کے جسم میں ماں کا خون گردش کرتا ہے۔ وہ ماں کے وجود کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے۔ وہ نو ماہ تک ماں کے وجود کا حصہ رہتا ہے اور نامیاتی وعضوی طور سے اس کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس دوران ماں کی زندگی ہی اس کی زندگی ہوتی ہے اور ماں کی موت اس کی بھی موت ہوگی۔

جب بھی مصیبت کا سامنا ہو تو بیدار ہوجائیں۔ پل ٹوٹ جائے تو مصیبت کی جانب توانائی کی منتقلی کا عمل رک جاتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ مصیبت سکڑتی چلی جاتی ہے کیونکہ مصیبت آپ کے بچے کی مانند ہے۔ آپ نے اسے جنم دیا ہے۔ آپ اس کی وجہ ہیں اور اس کی پرورش کرتے ہیں۔ آپ اسے پالتے پوستے ہیں۔ یہ بڑی ہوتی ہے اور مزید تکلیف دیتی ہے۔ ایسے میں آپ شکایت کرتے ہیں اور آپ کی تمام تر توجہ مصیبت کے ساتھ مل کر دونوں کو ایک کر دیتی ہے۔

ایک مرتبہ دو بوڑھی عورتیں بازار میں ایک دوسرے سے ملیں۔ ایک نے دوسری سے پوچھا

''تم کیسی ہو؟'' پوچھنے والی کو علم تھا کہ دوسری اکثر و بیشتر بیمار رہتی ہے۔ بعض عورتیں اکثر بیمار رہتی ہیں۔ کچھ گڑ بڑ ہے۔ یہ بیماری نہیں ہو سکتی، یہ کوئی اور گہری شے ہے اور اس کا تعلق ذہن سے ہے کیونکہ اگر یہ عورتیں بیمار نہ ہوں تو پُرسکون نہیں رہ سکتیں۔ بیماری ان کی انا کا حصہ بن گئی ہے۔ بہر حال بوڑھی نے دوسری سے پوچھا ''تم کیسی ہو؟''

دوسری نے جواب دیا ''مت پوچھو، بے حد بری حالت ہے، جوڑوں کے درد نے برا حال کر دیا ہے، سر اور پیٹ میں شدید درد رہتا ہے، ٹانگیں جواب دینے لگی ہیں..... وغیرہ وغیرہ''

پہلی عورت بولی ''تمہیں کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے''

دوسری نے جواب دیا ''ہاں ہاں، ذرا ٹھیک ہو جاؤں تو ڈاکٹر کو دکھاؤں گی''

آپ اس وقت ڈاکٹر کے پاس جائیں گے جب قدرے بہتر ہو جائیں گے۔ تاہم کوئی نہیں جاتا۔ جب کوئی قدرے بہتر محسوس کرنے لگتا ہے تو ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وقت ڈاکٹر کے پاس جائیں جب آپ کو مصیبت اور تکلیف کا سامنا ہو۔ دعا مصیبت کے وقت کی جاتی ہے۔ ایسا مت کہیں کہ ''جب مصیبت پڑے گی تو 'دھیان' کرلوں گا'' اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ دھیان نہیں کر پائیں گے۔ آپ نے ایک بابرکت لمحہ کھو دیا۔ مصیبت جیسا شاندار لمحہ کھو دیا۔ مراقبہ یا دھیان آپ کو مستعد اور آگاہ کر دے گا۔ موقع مت کھوئیں۔ مصیبت رحمت ہوتی ہے۔

اپنی تمام مصیبتوں اور تکالیف کو استغراق کیلئے استعمال کریں۔ بہت جلد آپ کو اندازہ ہوگا کہ تکلیف غائب ہوگئی ہے کیونکہ توانائی اندرونی جانب حرکت شروع کر دیتی ہے۔ یہ باہر کی طرف حرکت نہیں کرتی۔ ایسے میں آپ اپنی مصیبت کی پرورش نہیں کر رہے ہوتے۔ یہ غیر منطقی دکھائی دیتا ہے تاہم دنیا کے تمام صوفیاء نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔

بدھا، مسیح ؑ اور زرتشت بیکار گفتگو کرتے چلے آئے ہیں۔ آپ ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ حتمی خوشی کا امکان موجود ہے۔ آپ ان کی بات کے جواب میں کہتے ہیں ''ٹھیک ہے، جب حالت بہتر ہوئی تو دیکھ لیں گے'' تاہم جب آپ خوش ہوتے ہیں تو ایسے میں دیکھنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بدھا نے بار بار اصرار کیا ہے کہ ''آپ کی تمام تر زندگی تکلیف (دکھا) سے عبارت ہے۔ انتظار مت کریں۔ آپ یہی زندگی گزار رہے

ہیں۔ اس میں خوشی کے حصول کا کوئی امکان نہیں۔ جاگ جائیں اور دیکھیں۔ یہ اذیت ہی ہے جسے آپ اپنی زندگی کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہر صورت قنوطی ہوگا۔ وہ قنوطی نہیں تھا مگر تاکید کیلئے انہوں نے یہی انداز اختیار کیا۔ آپ اپنی تکلیف سے اس قدر شدید انداز میں وابستہ ہو چکے ہیں جس کا آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ ابتداء سے اور بچپن سے ہی ایک بات ہمیشہ غلط کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب بچہ بیمار ہو جائے تو اسے زیادہ توجہ ملتی ہے۔ اس سے ایک غلط وابستگی تخلیق ہوتی ہے۔ ایسے میں ماں اسے زیادہ پیار کرتی ہے اور باپ پہلے کی نسبت زیادہ خیال رکھتا ہے۔ ساری خاندان اسے مرکزی حیثیت دیتا ہے اور وہ انتہائی اہم شخصیت بن جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بچے کو اپنے بیمار اور صحت مند ہونے کی پروا نہیں ہوتی۔ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو آمر بن جاتا ہے اور اپنی شرائط منوانے لگتا ہے۔ جب ایک مرتبہ وہ یہ داؤ سیکھ لیتا ہے کہ جب بھی بیماری کا حملہ ہو آپ خصوصی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں تو ہر ایک کو اسے توجہ دینا پڑتی ہے بصورت دیگر آپ انہیں احساس جرم میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ بیماری کی حالت میں کوئی آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی آپ کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اپنی بیماری کے خود ذمہ دار ہیں۔

اگر بچہ کچھ غلط کر رہا ہو تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''تم ذمہ دار ہو'' تاہم اگر وہ بیمار ہے تو تب آپ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ بیماری کا کسی انداز میں اس سے تعلق نہیں۔ وہ کیا کر سکتا ہے؟ تاہم آپ حقائق سے آگاہ نہیں ہیں۔ نوے فیصد بیماریاں خود ساختہ ہوتی ہیں۔ یہ توجہ حاصل کرنے کیلئے تخلیق کی جاتی ہیں اور ان کا مقصد وابستگی اور شفقت کا حصول ہی ہوتا ہے۔ بچہ ایسے داؤ پیچ باآسانی سیکھ لیتا ہے، کیونکہ بچے کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ بے بس ہوتا ہے۔ وہ مسلسل یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ کمزور ہے جبکہ ہر شخص طاقتور ہے۔ تاہم جب وہ بیمار ہوتا ہے تو طاقتور بن جاتا ہے اور ہر شخص اس کے سامنے کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس نے یہ بات سمجھ لی ہے۔

بچہ چیزوں کو جاننے کے حوالے سے بے حد حساس ہوتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ ''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو ماں باپ کی اہمیت بھی میرے مقابلے میں گھٹ جاتی ہے'' ایسے میں بیماری بامعنی چیز بن جاتی ہے۔ چنانچہ زندگی میں وہ جب بھی خود کو نظر انداز ہوتا محسوس کرتا ہے تو بیماری کی مدد لیتا ہے۔ بے بسی کی حالت میں وہ بیماری سے کام لیتا ہے۔ یہ بے حد گہرا مسئلہ ہے۔ جب بچہ بیمار پڑتا ہے تو ہر ایک کو اسے توجہ دینا پڑتی ہے۔ کیا کیا جانا چاہئے؟ اب ماہرین نفسیات نے تجویز کیا ہے کہ

جب بھی بچہ بیمار پڑے تو اس کی نگہداشت ضرور کریں مگر اسے ضرورت سے زیادہ توجہ مت دیں۔ اس کا خیال طبی حوالے سے رکھا جانا چاہئے ،نفسیاتی طور پر اسے حد سے زیادہ توجہ مت دیں۔ اس کے دل میں بیماری کے حوالے سے وابستگی تخلیق نہ ہونے دیں بصورت دیگر وہ زندگی بھر اپنے مسائل کا حل بیماری میں ڈھونڈتا رہے گا۔ بیماری کی حالت میں بیوی اسے کچھ نہیں کہہ سکتی اور کوئی شخص اسے الزام نہیں دے سکتا کیونکہ وہ بیمار ہوتا ہے۔ ایسے میں ہر ایک کو اسے رحم اور شفقت کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے۔

نوے فیصد بیماریوں کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان تکالیف کے ساتھ کوئی ایسی چیز وابستہ کر دیتے ہیں کہ تکلیف اچھی نظر آنے لگتی ہے۔ اس تعلق کو ختم کر دیں۔ کوئی اور شخص آپ کیلئے یہ کام نہیں کر سکتا۔ بیماری سے وابستگی کو مکمل طور سے ختم کر دیں۔ اس تعلق کو ہمیشہ کیلئے توڑ ڈالیں۔ مصیبت اور تکلیف آپ کی قوت کو ضائع کر دیتی ہیں۔ اس میں مت پڑیں اور کبھی مت سوچیں کہ بیماری آپ کو کوئی فائدہ بھی دے سکتی ہے۔ مصیبت یا تکلیف صرف ایک انداز میں فائدہ دے سکتی ہے اور وہ آ گاہی ہے۔ آ گاہ ہو جائیں۔

وابستگی ترک کرنا سیکھیں۔ اپنی تکلیف اور مصیبت کے بارے میں کبھی کچھ مت بولیں۔ تکلیف برداشت کریں مگر اس کا تذکرہ مت کریں۔ آپ کیوں بات کرتے ہیں؟ لوگ اپنے مصائب کا ذکر کر کے دوسروں کو بور کیوں کرتے ہیں؟ کس کو اس میں دلچسپی ہے؟ لوگ آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے اس لیے وہ آپ کی بیماری اور اذیت سے متعلق گفتگو سن لیتے ہیں۔ تاہم وہ آپ سے بچنا چاہتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح آپ سے چھٹکارا پانے کی تدبیر شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی کسی کی مصیبت کی داستان نہیں سننا چاہتا کیونکہ ہر ایک کو اپنی مصیبت اور تکالیف کی فکر ہے۔ آپ کی تکلیف کی کسے پروا ہے؟ اس حوالے سے بات مت کریں کیونکہ ایسا کرنے سے اس مصیبت کے ساتھ ذہنی تعلق تخلیق ہوتا ہے۔

شکایت بھی مت کریں کیونکہ ایسا کرنے سے آپ پیار، رحم اور شفقت کے متلاشی ہو جاتے ہیں۔ ایسا مت کریں۔ اپنی تکلیف کو مت بیچیں۔ مصائب کا اکیلے سامنا کریں۔ اسے لوگوں کے سامنے تماشہ مت بنائیں۔ یہ صوفیاء اپنے مصائب کو سب کے سامنے کھول دیتے ہیں جبکہ میرا کہنا یہ ہے کہ اسے خفیہ رکھا جانا چاہئے۔ ہمارے دل اعلان کرتے ہیں کہ وہ طویل روزہ رکھنے جا رہے

ہیں۔ جیسے کہ ہر ایک کو ان کی تپسیا کے بارے میں معلوم ہونا ضروری ہے۔ مصائب کو اکیلے اور خفیہ انداز میں برداشت کر کے ہی آپ کچھ پا سکتے ہیں۔

اپنی تکالیف، مصائب اور قربانیوں کا تذکرہ کرنے والے لوگ بچوں جیسے ہیں۔ انہوں نے آپ سے زیادہ کام کیا ہے۔ وہ اپنی تکالیف پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کی شان یہی مصائب ہیں۔ وہ کس قدر لمبا روزہ رکھ سکتے ہیں اور پورے ملک بلکہ پوری دنیا کی کس قدر توجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ بے حد چالاک ہیں۔ یہ لوگوں کا اپنی تکالیف کے ذریعے استحصال کرتے ہیں۔ ہر شخص ایسا ہی کر رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ متذکرہ بالا لوگ انتہائی شدومد سے ایسا کرنے میں لگے ہیں۔ ایسا مت کریں۔ شہید بننے کی کوشش مت کریں۔ یہ بیکار سعی ہے۔ دکھاوے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اپنے طور پر مصائب جھیلیں۔ اپنی مصیبتوں اور تکالیف کو اس قدر پوشیدہ رکھیں کہ کسی کو بھی یہ علم نہ ہو پائے کہ آپ مصیبت میں ہیں۔ اس کے بعد اس پر استغراق کریں۔ مصیبت کو پرے نہ پھینکیں بلکہ اسے اپنے اندر جمع کر لیں اور آنکھیں بند کر کے اس پر دھیان دیں۔ ایسا کرنے سے آپ کی ذات اور مصیبت کے مابین پل ٹوٹ جائے گا۔

جب مسیحؑ یہ کہتے ہیں کہ ''مصیبت کا سامنا کرنیوالا بابرکت ہے'' تو ان کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ تاہم یہ مصیبت جھیلنے کی تکلیف ہے۔ مصیبت اور تکلیف کو طریق کار کے طور پر استعمال کریں کیونکہ ''اس نے زندگی پالی ہے''

تکلیف کا تعلق موت کی قلمرو سے ہے جبکہ آگہی زندگی کی قلمرو سے متعلق ہے۔ پل توڑ دیں تو آپ جان جائیں گے کہ آپ کے اندر اور آپ کے اردگرد کوئی شے مرنے کو ہے۔ اس کا تعلق موت سے ہوتا ہے جبکہ آپ کے اندر کوئی چیز یعنی آپ کی آگاہی نہیں مرے گی۔ یہ [illegible] سے ماورا ہوتی ہے۔ اس کا تعلق زندگی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تکلیف آپ کو زندگی کی کنجی ثابت ہوتی ہیں۔ مسیحؑ نے کہا ''زندہ رہتے ہوئے زندہ کو دیکھیں، بوقت موت آپ اسے نہیں دیکھ سکیں گے''

یہ طریق کار ہیں ''زندہ کو دیکھیں'' آپ کے اندر ایک وہ ہے جو زندہ ہے اور ایک پہلے ہی مر چکا ہے۔ آپ کے اندر دو دنیائیں ہیں۔ جن میں سے ایک مادے اور دوسری روح کی دنیا ہوتی ہے۔ آپ دونوں کی سرحد پر کھڑے ہیں۔ آپ کے اندر دو قلمرو ہیں جن میں سے ایک زندگی اور دوسری موت کی قلمرو ہے۔ آپ ان دونوں کے مابین ہیں۔ اگر آپ موت کی قلمرو پر بہت زیادہ توجہ

دیں تو ہمیشہ خوفزدہ رہیں گے اور مصائب جھیلیں گے۔ اس کے بجائے اگر آپ اپنے مرکز پر توجہ دیں گے تو ابدی زندگی سے ہمکنار ہو جائیں گے جبکہ خوف جاتا رہے گا۔

مسیحؑ نے کہا ''جب تک آپ زندہ ہیں زندہ کو دیکھیں'' یہ موقع مت گنوائیں کیونکہ بوقت مرگ زندہ کو دیکھنا بیحد مشکل ہوگا۔

اگر آپ عمر بھر موت کی قلمرو، مادے کی قلمرو اور دنیا کی طرف بہت زیادہ متوجہ رہے ہیں۔ اگر آپ صرف موت کی قلمرو پر دھیان دیتے رہے ہیں تو جب آپ مر رہے ہوں گے یا مر چکے ہوں گے تو ایسے میں زندگی کی قلمرو کو دیکھنا بہت مشکل اور تقریباً ناممکن ہوگا۔ آپ فوراً اپنا رخ کیسے موڑ سکتے ہیں؟ ایسا کرنا ممکن نہیں، آپ اپاہج ہو جائیں گے۔ آپ زندگی بھر ظاہر کو دیکھتے چلے آئے ہیں۔ گردن اپاہج ہوگئی ہے۔ آپ اپنا رخ موڑنے کے قابل نہیں رہے۔ اسے موت سے ماورا دنیا کی طرف مسلسل حرکت درکار ہے۔

''جب تک زندہ ہیں زندہ کو دیکھیں''

جب آپ خاموش اور پرسکون کیفیت میں ہوں تو اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اندر دیکھیں۔ ایسے میں گردن لچکدار رہنی چاہئے۔ بصورت دیگر بوقت مرگ آپ اپاہج ہو جائیں گے۔ آپ ابدی زندگی دیکھنا چاہیں گے مگر ایسا کرنے کے قابل نہیں ہوں گے کیونکہ آپ اپنا رخ نہیں موڑ سکتے۔

''مبادا کہ آپ مر جائیں اور اسے دیکھنے کی کوشش کریں مگر نہ دیکھ پائیں''

وہ آپ کے اندر موجود ہے، مگر آپ تکلیف اور اندیشوں میں مبتلا ہیں۔ بیرون سے متعلق اندیشے ختم ہونے چاہئیں۔ جنگل کی طرف فرار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چوبیس گھنٹوں میں آپ کیلئے اپنے اندر دیکھنے کے بے شمار مواقع آئیں گے۔ ان مواقع کو مت کھوئیں۔ جب بھی آپ کو وقت ملے اپنی آنکھیں بند کر لیں (چاہے ایک لمحے کیلئے ہی کیوں نہ سہی) اور اپنے اندر زندہ شے کو دیکھیں۔ یہ وہاں موجود ہے۔ اسے دیکھنے کیلئے تھوڑی سی مشق درکار ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد آپ کی آنکھیں اپنے اندر تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو جائیں گی۔ آپ کو اندر اس لیے تاریکی نظر آتی ہے کہ آپ باہر کی روشنی سے مانوس ہیں۔

جب آپ اندرونی روشنی سے مانوس ہو جاتے ہیں تو آنکھوں کے آگے چھائی تاریکی چھٹ

جاتی ہے۔ یہ نہایت نرم، خاموش اور سکون بخش روشنی ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی شدت نہیں پائی جاتی۔ یہ جھٹپٹے کی روشنی ہے۔ یہ سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب آفتاب کے وقت پھیلنے والی روشنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندومت میں اسے ''براہما مہوترا'' کہا جاتا ہے۔ ہندو اسے ''براہما مہوترا'' (خدا کا لمحہ) کیوں کہتے ہیں؟ وہ اسے اس اندرونی شے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ جب آپ اپنے اندر توجہ مبذول کرتے ہیں تو بیرونی روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اندرونی تاریکی باقی نہیں رہتی کیونکہ آپ اس تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ جب کوئی اندر سے مانوس ہو جاتا ہے تو اسی صورت میں اندرونی روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اور جھٹپٹا بھی ہوتا ہے جسے ''سندھیا کل'' کہتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب روشنی ہوتی ہے نہ تاریکی۔ اسے براہما مہوترا یعنی خدائی لمحہ کہا جاتا ہے۔ اس سے مانوس ہو جائیں، دیکھیں، انتظار کریں اور مشاہدہ کریں۔ بہت جلد آپ کی آنکھیں عادی ہو جائیں گی اور آپ دیکھنے کے قابل ہوں گے۔

یہ شدید روشنی نہیں ہوتی بلکہ دھیمی روشنی ہوتی ہے کیونکہ اس کا منبع سورج نہیں ہوتا۔ یہ آپ کی فطری روشنی ہوتی ہے۔ یہ کہیں اور سے نہیں پھوٹتی۔ یہ آپ کی اپنی روشنی ہے اور آپ کے اندر کی چمک ہے۔ جب بھی آپ وقت نکال سکیں اسے ضائع مت کریں۔ آپ کو خاصے لمحات دستیاب ہوں گے۔

سونے سے پہلے اپنے اندر جھانکیں۔ دن گزر گیا ہے، موت کی دنیا باقی نہیں رہی، آپ آرام کرنے لگے ہیں، اپنے اندر دیکھیں۔ صبح کے وقت جب آپ نیند سے بیدار ہوں تو چھلانگ لگا کر بستر سے باہر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ذرا دیر انتظار کریں، اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اندر دیکھیں۔ اندر خاموشی کا راج ہے۔ رات بھر کا آرام آپ کی مدد کرتا ہے۔ آپ تناؤ کی کیفیت میں نہیں ہوتے۔ ایسے میں اپنے اندر جھانکنا اور بھی آسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب میں عبادت کا بہترین وقت رات سونے سے قبل اور صبح اٹھنے کے فوراً بعد بتایا گیا ہے۔ یہ لمحات بہت اچھے ہوتے ہیں۔ شام کے وقت آپ دنیا سے تھکے ہوتے ہیں۔ ایسے میں آپ کسی اور کی جانب دیکھنے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت آپ آرام کے بعد تر و تازہ محسوس کر رہے ہوتے ہیں اور یہ تر و تازگی آپ کی بھرپور مدد کرتی ہے۔ ایسے میں آپ اپنے اندر دیکھ سکتے ہیں۔ یہی بات مسیحؑ نے کہی ہے۔

''جب تک زندہ ہیں زندہ کو دیکھیں، مبادا کہ آپ مر جائیں اور اسے دیکھنے کی کوشش کریں مگر دیکھ نہ پائیں''

وہ وہیں ہوگا مگر آپ زندگی بھر کی غلط مشق کے سبب اسے دیکھ نہیں پائیں گے۔

''انہوں نے ایک سامری کو میمنا اٹھائے جودیہ کی سمت جاتے دیکھا۔ انہوں نے اپنے حواریوں سے کہا'' یہ شخص اپنے ساتھ میمنے کو کیوں لیے پھرتا ہے؟''

حواریوں نے جواب دیا'' اس لیے کہ وہ اسے ذبح کر کے اس کا گوشت کھائے گا''

مسیحؑ نے انہیں کہا'' جب تک میمنا زندہ ہے اس وقت تک یہ اسے نہیں کھا سکتا، مگر جب اس نے اسے ذبح کر دیا اور وہ لاش میں تبدیل ہو گیا، اس وقت وہ اسے کھا سکے گا''

حواری بولے'' یقیناً، وگرنہ وہ اسے کھانے کے قابل نہیں ہوگا''

اس موقع پر مسیحؑ نے انہیں کہا'' آپ بھی محفوظ جگہ ڈھونڈتے ہیں کہ مبادا آپ لاش بن جائیں اور کھا لیے جائیں''

آپ کے جسم نے کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کی خوراک بن جانا ہے۔ آپ کا جسم خوراک ہے، یہ کچھ اور نہیں۔ یہ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ آپ کی پیدائش خوراک کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ کھانا پینا بند کر دیں تو آپ کا جسم غائب ہونا شروع ہو جائے گا۔ اگر آپ روزہ رکھیں تو ہر روز دو پاؤنڈ وزن کم کریں گے۔ یہ جسم کہاں جا رہا ہے؟ آپ کو ہر روز اسے خوراک سے بھرنا پڑتا ہے۔ یہ خوراک کی ضمنی پیداوار ہے۔ چنانچہ جب آپ مرتے ہیں تو آپ کے جسم کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ دنیا اسے خوراک کے طور پر استعمال کرے گی۔ زمین کے کیڑے اسے کھا لیں گے یا پھر یہ آسمان کے پرندوں کی خوراک بن جائے گا۔ اس سے خوف پیدا ہوتا ہے اور آپ تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ''میں کھا لیا جاؤں گا'' اسی وجہ سے دنیا بھر میں مختلف ممالک اور مذاہب کے لوگوں نے کھائے جانے سے محفوظ رہنے کیلئے متعدد طریقے ایجاد کیے ہیں، تاہم وہ احمق ہوتے ہیں۔

ہندو صرف ایک امر سے بچنے کیلئے اپنے مردے جلاتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ ''کہیں ہمیں کھا نہ لیا جائے'' مسلمان مرنے والے کو تابوت میں بند کر کے قبر میں رکھتے ہیں تا کہ یہ محفوظ رہے۔ عیسائی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ صرف زرتشت کے پجاری ایسا نہیں کرتے۔ وہ انسانی جسم کو

پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے کھانے کیلئے کھلا رکھ چھوڑتے ہیں۔ ان کا اس حوالے سے نظریہ عین فطری ہے اور اسے سائنس سے قریب تر کہا جا سکتا ہے کیونکہ آپ کو خوراک تباہ نہیں کرنی چاہئے۔ آپ زندگی بھر پرندوں، جانوروں اور پھلوں کو کھاتے رہے ہیں اور یوں آپ نے دو سو پاؤنڈ وزنی جسم بنا لیا ہے۔ آپ اس جسم کو تباہ کر دیں گے، جلا دیں گے یا زمین میں گاڑ دیں گے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ دنیا کے احسان مند نہیں ہیں۔ یہ خوراک ہے اور آپ کو مرنے کے بعد اپنا جسم بطور خوراک استعمال کرنے کیلئے دنیا کو لوٹا دینا چاہئے۔

آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ مردے کو بھلا دینا بہتر ہے۔ آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ مردے کو زمین میں گاڑنے اور اس کے پرندوں، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے کے بجائے اس کا جلا دیا جانا زیادہ بہتر ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پرندے کے پیٹ میں بھی آگ جل رہی ہے، شیر کے پیٹ میں بھی آگ ہے۔ یہ فطری آگ ہے اور مردے کا جسم کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کی بھوک ضرور مٹاتا ہے۔

اس حوالے سے صرف پارسی ہی فطری طریقے سے قریب تر ہیں۔ تاہم اب وہ بھی مردے کو چرند پرند اور جانوروں کی خوراک بننے کے خیال سے کانپنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کو یہ کہتا سنتے ہیں کہ ''اپنے ماں باپ کو یوں چرند پرند اور جانوروں کے سامنے کھلا چھوڑ دینا غلط ہے۔ آپ کیسے لوگ ہیں؟ آپ تو بے حد ظالم ہیں'' مگر کیا مردے کو آگ میں ڈال دینا ظالمانہ فعل نہیں ہے؟ پارسی تو اس حوالے سے دوسروں کی نسبت بہت بہتر ہیں۔ وہ فطری دائرہ مکمل کر رہے ہیں۔ ہندو مسلم اور عیسائی ان کی نسبت کم ماحول دوست ہیں۔ وہ دائرہ توڑ رہے ہیں جو کہ اچھی بات نہیں۔

مسیحؑ کہتے ہیں کہ اگر آپ کو باطن کا احساس نہیں ہوتا اور اپنے اندر زندہ شے سے آگاہی نہیں ملتی تو آپ محض خوراک بن جائیں گے۔ اس کے سوا آپ کا کوئی مستقبل نہیں۔ آپ کی ساری زندگی ہی بیکار ہے۔ آپ زندگی بھر کھاتے رہے ہیں۔ کھانے کیلئے کام کرتے رہے ہیں اور آخر میں خود کھا لیے جائیں گے۔ یہی ساری کہانی ہے۔ یہ احمق کی کہانی ہے جو عیش و عشرت اور شور و غوغا سے عبارت ہے۔ اس میں کوئی اہم بات نہیں۔ ساری زندگی کھانے کے لیے جدوجہد کرنے کا نام ہے اور آخر میں ہم خود چرند پرند، کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا زندگی کے کیا معانی ہوئے؟

مسیحؑ کہتے ہیں ''موت سے پہلے اور کھائے جانے سے پہلے اپنے اندر اس شے کا احساس بیدار کرلو جو خوراک نہیں ہے اور جو خوراک کے ذریعے وجود میں نہیں آئی'' ایسے میں آپ کو ایک اور بات سمجھنا ہوگی۔

تمام مذاہب میں روزے کی روایت موجود ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب آپ روزہ رکھتے ہیں تو آگہی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ خوراک کا حصہ نہیں ہوتی۔ واقعتاً خوراک آگہی کو ختم کردیتی ہے اور جب آپ کھانے سے پرہیز کرتے ہیں تو زیادہ آگاہ ہوجاتے ہیں کہ خوراک ایک قسم کی نیند لاتی ہے۔ خوراک خمار پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ اگر آپ بہت زیادہ کھالیں تو فوراً نیند محسوس کرتے ہیں۔ یہ شراب جیسی ہے۔ جب آپ کھاتے ہیں تو نیند آجاتی ہے۔ اگر آپ روزہ رکھیں تو رات کو سونا مشکل ہوگا۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا بھوک کے باعث ہوتا ہے؟ نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ خوراک کے بغیر زیادہ آگاہی حاصل ہوجاتی ہے۔

اگر آپ طویل روزہ رکھیں تو تیسرے، چوتھے یا پانچویں دن کے بعد بھوک غائب ہوجاتی ہے کیونکہ جسم تین، چار یا پانچ دن تک خوراک کے لیے اصرار کرتا رہا۔ جسم کی یادداشت زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ پرانی عادت پر چند روز ہی اصرار کرسکتا ہے اور اس کے بعد یہ بھی شنوائی نہ ہونے پر دیگر ذرائع پر انحصار شروع کردیتا ہے۔ جسم کے پاس دہرے انتظامات ہوتے ہیں۔ ایسا حفظ ماتقدم کے طور پر ہوتا ہے۔ آپ کو جسم اس کی روزانہ خوراک دینے کیلئے کھانا پڑتا ہے۔ اگر آپ پانچ سے سات دن تک اسے روزانہ کوٹہ نہ دیں تو جسم ایمرجنسی نافذ کردیتا ہے اور جسم میں جمع فاضل گوشت اور چربی پر گزارا شروع کردیتا ہے۔

ہر عام صحت مند انسان کے جسم میں تین ماہ تک خوراک کے بغیر یا کم خوراک پر گزارا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ جمع شدہ خزانے جیسا ہے۔ جب جسم یہ دیکھتا ہے کہ آپ اسے خوراک نہیں دے رہے تو یہ اپنے جمع شدہ خزانے سے خرچ کرنا شروع کردیتا ہے۔ ایسے میں اس کے ساتھ شعور شامل نہیں ہوتا۔ آپ کو کام کرنے اور پیسے کما کر خوراک کو جزو بدن بنانے کی مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ جب آپ خوراک کھاتے اور ہضم کرتے ہیں تو اس کے لیے بیحد توانائی درکار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جونہی کھانا کھاتے ہیں تو آپ کو نیند آنا شروع ہوجاتی ہے اور سر بھاری محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ شعور کی حیثیت سے کام کرنے والی توانائی کو

معدے میں ہاضمے کی قوت کے طور پر کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ بہت زیادہ مقدار میں کھانا کھانے والے لوگ عمدگی سے مراقبہ نہیں کرسکتے۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ وہ اچھی نیند تو پاسکتے ہیں مگر آگہی سے محروم رہتے ہیں۔ وہ باخبر نہیں ہوسکتے۔ ان کی حیثیت خوراک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ انہیں کھا لیا جاتا ہے۔ ان کی تمام تر زندگی غذائی دائرہ ہوتی ہے۔ تمام مذاہب اس امر سے آگاہ ہوئے کہ روزہ رکھنے کے نتیجے میں آپ کی آگاہی بڑھ جاتی ہے کیونکہ توانائی خارج ہوتی ہے اور جسم کے پاس ہضم کرنے کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی شے اندر جاتی ہے نہ باہر آتی ہے۔ ہر کام رک جاتا ہے۔ جسم کی فیکٹری کو کام نہیں کرنا پڑتا۔ کارخانے کو تالا لگ جاتا ہے۔ ایسے میں تمام توانائی شعور میں بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزے کی حالت میں جلدی نیند نہیں آتی۔

اگر آپ بیس یا تیس روز سے روزے کی حالت میں ہوں تو آپ کو نئی قسم کی نیند کا تجربہ ہوگا۔ ایسے میں آپ کا جسم تو سو رہا ہوتا ہے مگر آپ کا ذہن مستعد ہوتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو کرشنا نے ارجن سے کہی تھی ''جب ہر شخص سوتا ہے تو یوگی بدستور بیدار ہوتا ہے'' بدھا کا کہنا ہے ''میں سوتے میں بھی جاگ رہا ہوتا ہوں'' میں نیند کی حالت میں نہیں ہوتا بلکہ صرف میرا جسم ہی نیند کی حالت میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مہاویرا سوتا ہے تو نیند میں کبھی کوئی حرکت نہیں کرتا۔ وہ ذرا بھر بھی نہیں ہلتا۔ وہ پہلو بھی نہیں بدلتا کیونکہ وہ ہر لحظہ مستعد رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''پہلو بدلنا درست نہیں ہوگا، ہوسکتا ہے کوئی کیڑا مکوڑا وہاں موجود ہو اور ...... ''وہ درخت تلے ننگی زمین پر سوتا تھا۔ مہاویرا نے کہا ''ہوسکتا ہے تاریکی میں پہلو بدلنے پر کسی نقصان کا اندیشہ ہو'' چنانچہ وہ رات بھر ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ وہ نیند کی حالت میں اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلاتا۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ اپنی نیند میں بھرپور طور سے مستعد ہوں۔ بصورت دیگر آپ کو علم ہی نہیں ہوگا کہ کب آپ نے پہلو بدلا اور کب کس حالت میں آگئے۔

اگر آپ باخبر اور مستعد ہوجائیں تو اپنے اندر مختلف جہات سے آگاہی بھی پالیتے ہیں۔ ظاہر فنا پذیر ہوتا ہے جبکہ غائب موت سے ماورا ہے۔

مسیحؑ نے کہا ''آپ محفوظ جگہ ڈھونڈتے ہیں مبادا کہ لاش بن جائیں اور کھا لیے جائیں'' سکوت، تحفظ، توازن اور سکون کی جگہ تلاش کی جاتی ہے جہاں آپ ''زندہ'' سے آگاہ ہوسکیں۔ بصورت دیگر آپ لاش بن جاتے ہیں اور کھا لیے جاتے ہیں۔

مسیحؑ نے کہا ''بستر پر دو آدمی ہوں گے، ایک مر جائے گا اور دوسرا زندہ رہے گا''

اپنشد میں بھی یہی الفاظ مرقوم ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک درخت پر دو پرندے بیٹھے ہیں جن میں سے ایک نچلی شاخ پر براجمان ہے جبکہ دوسرا اوپر والی شاخ پر بیٹھا ہے۔ نچلی شاخ پر بیٹھا پرندہ سوچتا ہے، پریشان ہوتا ہے، خواہشات کے انبار تلے دبا جاتا ہے، لڑتا اور مقابلہ کرتا ہے۔ یہ پرندہ اذیت اور تناؤ کی کیفیت میں ایک سے دوسری شاخ پر چھلانگ لگاتا پھرتا ہے۔ وہ ہمہ وقت حرکت میں ہے اور اسے کسی پل قرار نہیں۔ اس کے بجائے اونچی شاخ پر بیٹھا پرندہ پرسکون ہے۔ وہ اس قدر خاموش ہے گویا اس کا وجود ہی نہ ہو۔ اس کی کوئی خواہشات ہیں نہ خواب۔ اس کو کسی شے کی ضرورت نہیں، جیسے اس کی ہر خواہش پوری ہو چکی ہو۔ وہ آرام سے بیٹھا لطف اندوز ہو رہا ہے اور نچلی شاخوں پر پھدکتے پرندے کو دیکھتا ہے۔

یہ پرندے آپ کے اندر دو جہات کی علامت ہیں۔ آپ درخت ہیں۔ نیچے والا ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ نیچے والا پرندہ آپ کا جسم ہے۔ اسے آپ جسمانی خواہشات اور ضروریات بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ ان ضروریات اور خواہشات میں گم ہو جائیں تو ایک بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اونچی شاخ پر بیٹھا پرندہ محض مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ نچلی شاخوں پر بیٹھے پرندے کو احمقانہ انداز میں اچھلتا کودتا، اذیت میں ادھر ادھر پر مارتا اور اندیشوں، غصے اور جنسی خواہشات کے زیر اثر بے چین پھرتا دیکھتا رہتا ہے۔ اوپر والا پرندہ صرف دیکھتا ہے۔ وہ محض تماشائی ہے جبکہ آپ درخت ہیں۔

مسیحؑ نے یہی بات ذرا مختلف انداز میں کہی ہے۔

''بستر پر دو آدمی ہوں گے، ایک مر جائے گا اور دوسرا زندہ رہے گا'' آپ بستر ہیں جس پر دو آدمی موجود ہیں۔ ایک مر جائے گا اور دوسرا زندہ رہے گا۔ اب اصل سوال یہ ہے کہ کس پر توجہ دی جانا چاہئے۔ آپ کو کس کی طرف بڑھنا چاہئے اور آپ کی تمام تر توانائی کو کس کی جانب بہنا چاہئے؟ کس کو آپ کا مقصد ہونا چاہئے؟

اگر آپ کی توجہ مرنے والے پر ہے تو یہ آپ کا عارضی مقصد کہلائے گا۔ اسی کے باعث آپ اندیشوں میں مبتلا ہیں کہ آپ ریت پر گھر تعمیر کر رہے ہیں۔ اس نے گر جانا ہے۔ یہ تعمیر ہونے سے پہلے ہی گر جائے گا اور کھنڈر بن جائے گا۔ آپ ہمیشہ کپکپاتے رہتے ہیں کیونکہ آپ پانی پر اپنا نام

لکھ رہے ہیں۔ یہ آپ کے لکھنے سے پہلے ہی مٹ جائے گا۔ آپ کی پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ آپ موت کی قلمرو سے وابستہ ہیں اور آپ نے زندگی کی جانب نہیں دیکھا۔ ہر بستر پر دو آدمی سو رہے ہیں۔ دوسرا محض دیکھ رہا ہے۔

دیکھنے والے پر زیادہ توجہ دیں۔ تبدیلی اسی کا نام ہے۔ تبدیلی کا مطلب ہندو سے عیسائی یا عیسائی سے ہندو بن جانا نہیں۔ یہ حماقت ہے۔ ایسا کرتے ہوئے آپ صرف لیبل تبدیل کرتے ہیں۔ حقیقت میں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوتا کیونکہ اندرونی آدمی ویسا ہی رہتا ہے۔ اس کا نمونہ پرانا ہی رہتا ہے۔ تبدیلی کا مطلب توجہ کو موت سے ہٹا کر زندگی کی قلمرو پر مرکوز کرنا ہے۔ یہ یکسر مختلف سمت میں مڑ جانے کا نام ہے۔ مشاہدہ کرنیوالے کی طرف دیکھنا اور اس کا حصہ بن جانا، اپنے آپ کو مشاہدہ کار میں تبدیل کر لینا اور خود کو آگاہی میں بدل لینا ہی وہ عمل ہے جس کے ذریعے آپ اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ مرنے والا مر جائے گا۔ اس سے کوئی پریشانی جنم نہیں لیتی اور آپ جان لیتے ہیں کہ آپ امر ہیں اور ایسے میں تمام خوف ختم ہو جاتے ہیں۔

مسیحؑ نے کہا ''بستر پر دو آدمی ہوں گے، ایک مر جائے گا اور دوسرا زندہ رہے گا''

اب سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔ اگر آپ مشکل سے دوچار رہنا چاہتے ہیں تو اندرون پر توجہ مت دیں۔ اگر آپ ہمیشہ اذیت میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو محیط میں ہی رہیں۔ اندر مت دیکھیں۔ تاہم اگر آپ سکون کے خواہش مند ہیں اور پرسکون ابدیت وسچائی کے خواہاں ہیں، جنت کے دروازوں کو اپنے لیے کھلا دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے اندر دیکھیں۔ ایسا کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ بیحد گہری بات ہے۔ جہاں مرئی اور غیر مرئی باہم ملتے ہیں، جہاں روح اور مادے کا ملاپ ہوتا ہے۔ یہ بیحد لطیف نکتہ ہے۔ آپ مادے کو تو دیکھ سکتے ہیں مگر روح کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ دکھائی نہیں دیتی۔ آپ مرئی کو وہاں دیکھ سکتے ہیں جہاں یہ ختم ہوتا ہے تاہم آپ غیر مرئی کو نہیں دیکھ سکتے کہ نظر نہیں آ سکتا۔

ایسے میں کیا ہونا چاہئے؟ آپ محض مرئی کی حدود میں رہتے ہیں اور مرئی کو دیکھنے کے بجائے اس کی متضاد سمت میں دیکھتے ہیں۔ ایسے میں غیر مرئی محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ سمجھ بوجھ نہیں بلکہ احساس ہے۔ آپ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ آپ اسے محسوس کرتے ہیں تاہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ یہ آسمان کی طرح ہے۔ آسمان موجود ہے مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ فلاں جگہ موجود ہے۔

آپ اس کی واضح نشاندہی نہیں کر سکتے۔ آپ اسے چھو بھی نہیں سکتے۔ یہ ہمیشہ سے موجود ہے، آپ اس میں ہیں مگر اسے چھو نہیں سکتے۔ ہمیشہ مرئی کی حدود میں رہتے ہوئے مخالف سمت میں دیکھیں۔ تمام تر مراقبہ، دھیان یا استغراق اسی سے متعلق ہے۔ جب بھی آپ کو پرسکون لمحہ میسر آئے اپنی آنکھیں بند کر لیں، جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں اور موت کی دنیا سے دور نکل آئیں۔ خود کو بازار، دفتر، بیوی اور بچوں سے الگ کر لیں۔ سب کو چھوڑ دیں۔ پہلی مرتبہ آپ کو اپنے اندر کچھ دکھائی نہیں دے گا۔

ہیوم نے کہا ''بہت سے لوگ اپنے اندر کا جائزہ لینے کی بات کرتے ہیں مگر میں جب بھی یہ کوشش کرتا ہوں تو ناکام رہتا ہوں۔ مجھے اپنے اندر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے صرف خیالات، خواہشات اور خواب ہی ایک سے دوسری جگہ تیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف افراتفری اور بدنظمی نظر آتی ہے'' یہ چیزیں بادلوں کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ آپ کو بھی ایسا ہی محسوس ہوگا۔ اگر آپ یہ سوچیں گے کہ بار بار اس افراتفری کو دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تو آپ کھو بیٹھیں گے۔

ابتدا میں آپ کو ایسا ہی دکھائی دے گا۔ کیونکہ آپ کی آنکھیں صرف یہی دیکھ سکتی ہیں۔ انہیں ٹیوننگ کی ضرورت ہے۔ تیرتے خوابوں کو دیکھتے رہیں۔ وہ آسمان پر بادلوں کی طرح تیر رہے ہیں مگر بادلوں کے درمیان نیلا رنگ بھی نظر آئے گا۔ دو خوابوں اور دو خیالوں کے درمیان آسمان جیسی کوئی شے بھی نظر آئے گی۔ جلدی مت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے ''اگر آپ نے جلد بازی کی تو کھو بیٹھیں گے''

بدھ مت کی کہاوت ہے کہ ''جلد اور آہستہ'' یہ درست ہے۔ جلدی کرنا درست ہے کیونکہ آپ نے مر جانا ہے۔ جلدی پر اسی لیے تاکید کی گئی ہے۔ تاہم اگر آپ بہت زیادہ جلدی میں ہیں تو کھو بیٹھیں گے کیونکہ آپ بہت جلد نتیجہ اخذ کر لیں گے جبکہ اس وقت تک آنکھیں وہ سب کچھ دیکھنے کے قابل نہیں ہوں گی جو آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت جلد نتیجہ اخذ مت کریں۔

جلد اور آہستہ۔ انتظار کریں۔ بیٹھ جائیں اور انتظار کریں۔ آہستہ آہستہ ایک نئی اور غیر مرئی دنیا واضح ہونا شروع ہو جائے گی۔ آپ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ سریلا نغمہ سن سکتے ہیں۔ خاموشی اپنی موسیقی خود شروع کرتی ہے۔ اگرچہ موسیقی ہمیشہ بہتی رہتی ہے مگر یہ اس قدر آہستہ ہوتی ہے کہ صرف تربیت یافتہ کان ہی اسے سن سکتے ہیں۔ یہ شور کے بجائے خاموشی

جیسی ہوتی ہے۔ اندر کی آواز خاموشی جیسی ہوتی ہے۔ اندر کی شکل بے شکل ہوتی ہے۔ اندر کی دنیا زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ آپ جو کچھ جانتے ہیں وہ زماں و مکاں سے متعلق ہی ہے۔ مادہ مکاں میں ہے اور وقت زماں میں ہوتا ہے۔ اب ماہرین طبعیات کہتے ہیں کہ یہ دو چیزیں دو نہیں ہیں حتیٰ کہ زماں بھی مکاں کی چوتھی جہت ہے۔

آپ صرف زماں و مکاں سے واقف ہیں۔ آپ اشیا اور واقعات کی دنیا سے ہی آگاہ ہیں۔ آپ اپنے اندر کی دنیا سے واقف نہیں ہیں۔ یہ دونوں سے آگے کی چیز ہے۔ یہ زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ یہاں وقت کے بغیر دورانیہ ہوتا ہے۔ یہاں مکاں لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کے بغیر ہوتا ہے۔ یہ بالکل مختلف دنیا ہے۔ آپ کو اسے دیکھنے کے قابل ہونا پڑے گا۔ لہٰذا بے صبرے مت بنیں۔ بے صبری بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ جب لوگ اندرون پر توجہ دینے لگتے ہیں تو بے صبری سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے لیے لامحدود صبر درکار ہے۔ یہ اگلے ہی لمحے ہو سکتا ہے مگر لامحدود صبر ضروری ہے۔

اگر آپ بے صبرے ہیں تو کئی جنم تک اس سے محروم رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ بے صبری آپ کو اس سکون سے ہمکنار نہیں ہونے دے گی جس کا مسیحؑ نے تذکرہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ کو توقع بھی ہے تو وہ محض پریشانی ہوگی۔ اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ کچھ ہونے کو ہے، کچھ غیر معمولی وقوع پذیر ہوا چاہتا ہے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر آپ روشن خیالی کے منتظر ہیں تو اسے کھو بیٹھیں گے۔ یاد رہے کہ آپ کو اس کی توقع نہیں کرنا۔ تمام توقعات کا تعلق موت کی دنیا سے ہے۔ اس کا تعلق زماں و مکاں کی جہت سے ہوتا ہے۔

اندر کی دنیا سے کوئی مقصد وابستہ نہیں ہوتا۔ اس دنیا تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ کو صرف انتظار کرنا ہے۔ آپ خود بخود وہاں پہنچ جائیں گے۔ بس لامحدود صبر درکار ہے۔ مسیحؑ نے کہا ''دیکھو اور صبر کرو'' ایک روز آپ اچانک جگمگا اٹھیں گے۔ کسی دن جب آپ اپنے اندر مطلوبہ قابلیت پیدا کر لیں گے اور تیار ہو جائیں گے تو جگمگا اٹھیں گے۔ تمام تاریکی چھٹ جائے گی اور آپ ابدی زندگی سے معمور ہو جائیں گے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔

☆☆☆